اے حمید

تلاشِ محبت

میں آپ کو کوئی فرضی کہانی نہیں سناؤں گا- مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے- اس لئے کہ میری اپنی خانہ بدوشیوں، آوارہ گردیوں اور سیاحتوں کی اتنی کہانیاں ہیں کہ سناؤں تو ختم نہ ہوں- میں آپ کو اپنے ایک سفر کی ایک خطرناک مہم کی، سچی کہانی سناتا ہوں-

اصل میں یہ میری مہم نہیں تھی- بلکہ مجھے اس میں پھنسا دیا گیا تھا- حالات ایسی صورت اختیار کر چکے تھے کہ میں اس میں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا-

اس عجیب و غریب اور انتہائی خطرناک مہم کا تعلق تاریک براعظم یعنی افریقہ سے ہے- سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنگل کیا ہوتے ہیں اور پھر افریقہ کے جنگل کیا ہوتے ہیں- ہم میں سے اکثر لوگوں نے جنگلوں کا حال کتابوں، رسالوں، ایڈونچر کی کہانیوں میں پڑھا ہے- ان کا جنگل کا تصور یہ ہے کہ وہاں جنگلی جانور، شیر بھالو، ہاتھی، چیتے پھرتے رہتے ہیں- جو آدمی وہاں جائے یہ درندے اسے کھا جاتے ہیں- یا پھر وہاں جنگلی پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہوتے ہیں چشمے بہتے ہیں- شکاری بندوق لے کر نکلتے ہیں اور شام کو بہت سا شکار مار کر لاتے ہیں اور آگ جلا کر مزے سے دعوت اڑاتے ہیں- جنگل کے بارے میں جن لوگوں کا اس قسم کا تصور ہے میں انہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی جان پر رحم کریں اور جنگلوں کا رخ نہ کریں- اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگل میں شیر ہاتھی چیتے ہوتے ہیں اور ندی نالے دریا بھی بہتے ہیں مگر ان ندی نالوں اور دریاؤں کے کنارے دو دو میل تک ایسی خطرناک دلدلیں بھی ہوتی ہیں کہ جن میں اگر کسی ہاتھی کا پاؤں پڑ جائے تو پھر وہ باہر نہیں نکل سکتا- دیکھتے دیکھتے دلدل اسے نگل جاتی ہے- ایسی ایسی زہریلی کانٹے دار

جھاڑیاں ہوتی ہیں کہ جن کے کانٹے چبھ جائیں تو سارا بدن سوج جاتا ہے۔ درختوں کے ساتھ سبز رنگ کے سانپ جنگلی بیلوں کی طرح لٹک رہے ہوتے ہیں۔ مکھی جتنا بڑا مچھر ہوتا ہے۔ جنگل کے اندر کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ خودرو جھاڑیاں گھنے درختوں کے نیچے میلوں تک پھیلی ہوتی ہیں۔ شکاری چاقو یا چھرے سے ان جھاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر راستہ خود بنانا پڑتا ہے۔ کسی جھاڑی کسی درخت کے پیچھے سے نکل کر کوئی درندہ اچانک آپ پر حملہ کر سکتا ہے۔ کئی کئی میل تک کوئی جنگلی پھلدار درخت اور پانی کا چشمہ نہیں ملتا۔ اگر کوئی چشمہ مل بھی جائے تو اس کا پانی پینے کے لائق نہیں ہوتا۔

افریقہ کے جنگل اس سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ وہاں آدم خور درندوں کے علاوہ آدم خور قبیلے بھی پائے جاتے ہیں۔ ایسے وحشی جنگلوں کے قبیلے بھی ہیں کہ جو بھولے بھٹکے آدمی کو پکڑ کر اس کا سر کاٹ لیتے ہیں اور پھر اسے خاص طریقے سے سکیڑ کر نارنگی جتنا بنا کر اپنے گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔ میں ایک انگریز شکاری مسٹر میکنزی کے ساتھ افریقہ کے جنگلوں میں تین برس تک مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جنگل انسان کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ اسے بہکاتا ہے۔ جو آدمی سمجھ دار ہوتا ہے، جسے جنگل کی نفسیات کا علم ہوتا ہے۔ وہ تو بچ کر واپس آ جاتا ہے۔ انجانا آدمی ایک بار افریقہ کے جنگلوں میں داخل ہو جائے تو اس کا زندہ سلامت واپس آنا محال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے قدیم اور قدرتی جنگلوں کے خاص راز ہوتے ہیں۔ بھید اور اسرار ہوتے ہیں۔ آدھی رات کو کبھی کبھی اچانک جنگل میں ایسا بھیانک سناٹا چھا جاتا ہے کہ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے دور کوئی چڑیل آپ کو بلا رہی ہو۔ یا آپ کی طرف چلی آ رہی ہو۔ اگر آپ بے خبری سے ایسے علاقے میں چلے گئے جو کسی آدم خور شیر کا علاقہ ہے تو پھر آپ کی خیر نہیں۔ آدم خور آپ کے پیچھے لگ جائے گا اور موقع پاتے ہی چھلانگ لگا کر دبوچ لے گا۔ کسی تجربہ کار شکاری یا کسی جنگلی گائیڈ کی مدد کے بغیر آپ ان جنگلوں سے زندہ سلامت باہر نہیں نکل سکتے۔ افریقہ کے جنگلوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچانک گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ کانٹے دار، زرد سوکھی گھاس کے اونچے نیچے میدان دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ آدمی بھوک پیاس سے مر جاتا ہے۔ یا پھر اچانک زمین ہلنے لگتی ہے اور وحشی ہاتھیوں کے غول کے

غول کسی طرف سے نکل آتے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے کسی ہاتھی کی آپ پر نظر پڑ گئی تو پھر آپ بچ نہیں سکتے۔ افریقہ میں ایسے تاریک جنگل بھی ہیں کہ جن کے اندر آج تک سورج کی کرنیں نہیں پہنچ سکیں۔ یہاں اتنا حبس ہوتا ہے کہ آدمی کی جان نکلنے لگتی ہے۔ تالابوں میں اتنی جونکیں ہوتی ہیں کہ منٹوں میں آدمی کا خون پی جاتی ہیں۔

میرا مقصد آپ کو ان جنگلوں سے ڈرانا نہیں ہے بلکہ آپ کا ان جنگلوں سے تعارف کروانا ہے۔ کیونکہ جو واقعات میں بیان کرنے والا ہوں ان کا تعلق افریقہ کے انہی جنگلوں سے ہے۔ اب میں اصل داستان کی طرف آتا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں انگریز شکاری مسٹر میکنزی کے ساتھ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں تین برس تک مارا مارا پھرنے کے بعد مڈغاسکر کے شمال مغربی چھوٹے سے ساحلی شہر ماسانیا میں آرام سے کچھ وقت گزار رہا تھا۔

اگر آپ افریقہ کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو جنوب میں جہاں بحراوقیانوس اور بحرہند آکر ملتے ہیں مشرق کی طرف ایک بہت بڑا جزیرہ دکھائی دے گا۔ یہ مڈغاسکر ہے۔ ماہرین ارضیات کہتے ہیں کہ کروڑوں سال پہلے یہ افریقہ کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ مگر جب براعظموں کی توڑ پھوڑ شروع ہوئی تو افریقہ کا یہ حصہ کٹ کر الگ ہو گیا۔ اب اس کے اور جنوبی افریقہ کے مشرقی ساحل کے درمیان 200 کلومیٹر کی چوڑائی میں سمندر بہتا ہے جس کو موزمبیق چینل کہتے ہیں۔ اس وقت میری عمر اٹھائیس انتیس برس کے قریب ہو گی۔ جسم تکلیفوں کا عادی تھا اور سیر و سیاحت کا شوق مجھے اڑائے لئے پھرتا تھا۔ مڈغاسکر میں میرا ارادہ چھ سات مہینے رہنے کا تھا۔ اس کے بعد میرا پروگرام کسی مال بردار جہاز میں سوار ہو کر آسٹریلیا کی طرف نکل جانے کا تھا۔

ماسانیا ایک چھوٹا سا مگر بڑا سرسبز و شاداب ساحلی شہر تھا۔ ڈربن اور موزمبیق سے جو مسافر بردار یا تجارتی جہاز افریقہ کے دوسرے ساحلی شہروں یا خلیج کی ریاستوں اور کراچی کی طرف سفر پر نکلتے وہ ماسانیا کی بندرگاہ پر تھوڑی دیر کے لئے ضرور لنگر انداز ہوتے۔ اس وجہ سے ماسانیا شہر کی تجارتی حیثیت بڑی اہم ہو گئی تھی۔ میں کوئی دولت لے کر یا بینک میں رقم جمع کروا کر گھر سے سیاحت کرنے نہیں نکلا تھا۔ میرا طریق کار یہ تھا کہ جہاں جاتا وہاں محنت مشقت کا جو کام مل جاتا کر لیتا۔ یوں تھوڑے

پیسے بچا کر اگلے سفر پر روانہ ہو جاتا- مڈغاسکر میں میرے محسن انگریز شکاری مسٹر میکنزی نے اپنے ایک آسٹریلوی دوست مسٹر رچرڈ کے نام ایک خط لکھ دیا تھا- مسٹر رچرڈ مڈغاسکر چائے کی ایک فیکٹری کا مینجر تھا- اس نے مجھے اپنی فیکٹری میں نوکر رکھ لیا میرا کام یہ تھا کہ چائے کے باغات سے جب چائے کے تازہ سرسبز پتوں کی بھری ہوئی بوریاں آتیں اور انہیں ٹرک سے اتار کر کنڈے پر تولا جاتا تو میں اس کا وزن ایک رجسٹر پر لکھتا جاتا- یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا- وہیں فیکٹری میں مجھے ایک ٹین کی چھت والا کوارٹر مل گیا تھا- جو رقم مجھے پندرہ دن کے بعد تنخواہ کی شکل میں ملتی اس میں سے کچھ خرچ کر لیتا اور کچھ اگلے سفر کے لئے بچا کر رکھ لیتا تھا- مسٹر رچرڈ کی عمر پچاس سے اوپر تھی- بھاری قد کاٹھ کا آدمی تھا- آسٹریلیا میں وہ پائلٹ تھا- کوریا اور ویت نام کی جنگوں میں وہ بمبار جہاز اڑاتا رہا تھا پھر ریٹائر ہو گیا- اور مڈغاسکر آ کر یہیں آباد ہو گیا- اکیلا چھڑا چھانٹ آدمی تھا- بڑا خوش مزاج تھا اور مجھے ویت نام اور کوریا کی جنگ کے بڑے قصے سنایا کرتا تھا- حبشی مزدوروں سے وہ بڑی سختی سے کام لیتا- فیکٹری کے پیچھے پہاڑی ڈھلانوں پر چائے کے باغات تھے جہاں حبشی عورتیں چائے کی پتیاں توڑتے ہوئے کبھی کبھی کوئی گیت بھی گانے لگتیں- ان کے گانے کی آواز میرے کواٹر تک آتی-

ایک روز میں نے دیکھا کہ مسٹر رچرڈ فوڈ سٹور سے خوب تھیلے بھر کر لایا ہے- جیپ سے نوکر نے اس کے تھیلے اتار دیئے تھے میں نے پوچھا-

"مسٹر رچرڈ! اتنا کھانے پینے کا سامان کس لئے لایا گیا ہے؟"

رچرڈ دانتوں میں دبا ہوا موٹا سگار نکال کر بولا- "آسٹریلیا سے میرا دوست بریڈی اپنی بیوی کے ساتھ آ رہا ہے- وہ میرے پاس ہی ٹھہرے گا- آج رات اسے ڈنر دے رہا ہوں تم بھی ضرور آنا"

میں نے کہا "مسٹر اور مسز بریڈی یہاں سیر و سیاحت کی غرض سے آ رہے ہیں کیا؟"

رچرڈ نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا-

"نئی نئی شادی کی ہے- بیوی کو لے کر اپنے دو انجنوں والے جہاز پر آسٹریلیا

سے چلا ہے- مجھ سے مل کر ڈربن چلا جائے گا"

میں اس شخص بریڈی کی دلیرانہ مہم جوئی سے بڑا متاثر ہوا کہ جو دو انجنوں والے چھوٹے جہاز پر آسٹریلیا سے مڈغاسکر تک بحر ہند کا اتنا طویل سمندری راستہ طے کر کے آ رہا تھا- جب میں نے اس طویل سمندری سفر کے خطرات کا ذکر کیا تو رچرڈ کہنے لگا-

"بریڈی ایک پرائیویٹ ائرلائن میں پائلٹ رہ چکا ہے- اب نوکری چھوڑ کر نوادرات کی تجارت کرتا ہے- بڑا تجربہ کار پائلٹ ہے- اس قسم کے ایڈونچر وہ اکثر کرتا رہتا ہے"

ماسانیا میں ایک مختصر سا سول ائرپورٹ بھی تھا- شام کو مسٹر بریڈی کا دو انجنوں والا طیارہ اتر پڑا- رچرڈ نے بریڈی سے میرا بھی تعارف کرایا کہ یہ مسٹر اے ایچ ہے اور مشہور انگریز سیاح میکنزی کے ساتھ افریقہ میں تین برس گزار چکا ہے- رچرڈ میری زندگی کے مہم جوئی کے پہلو سے بہت متاثر تھا اور وہ مجھ سے اکثر افریقہ کے جنگلوں کے واقعات بڑی دلچسپی سے سنا کرتا-

مسٹر بریڈی کی عمر چالیس کے قریب ہو گی مگر اس کی بیوی جوان اور خوبصورت لڑکی تھی- اس کا نام گارشیا تھا- بریڈی شکل صورت سے چالاک آدمی لگتا تھا- اس کی بیوی کی شکل بڑی معصوم تھی- رات کو ڈنر پر میں بھی موجود تھا- رچرڈ نے بریڈی سے پوچھا-

"مانا کہ تم بڑے تجربہ کار پائلٹ ہو اور تمہارا دو انجنوں والا طیارہ بھی کافی طاقتور ہے مگر ایک چھوٹے طیارے پر اتنا لمبا سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم کسی بھی عام جہاز کے فسٹ کلاس میں بیوی کے ساتھ سفر کر سکتے تھے- تم مالدار آدمی ہو"

بریڈی ہنسنے لگا بولا

"تمہیں تو معلوم ہی ہے شروع سے کوئی انوکھا کام کرنے کا شوقین ہوں- میں نے سوچا شادی کی ہے تو کوئی ایڈونچر بھی ہو جانا چاہئے"

اس کی بیوی گارشیا بولی

"مجھے تو سارا رستہ فکر ہی لگا رہا- ذرا جہاز نیچے اوپر ہوتا تو میں گھبرا جاتی

تھی-

خدا کا شکر ہے یہ مرحلہ طے ہوا- اب میں نے بریڈی کو کہہ دیا ہے کہ ڈربن سے واپس آسٹریلیا سمندری جہاز میں جائیں گے"

بریڈی نے اپنا طیارہ ائرپورٹ پر ہی ایک طرف کھڑا کیا تھا- مجھے صبح کی سیر کا بڑا شوق ہے- دوسرے دن صبح کو میں سیر کرتا ائرپورٹ کے قریب سے گزرا تو مجھے بریڈی کے طیارے کے قریب رچرڈ کی کار کھڑی نظر آئی- میں نے سوچا کہ رچرڈ اور بریڈی طیارے کی ضروری چیکنگ کے لئے آئے ہوئے ہیں چل کر ان سے ملتے ہیں- اسی بہانے طیارے کو اندر سے دیکھنے کا بھی موقع مل جائے گا- میں تاروں کا جنگلا پھلانگ کر طیارے کے قریب آ گیا- طیارے کی سیڑھی باہر نکلی ہوئی تھی- میں سیڑھیاں چڑھ کر طیارے کے اندر گیا تو دیکھا کہ بریڈی ایک سیٹ پر بیٹھا ہے- گود میں لوہے کا درمیانے سائز کا ایک بکس ہے جو آدھا کھلا ہے- مجھے صرف ہیرے جواہرات کا ایک ہار ہی نظر آیا جو بریڈی کے ہاتھ میں تھا اور جس پر جھکا وہ غور سے دیکھ رہا تھا- اس کی پیٹھ میری طرف تھی اور مجھے صرف اس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا- میرے پاؤں کی آہٹ سن کر بریڈی نے جلدی سے ہار بکس میں ڈالا اور اسے بند کر کے پلٹ کر میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو- صاف لگ رہا تھا کہ اسے میرا وہاں آنا سخت ناگوار لگا ہے- "کیا بات ہے؟" بریڈی نے کچھ اور ترش روئی سے پوچھا- مجھے خود افسوس ہو رہا تھا کہ میں وہاں کیوں آ گیا- میں نے کہا

"صبح کی سیر کرنے ادھر نکل آیا- نیچے رچرڈ کی گاڑی دیکھی تو اوپر آ گیا"

بریڈی نے روکھے پن سے کہا

"وہ یہاں نہیں ہے تم جا سکتے ہو"

میں طیارے سے باہر نکل آیا- بڑی خفت محسوس ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ وہاں چلا گیا- مگر کچھ حیران بھی تھا کہ بریڈی وہاں چھپ کر بیٹھا ہیرے جواہرت کا ہار اتنے غور سے کیوں دیکھ رہا تھا- واپس آ کر میں نے رچرڈ کو کچھ نہ بتایا صرف اتنا پوچھا کہ اس کی گاڑی کہاں ہے کہنے لگا-

"بریڈی صبح صبح آ کر لے گیا تھا- کہتا تھا بندرگاہ کی سیر کرنے جا رہا ہوں"

میں سمجھ گیا کہ جواہرات کے ہار والی بات بریڈی نے اپنے ہم راز دوست رچرڈ کو بھی نہیں بتائی- مجھے یہ سارا معاملہ بڑا پراسرار لگا لیکن میں نے سوچا کہ مجھے خواہ مخواہ ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہئے- اگر کوئی پراسرار بات ہے تو یہ دونوں پرانے دوست جانیں- لیکن آگے چل کر اس آدمی بریڈی کی وجہ سے میں زندگی اور موت کی کشمکش میں پھنس جاؤں گا اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا-

یہ میں آپ کو اگلی ملاقات میں بتاؤں گا-

دوسرے دن بریڈی نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں- اس روز آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا بھی تیز چلنے لگی تھی- رچرڈ نے بریڈی کو اس روز ٹھہر جانے کے لئے کہا تو بریڈی کندھے جھٹکا کر بولا

"یہ کیا موسم ہے- صرف بادل چھائے ہیں اور ہوا چل رہی ہے- میں نے خطرناک طوفانوں میں جہاز چلائے ہیں"

رچرڈ نے اسے کافی سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ افریقہ کے علاقے کے موسموں سے واقف نہیں ہے- ان کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا- طوفان آتا ہے تو قیامت کی بجلیاں کڑکتی ہیں مگر بریڈی جانے پر مصر رہا- میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس روز ہر حالت میں ساؤتھ افریقہ کے شہر ڈربن پہنچنا چاہتا تھا- شاید اس نے وہاں کسی کو وقت دے رکھا تھا- رچرڈ نے بھی یہ سوچ کر زیادہ اصرار نہ کیا کہ بہرحال بریڈی ایک کہنہ مشق تجربہ کار پائلٹ ہے اور پھر مڈغاسکر سے ڈربن تک کا فضائی فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں- البتہ بریڈی کی نوجوان بیوی گارشیا کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ضرور تھے- صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس روز ہوائی سفر ملتوی کرنا چاہتی ہے مگر اپنے خاوند بریڈی کی ضد کے آگے وہ بھی چپ تھی-

دن کے دس بج رہے تھے کہ بریڈی نے گارشیا کو ساتھ لیا- پہلے رچرڈ سے اور پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنے طیارے میں جا کر بیٹھ گیا- انجن سٹارٹ ہوئے میں اور رچرڈ اس چھوٹے سے سول ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور میں آ گئے تھے یہاں کے سبھی لوگ رچرڈ کی بڑی عزت کرتے تھے- بریڈی کا طیارہ پرواز کر گیا- جب وہ نظروں سے غائب ہو گیا تو بارش شروع ہو گئی- ساتھ بادل بھی گرجنے لگے اور ہوا بھی تیز ہو

گئی- رچرڈ کنٹرول ٹاور میں ریڈیو آفیسر کے پاس بیٹھا وائرلیس پر بریڈی کی آواز سن رہا تھا- وہ یہی کہہ رہا تھا کہ میں ٹھیک ہوں- طیارہ بالکل ٹھیک ہے- میں اتنی بلندیوں پر ہوں اتنی میری رفتار ہے اور میرا رخ ڈربن کے فضائی راستے کی طرف ہے- یہ سلسلہ تھوڑی دیر تک جاری رہا- پھر اچانک طیارے کے سگنل آنا بند ہو گئے- رچرڈ نے پریشان ہو کر وائرلیس آفیسر سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا اور وائرلیس پر بریڈی کے طیارے سے رابطہ پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگا- مگر بریڈی کے طیارے کو جیسے فضا نے نگل لیا تھا- ساؤتھ افریقہ کے ساحلی ہوائی اڈوں سے طیارے کے بارے میں معلوم کیا گیا- کسی ائرپورٹ کے کنٹرول ٹاور کو طیارے کے سگنل موصول نہیں ہوئے تھے- اس روز بڑی بارش ہوئی- شام کے وقت بارش کا طوفان رکا تو رچرڈ نے کنٹرول ٹاور والوں سے مل کر ایک بار پھر طیارے کا کھوج لگانے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا- رچرڈ کہنے لگا-

"بریڈی ایک تجربہ کار پائلٹ ہے- طیارے میں پٹرول بھی فل تھا-

میں نے کہا "ہو سکتا ہے طیارہ طوفان میں پھنس گیا ہو اور بریڈی نے طیارہ کسی جگہ اتار لیا ہو"

یہ میں نے رچرڈ کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا تھا- وگرنہ میں جانتا تھا کہ افریقہ کے جن ساحلی جنگلوں کے اوپر سے ہو کر طیارہ ڈربن کی طرف جا رہا تھا، وہ اتنے گھنے ہیں کہ وہاں کسی طیارے کو اتارنا ناممکن ہے- دوسرے دن رچرڈ نے ایک طیارہ چارٹرڈ کرایا اور بڑے تجربہ کار کھوجیوں کو ساتھ لے کر بریڈی کے طیارے کی تلاش میں نکل گیا- مگر طیارے کا کوئی سراغ نہ مل سکا- ارد گرد کے ہوائی اڈوں سے دوبارہ رابطہ قائم کیا گیا- بریڈی کا طیارہ کسی جگہ بھی اترا تھا- مجھے یقین ہو گیا کہ طیارہ جنگل میں گر کر تباہ ہو گیا ہے-

رچرڈ کا یہی خیال تھا کہ بریڈی بڑا ماہر ہوا باز ہے- وہ ضرور جنگل میں کسی جگہ اتر گیا ہے اور بہت جلد رابطہ پیدا کرے گا- احتیاط کے طور پر اس نے آسٹریلیا میں بریڈی کے ایک کاروباری پارٹنر کو طیارے کی گمشدگی کی اطلاع کر دی- مجھے بریڈی کی خوبصورت نوجوان بیوی کے مرنے کا بڑا افسوس تھا- ویسے بھی وہ اس خطرناک موسم

میں بریڈی کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی- مگر بریڈی اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا- جب آخری وقت آ جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی بہانہ بن جاتا ہے-

طیارے کو گم ہوئے تیسرا دن تھا کہ آسٹریلیا سے دو آدمی رچرڈ کے پاس مڈغاسکر پہنچ گئے- ان میں سے ایک نے کہا میرا نام بیکر ہے میں بریڈی کا دوست اور کاروبار میں اس کا پارٹنر بھی ہوں- اس نے رچرڈ کو اپنی تمام دستاویزات دکھائیں جو بالکل اصلی تھیں- دوسرے نے کہا کہ میرا نام ہارڈی ہے میں بریڈی کی بیوی گارشیا کا ماموں ہوں- یہ لوگ بریڈی اور گارشیا کے طیارے کی گم شدگی کا سن کر یہاں آئے تھے- وہ بڑے فکر مند تھے- انہوں نے بریڈی اور گارشیا کے سفر کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم کیں اور کہا کہ ہم طیارے کی تلاش میں جائیں گے- رچرڈ کہنے لگا کہ ہم نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی- اب تو یہی ایک امید باقی رہ گئی ہے کہ شاید میرے دوست نے طیارہ کہیں اتار لیا ہو اور وہ کسی جگہ سے مجھے ٹیلی فون کر دے یا اس کا کوئی ٹیلی گرام آ جائے- مگر یہ جو آسٹریلیا سے دو نئے آدمی تھے- جن میں سے ایک مسٹر بیکر اپنے آپ کو بریڈی کا کاروباری پارٹنر اور دوسرا ہارڈی خود کو گارشیا کا ماموں بتا رہا تھا، ان دونوں کو جیسے یقین تھا کہ بریڈی اور گارشیا زندہ ہیں اور افریقی ساحل کے کسی جنگل میں ان کی مدد کے منتظر ہیں- کہنے لگے کہ ہم پورا انتظام کر کے آئے ہیں- ہم آج ہی طیارے کی تلاش کی مہم شروع کرنا چاہتے ہیں-

رچرڈ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا- اس نے کہا- اگر آپ یہ ارادہ کر کے آئے ہیں تو میں ہر طرح کی مدد کو حاضر ہوں- بیکر کہنے لگا کہ ہمیں افریقہ کے جنگلوں کا تجربہ نہیں ہے- آسٹریلیا اور یورپ کے جنگل ضرور دیکھے ہیں اور وہاں تھوڑا بہت شکار بھی کھیلتے رہے ہیں مگر افریقہ کے جنگلوں میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا- اگر ہمیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ان جنگلوں کا تجربہ رکھتا ہو اور ہماری رہنمائی کرے تو ہم اسے معقول معاوضہ دیں گے اور اس کا سارا خرچہ بھی اٹھائیں گے-

اس پر رچرڈ نے میری طرف دیکھا اور ان لوگوں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا-

"اگر مسٹر اے ایچ راضی ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر گائیڈ

آپ کو یہاں نہیں ملے گا"

رچرڈ نے انہیں بتا دیا کہ میں مشہور انگریز شکاری میکنزی کے ساتھ کئی برس تک جنوبی افریقہ کے جنگلوں میں گھومتا پھرتا رہا ہوں اور ان جنگلوں کے بھید جانتا ہوں اور وہاں رہنے والے وحشی قبائل کے رسم و رواج سے بھی واقف ہوں۔ بیکر اور ہارڈی بڑے خوش ہوئے۔ بیکر نے انسانی ہمدردی اور ہارڈی نے اپنی معصوم بھانجی کے نام پر مجھ سے مدد کی درخواست کی۔ میں خود ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ میں تو فاقہ کشی کی حالت میں بھی جنگلوں کی سیاحت کو نکل جانے کا عادی تھا اور یہاں تو مجھے معقول معاوضہ مل رہا تھا۔ بیکر نے اسی وقت اٹیچی کیس کھولا اور مجھے ایک ہزار امریکی ڈالروں کے نوٹ دینے کے بعد کہا۔

"طیارہ ملے یا نہ ملے۔ واپسی پر ہم تمہیں مزید ایک ہزار ڈالر دیں گے۔ اس کے علاوہ روز کا خرچہ ہمارے ذمے ہوگا"

میں تیار ہو گیا۔

طے یہ ہوا کہ اگلے روز اس مہم پر نکلا جائے گا۔ وہ اپنے ساتھ جنوبی افریقہ کا پورا نقشہ لائے تھے۔ نقشہ میز پر پھیلا دیا گیا۔ میں نے نقشے پر مڈغاسکر کے مغربی ساحل پر انگلی رکھ کر کہا۔

"یہ وہ شہر ہے جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں۔ بریڈی اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سے طیارہ لے کر اڑا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد اس کے سگنل آنا بند ہو گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بمشکل موزمبیق کی آبنائے پار کر کے موزمبیق کے علاقے میں داخل ہی ہوا ہوگا۔ اس لحاظ سے ہمیں اپنی مہم کی ابتدا موزمبیق کے ساحلی علاقے سے کرنی ہوگی"

میں نے انہیں بتایا کہ موزمبیق کا یہ مشرقی ساحل شروع سے لے کر آخر تک گھنے دشوار گزار جنگلوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان کا شمار افریقہ کے قدیم ترین قدرتی اور خطرناک جنگلوں میں ہوتا ہے اور یہاں ایک روایت کے مطابق ان حبشی جنگلیوں کے کچھ قبیلے بھی آباد ہیں جو انسانی سروں کا شکار کرتے ہیں ہارڈی نے حیران ہو کر پوچھا

"کیا مطلب؟"

میں نے انہیں بتایا کہ یہ لوگ بھولے بھٹکے مسافروں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ پھر ان کا سر کاٹ کر انہیں نارنگی جتنا چھوٹا کر کے یا تو اپنے قبیلے کے سردار کو پیش کرتے ہیں یا اپنے گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔ بیکر اور ہارڈی کے چہروں پر تھوڑی سی پریشانی کے اثرات ابھرے۔ مگر فوراً ہی انہوں نے کندھے جھٹک کر اس عزم کا اظہار کیا کہ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ موجود ہے وہ ہر قسم کے جنگلی وحشیوں سے نمٹ لیں گے۔ میں چپ ہو گیا یہ اناڑی لوگ تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایک آدمی جدید ترین اسلحے اور راکٹ لانچر لے کر بھی جنگل میں جا رہا ہو تو بڑی خاموشی سے ہوا کی لہر کے ساتھ پیچھے سے یا دائیں بائیں سے سانپ کے زہر میں بجھا ہوا ایک تیر آتا ہے اور اس آدمی کے جسم میں لگتے ہی اسے ہلاک کر ڈالتا ہے۔ میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ جنگل میں جتنا مجھ سے ہو سکا ان دونوں کی حفاظت کروں گا۔ اور انہیں خطرناک علاقوں سے آگاہ کرتا رہوں گا۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ اگر خوبصورت معصوم گارشیا اگر زندہ ہے تو اسے ضرور تلاش کرنا چاہئے۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ یہ لوگ زندہ مل سکیں گے۔

سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بارہ بور کی دو بندوقیں اور دو پستول بیکر اور ہارڈی اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ مزید تین رائفلیں اور ایک بندوق خریدی گئی۔ رائفل پر میرا ہاتھ رواں تھا اور اس کا مجھے تجربہ بھی تھا۔ چنانچہ ایک رائفل مجھے دے دی گئی۔ ان کے علاوہ نائیلون کا ایک خیمہ، عام استعمال کی دوائیاں، فسٹ ایڈ کا سامان، راشن کے ڈبے، کھانا وغیرہ پکانے کا مختصر سا سامان وغیرہ خریدا گیا۔ شکاریوں والی چمڑے کی جرسیاں اور ہیٹ خریدے گئے۔ ایک سال کے بعد میں ایک بار پھر دنیا کے خطرناک ترین جنگلوں کا رخ کر رہا تھا۔ خوش بھی تھا کہ نیا ایڈونچر ہوگا۔ ساتھ ہی دل میں ایک ہلکا سا خوف بھی لگ گیا تھا کہ کہیں کوئی ایسی غلطی نہ کر بیٹھوں کہ راستہ بھول کر انسانی سر [illegible] والے درندہ صفت حبشیوں کے ہاتھ لگ جاؤں۔ ہم نے اپنے اپنے تھیلے میں ٹارچیں اور شکاری چاقو بھی رکھ لئے تھے۔ ہمارے پاس ایک ایک واکی ٹاکی وائرلیس سیٹ بھی تھا تاکہ جنگل میں اگر کوئی کھو جائے تو وائرلیس کے ذریعے پارٹی سے رابطہ پیدا کر سکے۔ اس مہم کا پہلا مرحلہ جنگل کا فضائی سروے تھا۔

ہیلی کاپٹر کا تجربے کار پائلٹ تھوڑی دیر بعد دوربین سے نیچے جنگل میں جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ اچانک اس کی نظریں ایک جگہ پر رک گئیں۔ اس نے مسٹر بیکر سے کہا۔

"مجھے درختوں میں کوئی چیز نظر آ رہی ہے"

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو جو چیز نظر آئی وہ نیچے درختوں کی شاخوں میں الجھی ہوئی تھی۔ بیکر جلدی سے بولا۔

"ہیلی کاپٹر نیچے لے جاؤ"

"ہیلی کاپٹر اتنا نیچے آ گیا کہ ہمیں درختوں کے پتے صاف نظر آنے لگے۔ شاخوں میں الجھی ہوئی سفید چیز ہوائی جہاز کے پر کا آدھا ٹکڑا تھا۔ ہارڈی چلایا۔

"یہ بریڈی کے جہاز کا پر ہے۔ جہاز یہیں کسی جگہ کریش ہوا ہے۔ ہیلی کاپٹر اتارو"

ذرا آگے جا کر درختوں کے درمیان ایک کھلی جگہ آ گئی۔ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر وہاں اتار دیا۔ اب تباہ شدہ جہاز کے ڈھانچے کی تلاش کا کام شروع ہو گیا۔ یہ جنگل اتنا گھنا تھا کہ ہم زیادہ دور نہ جا سکے اور جہاز کے ڈھانچے کا بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ واپس جا کر سامان لایا جائے اور اسی جگہ کیمپ لگا کر جہاز کے ڈھانچے کو تلاش کیا جائے۔ سہ پہر تک واپس جا کر سارا ضروری سامان لایا گیا اور کھلی جگہ میں نائیلون کا خیمہ لگا دیا گیا۔ ہیلی کاپٹر واپس چلا گیا۔ بیکر اور ہارڈی جہاز کا ڈھانچہ تلاش کرنے کو بے تاب تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ رات ہونے والی ہے۔ ایک تو یہ جنگل بڑے خطرناک ہیں۔ دوسرے ویسے بھی اندھیرے میں کچھ نظر نہ آئے گا۔ بہتر ہے کہ رات کو آرام کریں۔ صبح تلاش کا کام شروع کریں گے۔

بیکر اور ہارڈی چپ ہو گئے۔ میں نے اس دوران یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ان دونوں کو اپنے دوست اور اس کی بیوی گارشیا کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی فکر یہ ہے کہ کسی طرح سے جہاز کا ڈھانچہ مل جائے۔ میں نے اپنے شک شبے کو اپنے تک ہی رکھا۔

ویسے بھی میرا کام گائیڈ کا تھا۔ مجھے جنگل میں ان دونوں آسٹریلیا کے باشندوں کی راہنمائی کرنی تھی۔ میرا جہاز کے ڈھانچے یا بریڈی اور اس کی بیوی گارشیا سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ خیال کر کے مجھے دکھ ضرور ہوتا کہ ایک معصوم صورت نوجوان لڑکی اتنے بھیانک حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ جہاز کے ٹوٹے ہوئے پر کو دیکھ کر مجھے بھی یقین ہو گیا تھا کہ جہاز آگے جا کر جنگل میں کسی جگہ کریش ہو گیا ہے۔ کھانا وغیرہ وہیں پکا کر ہم نے شام ہی کو کھا لیا۔ ہم کافی کے مگ لے کر بیٹھ گئے۔ بیکر کا خیال تھا کہ رات کو جنگلی درندوں سے بچنے کے لئے خیمے کے ارد گرد آگ روشن کی جائے۔ میں نے مشورہ دیا کہ ہم ایک ایسے جنگل کے وسط میں آ گئے ہیں جہاں جنگلی درندوں کے علاوہ آدم خور جنگلی قبیلے بھی رہتے ہیں۔ آگ کی روشنی اور دھوئیں کی بو انہیں ہماری طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ رات کو باری باری پہرہ دیا جائے۔ وہ مان گئے۔ رات کو گیس کا لیمپ بجھا دیا گیا۔ پہلی ڈیوٹی مسٹر بیکر نے دی۔ اس کے بعد ہارڈی رائفل لے کر خیمے کے سامنے ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ رات کے تین بجے اس نے مجھے گارڈ ڈیوٹی پر بٹھایا اور سو گیا۔ میرے لئے جنگل کا ہیبت ناک سناٹا کوئی انوکھی شے نہیں تھی۔ میں ان جنگلوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ درندوں کی طرح مجھے بھی جنگلی جانوروں کی بو دور سے آ جاتی تھی۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ کسی طرف سے کسی وحشی حبشی کا زہر میں بجھا ہوا تیر میری موت کا پیغام لے کر نہ آ جائے ---- لیکن ایک اطمینان بھی تھا کہ یہ موزمبیق کے ساحلی جنگلوں کا خطہ تھا اور وحشی قبائل ساحل سے دور دشوار گزار جنگلوں میں آباد تھے۔ میں اپنے شکاری استاد مسٹر میکنزی کے ساتھ کبھی اس طرف نہیں آیا تھا مگر افریقہ کے ان جنگلوں کی آوازوں، ہواؤں اور جھاڑیوں کی معمولی سے معمولی حرکت سے میری آنکھیں اور کان مانوس تھے۔ رات کے پچھلے پہر صرف ایک لگڑ بگڑ، انسانوں کی طرح چھوٹے چھوٹے قہقہے لگاتا ادھر سے گزرا۔ میں نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ تھوڑی دیر وہ چمکیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر جدھر سے آیا تھا ادھر کو چلا گیا۔

رات گزر گئی ----

دوسرے روز طیارے کی تلاش کا کام شروع ہوا۔

یہاں کسی کسی جگہ درختوں کے تنے ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ درمیان میں کہیں کہیں خالی گھاس کے ٹکڑے بھی آ جاتے۔ سارا دن ہم مارے مارے پھرتے رہے ---- گرمی اور حبس نے بیکر اور ہارڈی کا برا حال کر دیا۔ میں آگے آگے تھا۔ بڑی دیکھ بھال کے ساتھ انہیں لے جا رہا تھا۔ ہم نے چار سانپ بھی مارے۔ ایک جگہ ایک ہاتھی ملا جو چھوٹے سے جوہڑ میں کھڑا سونڈ سے اپنے اوپر پانی ڈال رہا تھا۔ ہماری بو سونگھتے ہی اس کی سونڈ رک گئی۔ ہم جلدی سے ایک درخت پر چڑھ گئے۔ مگر ہاتھی نے ہماری مداخلت پر کوئی اعتراض نہ کیا اور نہانے میں مشغول ہو گیا۔ ہم جوہڑ کے پہلو سے ہو کر نکل گئے۔ بیکر اور ہارڈی حیران تھے کہ اگر جہاز کا ایک پر درختوں میں کٹ کر گرا ہے تو جہاز کہاں چلا گیا؟ اسے ضرور اسی علاقے میں کسی جگہ کریش ہونا چاہئے تھا۔ شام کو ہم تھکے ہارے کیمپ میں واپس آ گئے۔ اب یہ فیصلہ ہوا کہ کل سے شمال مغرب کی طرف جہاز کے ڈھانچے کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم جنگل کے خطرناک اور گنجان علاقے میں داخل ہونے والے تھے۔ رات گزر گئی ---- دوسرے دن مہم پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے بیکر اور ہارڈی دونوں کو ضروری ہدایات دیں اور ان کے آگے آگے چل پڑا ---- میرے کاندھے پر رائفل لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں چھرا تھا جس سے جنگل میں راستہ بنانا تھا۔ ہمارے اوپر درختوں نے چھتریاں تان رکھی تھیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے درمیان سے تھوڑا سا آسمان نظر آ جاتا۔ ہم ابھی جنگل کے گنجان اور دشوار گزار علاقے میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ یہاں بھی جھاڑیاں اتنی اونچی اونچی تھیں کہ ہمیں انہیں کاٹ کاٹ کر راستہ بنانا پڑ رہا تھا۔ گنجان درختوں کا ایک قطعہ ختم ہوا تو یہ دیکھ کر ہم پر حیرت طاری ہو گئی کہ سامنے سوکھی زرد گھاس کے کھلے میدان میں دو انجنوں والے جہاز کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ ہم بھاگ کر اس کے پاس آ گئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ بریڈی کا طیارہ ہی تھا۔ وہ ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ ایک پر غائب تھا۔ سامنے والا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ دم کا نیچے والا حصہ اور دو پہیے غائب تھے۔ جہاز کا دروازہ ٹوٹ کر کہیں پیچھے گر چکا تھا۔ میں نے کہا ----

"بریڈی اور گارشیا کی لاشیں اندر ہی کہیں ہوں گی"

ہارڈی نے، جو اپنے آپ کو گارشیا کا ماموں بتاتا تھا، بیکر کی طرف دیکھا اور دونوں نے مجھے باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور خود ایک طرف کو جھکے ہوئے جہاز کے اندر چلے گئے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور تباہ شدہ جہاز کا جائزہ لینے لگا۔ حیرانی کی بات تھی کہ جہاز نے کریش لینڈنگ کی تھی اور اس میں آگ نہیں لگی تھی۔ وہاں کریش لینڈنگ کے لئے جگہ بھی کم تھی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ بریڈی واقعی تجربہ کار پائلٹ تھا۔ میں جہاز کی دوسری طرف آ گیا۔ مجھے گارشیا اور اس کے خاوند کے بارے میں تشویش لگی تھی کہ وہ جہاز کے اندر شدید زخمی حالت میں ہیں یا مر چکے ہیں۔ مگر بیکر اور ہارڈی ابھی تک جہاز سے باہر نہیں نکلے تھے۔ میں نے باہر سے انہیں آواز دے کر دونوں میاں بیوی کے بارے میں پوچھا---- اندر سے بیکر کی غصے والی آواز آئی۔

"تم نے کیا شور مچا رکھا ہے---- خاموش رہو"

ان کی ناراضگی اور غصہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ وہ مجھے کہہ سکتے تھے کہ دونوں زخمی ہیں یا دونوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ کاک پٹ بالکل خالی تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کریش لینڈنگ کے وقت یا تو میاں بیوی کھڑکی میں سے باہر کود گئے تھے اور یا پیچھے جو دو چار سیٹیں لگی تھیں وہاں انہوں نے پناہ لینے کی کوشش کی ہو گی۔

میں قدم قدم چلتا، ٹوٹے پھوٹے جہاز کے ڈھانچے کو دیکھتا بائیں طرف والے انجن کے پاس آیا جس کا پر آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا تو مجھے جہاز کے اندر سے ہارڈی کی آواز سنائی دی۔ وہ پریشان لہجے میں بیکر سے کہہ رہا تھا۔

"وہ زندہ ہے اور بکس بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے"

میں کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا---- اس کے جواب میں ہارڈی نے کہا----

"اب چپ رہو---- ہمارے گائیڈ کو کچھ پتہ نہیں لگنا چاہئے---- اس کے بغیر ہم اس جنگل سے باہر نہیں نکل سکیں گے"

بیکر کی آواز آئی----

"جہاز کریش ہوا ہے۔ دونوں اگر زندہ نہیں بچے تو شدید زخمی حالت میں یہیں کہیں آس پاس پڑے ہوں گے"

ہارڈی نے جھنجھلا کر کہا----

"ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ دونوں زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بکس کہاں ہو گا"

"بریڈی ساتھ ہی لے گیا ہو گا" بیکر نے جواب دیا---- پھر ٹوٹے ہوئے طیارے کے اندر چیزوں کو ادھر ادھر الٹ پلٹ کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ باہر آ رہے تھے۔ میں جلدی سے دس پندرہ قدم دور جا کر بیٹھ گیا۔ میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے ان دونوں پر پہلے ہی شک تھا کہ یہ دونوں آسٹریلیا سے کسی اور مار پر آئے ہیں۔ انہیں دونوں گمشدہ میاں بیوی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی شے کی تلاش ہے۔ یہ بھید اب کھل گیا تھا کہ وہ شے وہی کالا بکس ہے جس میں سے جواہرات کا ہار نکال کر اس روز طیارے کے اندر بیٹھا بریڈی دیکھ رہا تھا۔ ان کے ساتھ میری جو انسانی ہمدردیاں تھیں وہ تقریباً ختم ہو گئیں کیونکہ یہ لوگ گمشدہ میاں بیوی کی تلاش میں نہیں بلکہ اس خزانے کی تلاش میں وہاں آئے تھے جو بریڈی کے پاس ایک چھوٹے کالے بکس کی شکل میں موجود تھا۔ میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ بریڈی اپنی بیوی گارشیا کے ساتھ ان قیمتی ہیرے جواہرات کو ڈربن سمگل کرنا چاہتا تھا۔ ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ بریڈی کی بیوی معصوم صورت لڑکی گارشیا ان مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہے۔ بریڈی اپنی بیوی کو ڈھال کے طور پر استعمال کر رہا تھا کہ اس پر کسی کو شک نہ پڑے۔

اب صورتحال بالکل بدل گئی تھی۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ ان لوگوں کو جنگل میں یا کسی قصبے کے محفوظ مقام پر چھوڑ کر چپکے سے الگ ہو جاؤں گا۔ یہ جرائم پیشہ سمگلر ٹائپ کے لوگ تھے۔ میرا ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

دونوں گورے یعنی بیکر اور ہارڈی طیارے کے ڈھانچے سے باہر نکل آئے تھے اور اب اس کے بکھرے ہوئے ملبے میں جواہرات کے بکس کو تلاش کر رہے تھے۔ جب انہیں وہاں کچھ نہ ملا تو میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ہارڈی بڑی مکاری سے کہنے لگا۔

"مجھے تو اپنی پیاری بھانجی گارشیا کی فکر ہے۔ اگر زندہ بچ گئی ہے تو خدا جانے جنگل میں کہاں بھٹک رہی ہو گی"

میں نے کوئی جواب نہ دیا---- بیکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا----

"ان دونوں کی لاشیں یہاں نہیں ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہیں- یہاں کہیں انسانی خون کا نشان بھی نہیں- وہ شدید زخمی بھی نہیں ہوئے- قدرت نے انہیں بچالیا ہے- ہمیں ہر حالت میں انہیں تلاش کر کے ان کی مدد کرنی ہو گی"

ہارڈی نے مجھ سے سوال کیا----

"تمہارا کیا خیال ہے- وہ دونوں جنگل میں کس طرف گئے ہوں گے؟"

میں ان دونوں پر یہ ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے ان کے دل کا حال معلوم ہو چکا ہے اور میں جان گیا ہوں کہ انہیں میاں بیوی کی نہیں بلکہ ان کے پاس جو ہیرے جواہرات کا خزانہ ہے اس کی تلاش ہے- مگر میں اپنے طرز عمل سے ان پر یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا---- میں انجان بنا رہا، میں نے ایک جانب درختوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا----

"میرا خیال ہے وہ اس طرف گئے ہوں گے-"

میں نے جس طرف اشارہ کیا تھا وہ جنگل کا کم گنجان علاقہ تھا اور سمادر کے ساحل کی طرف جا نکلتا تھا- یہ جنگل وحشی افریقی قبائل سے محفوظ تھا- میرا پروگرام ان دونوں گوروں کو کسی ساحلی بستی میں چھوڑ کر خود کھسک جانے کا تھا- مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا- بیکر کو ایک جگہ جھاڑیوں کے ساتھ لٹکی ہوئی کوئی چیز نظر آئی- وہ دوڑ کر وہاں گیا اور جھاڑیوں میں لٹکا ہوا ایک سبز رنگ کا رومال اٹھا لایا-

"یہ بریڈی کا سکارف ہے- جہاز اڑاتے وقت وہ سبز رنگ کا سکارف پہنتا ہے"

مجھے بھی یاد آ گیا کہ بریڈی نے گلے میں سبز رنگ کا سکارف ڈال رکھا تھا- یہ جھاڑی جس میں سبز رومال کسی طرح سے الجھ کر رہ گیا تھا شمال کے خطرناک جنگلوں کی طرف تھی- بیکر اور ہارڈی نے اسی وقت متفقہ طور پر شمالی جنگل میں چلنے کا اعلان کر دیا- میں نے کئی بہانوں سے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ شمال کی طرف چلنے پر بضد رہے- انہیں یقین ہو گیا تھا کہ طیارے سے نکل کر دونوں میاں بیوی اسی طرف گئے ہیں- میں کیسے انکار کرتا- چنانچہ ہم اس گنجان تاریک اور دہشت

ناک جنگل میں داخل ہو گئے جہاں ہر قدم پر جان کا خطرہ تھا-

جنگل میں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا-

ہم جھاڑیوں اور درختوں کی زمین تک لٹکتی ہوئی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر راستہ بناتے جاتے رہے تھے- جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے جنگل زیادہ گنجان ہوتا جا رہا تھا- یہاں دن کی روشنی بھی کم ہو گئی تھی---- ہماری چلنے کی رفتار بہت سست تھی- جنگلی جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں کاٹتے کاٹتے ہمارے بازو تھک جاتے تو وہیں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کر لیتے- اس کے بعد پھر چل پڑتے- میرے حساب سے جنگل کا ابھی خطرناک علاقہ شروع نہیں ہوا تھا- میں اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان سمگلروں کو کسی طریقے سے قائل کر کے واپس موڑ دینا چاہتا تھا کہ ایک جگہ جھاڑیوں میں گارشیا کا پرس گرا ہوا مل گیا- بیکر نے جلدی سے پرس اٹھا کر کھولا اور بولا ----

"یہ گارشیا کا پرس ہے- وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے"

پرس میں کچھ ڈالر، میک اپ کا تھوڑا بہت سامان اور ایک رومال پڑا تھا-

اب ان لوگوں کے واپس مڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا- میں نے بھی واپس جانے کا خیال دل سے نکال کر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا کہ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا---- اتنا میں بھی جانتا تھا کہ ان لوگوں سے الگ ہوا تو ان خطرناک جنگلوں میں بھٹک جاؤں گا اور کسی طرف سے آیا ہوا زہریلا تیر مجھے موت کی آغوش میں پہنچا دے گا- میں جنگل میں درندوں اور ہلاکت خیز دلدلوں سے تو کسی حد تک اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا تھا مگر کسی درخت کی اوٹ سے آئے ہوئے زہریلے تیر سے میں اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا تھا-

ہم جھاڑیوں میں راستہ بناتے جنگل میں ڈیڑھ ایک میل اندر آ گئے- تھوڑی سی کھلی جگہ دیکھی تو جان میں جان آئی- وہیں نائیلون کا مختصر سا خیمہ لگا کر آگ جلائی گئی- خشک گوشت بھون کر کھایا گیا- کافی پی- کافی تھکان اتر گئی---- بیکر میرے پاس بیٹھا کافی کا مگ لئے اپنے گمشدہ دوست بریڈی کے بارے میں باتیں کرنے لگا---- وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ بریڈی سے اس کی بڑی دوستی تھی- وہ اس کا جگری یار تھا اور یہی

محبت اسے اس جنگل میں کھینچ کر لے آئی ہے میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے وہ بکس یہاں لے آیا تھا جس میں میرے خیال کے مطابق انتہائی قیمتی ہیرے جواہرات تھے اور جو بریڈی جہاز سے نکلنے کے بعد اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ ہارڈی سگار منہ میں دبائے، رائفل ہاتھ میں تھامے کچھ فاصلے پر درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ بریڈی اور اس کی بیوی جس طرف گئے ہیں اس کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہاں اوپر آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جو ابر آلود تھا۔ دن کی روشنی بھی تھی۔ ہارڈی نے آواز دے کر مجھے بلایا---- وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتا تھا---- بیکر بھی میرے ساتھ ہی آگیا۔ ہارڈی نے ایک جگہ گھاس پر خون کا دھبہ دیکھا تھا۔ یہ خشک ہو چکا تھا۔ اس نے خون کے دھبے کو انگلی سے کھرچا اور بولا---- "یہ انسانی خون ہے---- دونوں میاں بیوی میں سے کوئی ایک زخمی ہے۔ وہ ادھر کو گئے ہیں۔ ہمیں ابھی نکل چلنا چاہئے۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا تو مشکل ہو جائے گی۔"

صاف لگ رہا تھا کہ وہ شکار کی تلاش میں ہیں اور نہیں چاہتے کہ شکار ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ میں نے جھک کر گھاس کو دیکھا۔ ایک جگہ پاؤں کے نشان تھے اور گھاس وہاں سے زمین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ کسی کو عورت کے پاؤں کے نشان تھے جو مرد کے پاؤں کے مقابلے میں چھوٹے تھے---- پاؤں کا رخ جنگل کے اندر کی طرف تھا۔ میں نے ان دونوں میں سے کسی عورت کے پاؤں کے نشان نہ دکھائے۔ وہ جھاڑیوں میں آگے جا کر خون کا کوئی اور دھبہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جونہی انہیں خون کا ایک دھبہ گھاس پر گرا ہوا دکھائی دیا انہوں نے اسی وقت آگے چلنے کا اعلان کر دیا۔ خیمہ اور دوسری چیزیں لپیٹ کر پیٹھ پر ڈال دی گئیں اور ہم ایک بار پھر جنگل میں راستہ بناتے آگے بڑھنے لگے۔

آپ چاہے کچھ کہیں---- لیکن میں آج بھی، جبکہ آپ کو اس دہشت خیز مہم کی کہانی سنا رہا ہوں، یہی کہوں گا کہ میں نے اس مہم میں شریک ہونے کا فیصلہ محض انسانی ہمدردی کے طور پر کیا تھا۔ مجھے ان میاں بیوی سے ہمدردی تھی جن کا چھوٹا جہاز افریقہ کے جنگلوں کے اوپر پرواز کرتا گم ہو گیا تھا۔ اب صورت ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ میں اپنے آپ کو اس دلدل سے باہر نکالنا چاہتا تھا مگر باہر نکلنے کی بجائے اس کے اندر ہی

اندر دھنستا چلا جا رہا تھا۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا اور میں نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ جب سورج غروب ہوا تو جنگل میں ایسی تاریکی چھا گئی جیسے آدھی رات ہو گئی ہو۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں جھاڑیوں اور لٹکتی بیلوں کو کاٹتے آگے بڑھ رہے تھے۔ دونوں لالچی گورے اس کوشش میں تھے کہ رات زیادہ گہری ہونے سے پہلے انہیں بریڈی اور گارشیا کی لاشیں یا وہ زخمی حالت میں مل جائیں تاکہ ان کے پاس جو جواہرات کا بکس ہے وہ چھین کر وہیں سے واپسی کا سفر شروع کر دیں۔ مگر تقدیر ان کے عزائم پر ہنس رہی تھی۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ ٹارچ کی روشنی میں بھی بمشکل دو قدم تک کچھ نظر آتا تھا۔ میں نے انہیں کہا----

"اگر آپ لوگوں نے اپنی مرضی ہی کرنی تھی تو مجھے کس لئے اپنا گائیڈ بنایا تھا؟"

بیکر اور ہارڈی جھاڑیوں پر چھرا چلاتے چلاتے رک گئے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا----

صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ من مانی کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ موت کے منہ میں لے جا رہے ہیں۔ میں جنگل میں خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔ کسی درندے نے حملہ کر دیا تو ہو سکتا ہے ہم بچ جائیں---- لیکن اگر وحشی قبیلے کے جنگلیوں تک ہماری ٹارچ کی روشنی اور جھاڑیاں کاٹنے کی آواز پہنچ گئی تو ہم میں سے ایک بھی زندہ نہیں رہے گا---- رات کے وقت جنگل میں ان کے کان تیز ہو جاتے ہیں اور جنگل کی فضا وائرلیس کی طرح کام کرتی ہے۔ وہ دونوں پسینے میں شرابور تھے۔ وہیں بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں مجھے ان کے حلئے ہی نظر آ رہے تھے۔ ہارڈی کہنے لگا----

"تو کیا ان گھنی جھاڑیوں میں باقی رات گزار دیں؟"

میں نے کہا----

"نہیں---- ادھر میرے پیچھے پیچھے آؤ"

میں نے ان سے جھوٹ نہیں بولا تھا---- افریقہ کا جنگل دن کے وقت کچھ اور ہوتا ہے اور رات کے وقت اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے- دن کے وقت اس جنگل کی ساری بلائیں سو رہی ہوتی ہیں- رات کے وقت یہ ساری بلائیں بیدار ہو جاتی ہیں- ایسی ہیبت ناک خاموشی چھا جاتی ہے کہ آدمی اپنے سانس کی آواز سے ڈر جاتا ہے- اس آسیبی سناٹے میں عجیب عجیب قسم کے حشرات الارض، کیڑے مکوڑے اور درندے شکار کی تلاش میں اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل آتے ہیں- بڑی بڑی خونی جونکیں تالابوں، جوہڑوں کے کنارے پر آ کر ہزاروں کی تعداد میں منہ باہر نکال کر بیٹھ جاتی ہیں- ذرا کسی نے پانی میں پاؤں رکھا اور وہ چمٹ کر آن کی آن میں سارا خون چوس جاتی ہیں- جنگلی جانوروں کو قدرت نے بڑے تیز حواس دیئے ہیں- وہ عام طور پر رات کو ہی ان تالابوں پر پانی پینے آتے ہیں- مگر وہ اپنا بچاؤ کرنا خوب جانتے ہیں- میرا استاد اور نامور شکاری مسٹر میکنزی کہا کرتا تھا کہ شیر جب رات کو تالاب پر پانی پینے جاتا ہے تو وہ دیر تک کافی پانی پیتا رہتا ہے- وہ ان جونکوں سے بچنے کے لئے اپنے جسم سے ایسی تیز بو خارج کرتا ہے کہ جونکیں اس جگہ سے بھاگ جاتی ہیں- جنگل میں رات سناٹے میں اگر کہیں ذرا سا پتا بھی کھڑا کے تو ان درندوں کو فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آواز کدھر سے آئی ہے اور کتنی دور سے آئی ہے اور جنگلی جانوروں اور درندوں کا کمپیوٹر حساب کتاب میں کبھی غلطی نہیں کھاتا- ان کے اندر قدرت نے ایسے ڈش انٹینا لگا رکھے ہیں کہ ان کے سگنل انہیں ٹھیک اپنے شکار تک پہنچا دیتے ہیں- ان ساری جنگلی مخلوق سے زیادہ خونخوار اور بے رحم ان جنگلوں میں رہنے والے بعض وحشی قبیلے ہیں جو آدھی رات کو اپنے دشمن قبیلے پر شب خون مارنے نکلتے ہیں- وہ جنگل کے اندھیرے میں اندھیرا بن جاتے ہیں- ایسی مہارت سے پاؤں اٹھاتے ہیں کہ خشک پتوں پر بھی ان کے چلنے کی آواز نہیں آتی- انکے جسموں پر خاص تیل ملا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے کوئی کیڑا مکوڑا، کوئی سانپ اور درندہ ان کے نزدیک نہیں آتا- ان کے پاس بانس کی بانسری نما پھونکنیاں ہوتی ہیں جن میں زہر میں بجھا ہوا تیر ڈال کر اندھیرے میں پھونک مار کر ٹھیک نشانے پر پھینکتے ہیں- ایک لمبا چھرا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے گرے ہوئے دشمن کا سر کاٹ کر لے جاتے ہیں- اس مہم کے

دوران اگر انہیں جنگل میں کسی طرف سے کسی اجنبی انسان کی بو آ جائے تو وہ اپنی خونی مہم کو تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر کے پہلے اس بدنصیب مسافر کا سر کاٹتے ہیں-

جنگل کے یہی وہ خطرات تھے جن کے پیش نظر میں نے دونوں سمگلر گوروں کو جھاڑیاں کاٹنے اور ٹارچیں روشن کرنے سے روک دیا تھا- ان کی آنکھوں پر تو لالچ کی پٹی بندھی تھی مگر میری آنکھیں کھلی تھیں- ان کی ذرا سی غفلت اور ناسمجھی میری جان بھی لے سکتی تھی- جب میں نے انہیں کافی ڈرایا تب وہ مانے تھے- وہیں سے میں نے اپنا رخ ذرا بائیں جانب ہٹ کر ان جھاڑیوں کی طرف کر لیا جہاں مجھے اندھیرے میں بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ درخت زیادہ گھنے نہیں ہیں- میرا اندازہ درست تھا یہ درخت فاصلے پر تھے- ان کے درمیان ایک تھوڑی سی کھلی جگہ پر ہم رات گزارنے کے لئے بیٹھ گئے- میں نے انہیں کیمپ لگانے اور زیادہ نقل و حرکت کرنے سے بھی منع کر دیا تھا- کیمپ کی میخوں کو ٹھونکنے کی آواز جنگل میں ہمارے دشمنوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی- ہم تینوں نے باری باری پہرہ دیا- رات خیریت سے گزر گئی- کوئی واقعہ پیش نہ آیا- صبح کو تھوڑا بہت ناشتہ کرنے کے بعد ہم پھر آگے چل پڑے-

مجھے اس بات پر بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ اگر مسٹر بریڈی اور اس کی بیوی کریش میں سے زندہ بچ گئے ہیں تو انہیں طیارے کے ڈھانچے کے کہیں قریب میں ہی ہونا چاہئے تھا وہ اتنی دور جنگل میں کیوں نکل گئے؟ یہ ایک معمہ تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا- دونوں سمگلر زمین سونگھتے آگے بڑھ رہے تھے- ان کا خیال تھا کہ شاید کسی جگہ جواہرات کا بکس انہیں پڑا ہوا مل جائے- مگر ان کا دوست بریڈی بھی آخر سمگلر تھا- وہ جواہرات کے بکس کو سمگل کر کے خدا جانے کہاں سے کہاں لے جانے والا تھا اور اس کے عوض اسے کتنے لاکھ پاؤنڈ ملنے والے تھے- وہ یونہی بکس کو نہیں پھینک سکتا تھا- ہاں اگر جہاز کی کریش لینڈنگ کے ساتھ وہ مر جاتا تو الگ بات تھی-

اس سارے ڈرامے میں مجھے صرف معصوم صورت لڑکی گارشیا سے ہی ہمدردی تھی- کیونکہ نا صرف وہ اپنے خاوند کی فرمانبرداری کے باعث اس خطرناک کھیل میں الجھ گئی تھی- بلکہ خاوند بریڈی نے اسے ڈھال کے طور پر استعمال کیا تھا کہ وہ ساتھ ہو گی تو کسی کو شک بھی نہیں پڑھے گا-

ہم درختوں کے ساتھ ساتھ اگی ہوئی جھاڑیوں کو کاٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے کسی جوہڑ کے پانی کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ جوہڑ کا مطلب یہ تھا کہ قریب ہی جنگلی لوگوں کی کوئی بستی بھی ضرور ہوگی۔ یہ پانی میں گلے سڑے پتوں اور گارے کی بو تھی جو دیودار اور مہاگنی کے اونچے اونچے درختوں کے عقب سے آرہی تھی۔ ہم بھی اسی طرف جا رہے تھے۔ ہم محتاط ہو کر چلنے لگے۔ میں نے انہیں ساری بات سمجھا دی کہ شاید آگے جنگلی لوگوں کی کوئی بستی ہے۔ جنگل کا گھنا پن آہستہ آہستہ تھوڑا کم ہوا تو سامنے ایک چھوٹا سا جوہڑ دکھائی دیا جس پر درختوں کی موٹی موٹی شاخوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ یہاں درختوں میں سے دن کی ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی۔ اس روشنی میں مجھے ایک آدمی کی لاش نظر آئی جس کی ٹانگیں کمر تک پانی سے باہر تھیں اور باقی کا دھڑ جوہڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں نے دور سے دونوں سمگلروں کو لاش دکھائی تو پہلے وہ بھی خوف زدہ ہو گئے۔ ان میں سے مسٹر بیکر نے لاش کو اس کی پتلون سے پہچان لیا اور بولا۔۔۔۔

"یہ بریڈی کی لاش ہے"

ہم دوڑ کر جوہڑ کے پاس گئے۔ جہاں لاش کا اوپر والا دھڑ جوہڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں پانی خون سے سرخ ہو گیا تھا۔

یہ مسٹر بریڈی کی ہی لاش تھی۔ ہم نے لاش کو پانی سے باہر کھینچا تو دہشت کے مارے گارشیا کے نقلی ماموں کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ لاش کا سر غائب تھا۔ میں انہیں واپس درختوں جھاڑیوں کی طرف لے جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے وہیں لاش کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید بریڈی نے قیمتی ہیرے جواہرات کو بکس میں سے نکال کر اپنی جیبوں میں چھپا لیا ہو گا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی جیبیں خالی تھیں۔ بریڈی کی لاش پر کندھے سے ذرا اوپر ایک چھوٹا تیر ابھی تک کھبا ہوا تھا۔ یہ زہر میں بجھا ہوا تیر تھا۔ دونوں سمگلر لاش کے اردگرد جواہرات کے بکس کی تلاش میں لگ گئے۔ میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ فضا میں لمبے لمبے سانس لے کر خطرے کو سونگھنے کی کوشش کی۔ یہ افریقہ کے جنگلی لوگوں کا کارنامہ تھا۔ بریڈی اپنی بیوی کے ساتھ جب جوہڑ کے پاس پہنچا تو ایک طرف سے زہر میں بجھا ہوا تیر آ کر اسے لگا۔ وہ بے حس ہو کر گرا۔ تب جنگلی لوگ وہاں آ گئے۔

انہوں نے بریڈی کا سر کاٹا اور کٹے ہوئے سر کے ساتھ اس کی بیوی گارشیا کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ میں نے جوہڑ کے کنارے گیلی زمین پر پاؤں کے کتنے ہی نشان دیکھے جو بائیں طرف والے درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

میں تیزی سے دونوں سمگلروں کے پاس آگیا- میں جانتا تھا کہ وہ ادھرادھر جھاڑیوں میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں- مگر میں نے اس بارے میں ان سے کوئی سوال نہ کیا- صرف اتنا کہا کہ یہاں خطرہ ہے ہمیں بریڈی کی لاش کو یہیں گڑھے میں دفن کر کے یہاں سے نکل جانا چاہئے- میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ بریڈی کو جنگلی لوگوں نے قتل کیا ہے اور اس کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ گارشیا کو بھی اٹھا کر لے گئے ہیں- مگر صاف لگ رہا تھا کہ انہیں بریڈی کے قتل اور اس کی بیوی کے اغواء سے زیادہ اس بات کی فکر ہے کہ جواہرات کا بکس کہاں ہو گا- وہ بکس وغیرہ کا نام میرے سامنے بالکل نہیں لے رہے تھے- ظاہری طور پر انہوں نے اس سانحے پر افسوس کا اظہار کیا- ہارڈی کہنے لگا-

"مجھے ہر حالت میں اپنی بھانجی کو ان وحشیوں سے چھڑانا ہو گا"

درپردہ وہ اس خزانے کے بکس کو حاصل کرنے کی فکر میں تھا جس کے متعلق ان دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ گارشیا اسے اپنے ساتھ لے گئی ہے یا جنگلی لوگوں نے اس قیمتی بکس کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے- میں ان دونوں کے دل کا حال جانتا تھا- جنگلی لوگ لاش کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے- اس نے مجھے بھی خوف زدہ کر دیا تھا- کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ہم جنگل کے اس ہلاکت خیز اور خطرناک ترین حصے میں آگئے ہیں جہاں سر کاٹ کر اسے چھوٹا کرنے والے وحشی قبیلے آباد ہیں-

میں آپ کو سچ بتاتا ہوں کہ اگر مجھے معصوم صورت اور سمگلروں کے چکر میں بے گناہ پھنسی ہوئی لڑکی گارشیا کا خیال نہ ہوتا تو میں ان دونوں جرائم پیشہ سمگلروں کو وہیں چھوڑ کر واپس بھاگ جاتا- لیکن گارشیا کی معصومیت اور اس کی بے بسی کا سوچ کر میں نے واپس بھاگنے کا خیال دل سے نکال دیا اور اس کے الٹ یہ فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں گارشیا کو اس جہنم سے نکال کر رہوں گا- جنگلی وحشیوں نے گارشیا کو ہلاک نہیں کیا تھا- افریقی جنگلوں کے وحشی لوگ ایسی گورے رنگ کی یورپی عورتوں کو اپنی بیوی بنا لیتے ہیں- عام طور پر قبیلے کا سردار ایسی عورت کو اپنے حرم میں شامل کر لیتا ہے- گارشیا عذاب میں ضرور مبتلا ہو چکی تھی مگر وہ زندہ تھی اور اسے اس عذاب سے نکالا جا سکتا تھا- میں نے اپنے اس ارادے کو دونوں سمگلروں سے خفیہ رکھا

اور ان پر یہی ظاہر کیا کہ میں ان کی نیتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا-

اب میں نے اپنی ان تمام صلاحیتوں کو بیدار کر لیا جو مجھے مسٹر میکنزی کے ساتھ ان جنگلوں کی دربدری کے تجربوں نے عطا کی تھیں- ان دونوں نے بڑی بے دلی سے جوہڑ کے پاس گیلی زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر بریڈی کی لاش کو اس میں دبا دیا- بریڈی کی لاش اس میں پوری بھی نہیں آتی تھی مگر انہوں نے دبا کر اوپر گیلی مٹی ڈال دی- مجھے گارشیا کے خاوند بریڈی اور اس کی لاش سے بھی کوئی زیادہ ہمدردی نہیں تھی کیونکہ وہ خود جرائم پیشہ سمگلر تھا اور اسی کی وجہ سے گارشیا ایسی معصوم شکل صورت والی لڑکی جنگلی وحشیوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی مگر لاش کی یہ بے حرمتی مجھ سے نہ دیکھی گئی- میں چلتا ہوا ان درختوں کے پاس آگیا جدھر جنگلی لوگوں کے پاؤں کے نشان جاتے تھے- آگے اونچی اونچی گھاس آگئی- یہاں پاؤں کے نشان غائب ہو گئے- میرے پیچھے پیچھے بیکر اور ہارڈی دونوں سمگلر بھی آ گئے- ہارڈی نے پاؤں کے نشان دیکھ لئے تھے- کہنے لگا----

"جنگلی لوگ اسی طرف گئے ہیں---- ہمیں گارشیا کو بچانا ہے- ہمیں ان جنگلیوں کی بستی تک لے چلو"

وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے لاہور شہر میں کوئی آدمی ٹیکسی ڈرائیور سے کہے کہ مجھے سمن آباد تک لے چلو- میں نے اس کو ایک سوال کیا-

"مسٹر ہارڈی! کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جنگلی وحشی مسٹر بریڈی کا سر کس لئے کاٹ کر لے گئے ہیں"

وہ کندھے ہلا کر بولا---- "انہیں سر کاٹ کر ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے- یہیں کہیں جنگل میں پھینک گئے ہوں گے"

بیکر نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا-

"ہو سکتا ہے بریڈی کا سر تالاب میں ہی پڑا ہو"

میں نے کہا---- "نہیں---- وہ لوگ تمہارے ساتھی کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں اور ساتھ اس لئے لے گئے ہیں کہ گورے لوگوں کا سر انہیں بہت پسند ہے- اب وہ اس سر کو اپنے خاص کیمیاوی طریقے سے نارنگی جتنا چھوٹا کر کے

اپنے سردار کو پیش کریں گے جو اسے اپنے گلے میں لٹکا لے گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے سر بھی کاٹ کر نارنگی جتنے چھوٹے کر دیئے جائیں اور انہیں جنگلی لوگ اپنے گلے میں لٹکاتے پھریں تو میں تمہیں ابھی ان لوگوں کی بستی میں لئے چلتا ہوں" میری اس تفصیل نے ان پر کافی اثر کیا۔ مگر گارشیا کے ساتھ جنگلی وحشی جو قیمتی جواہرات کا بکس بھی لے گئے تھے اس کے لالچ نے ان دونوں کو اپنے انجام سے بے خبر کر رکھا تھا۔

بیکر کہنے لگا۔۔۔

"مگر ہمیں گارشیا کا بھی تو سراغ لگانا ہو گا ہم اسے یہاں جنگلی لوگوں کے پاس چھوڑ کر واپس کیسے جا سکتے ہیں"

میں کہنے لگا تھا کہ تمہیں گارشیا کی نہیں بلکہ دولت کی فکر لگی ہے اور تم گارشیا کے لئے نہیں بلکہ جواہرات کے سیاہ بکس کے لئے بے چین نظر آتے ہو۔ مگر میں ضبط کر گیا۔ میں نے کہا۔

"میں بھی اس بے قصور لڑکی کو جنگلی درندوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ مگر اس کے لئے جس طرح میں کہوں اس طرح تمہیں کرنا ہو گا۔ نہیں تو ہو سکتا ہے کل ہم تینوں کی لاشیں بھی اس جنگل میں پڑی ہوں اور ہمارے سر جنگلی لوگ اپنے جھونپڑوں کے آگے آگ جلا کر چھوٹا کر رہے ہوں۔

دونوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ وہ آئندہ وہی کریں گے جو میں کہوں گا۔۔۔ میں نے کہا۔

"تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی اپنی بندوق یا رائفل سے فائر نہیں کرے گا"

"اور اگر شیر یا ہاتھی سامنے آ گیا تو" بیکر نے کسی قدر غصیلی آواز میں پوچھا۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔

"مسٹر بیکر! یہ آسٹریلیا کے کسی شہر کا کوئی نیشنل پارک نہیں ہے۔ تم لوگ اس وقت دنیا کے سب سے پرانے اور سب سے خطرناک جنگل میں ہو اور میں اس جنگل کی ساری حرکتوں سے واقف ہوں۔ میری عمر میرے تجربے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

مگر یقین کرو میں تمہیں جنگل کے جس راستے سے لے جاؤں گا اس طرف کم از کم دن کے وقت کوئی شیر ہاتھی تمہارے سامنے نہیں آئے گا اور اگر آنے والا ہوا تو میں تمہیں اس کے آنے سے بہت پہلے بتا دوں گا"

بیکر نے کندھے جھٹکا کر کہا۔۔۔۔

"اوکے اوکے۔۔۔۔ تم جو کہو گے وہی کروں گا اب ہمیں کسی طرح ان جنگلیوں کی بستی میں لے چلو جو گارشیا کو اغواء کر کے لے گئے ہیں"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور بیکر کا منہ تکنے لگا۔۔۔ ہارڈی بولا۔۔۔۔

"مسٹر اے ایچ! ہمارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ ہم دو منٹ کی فائرنگ سے جنگلیوں کی ساری بستی کو تباہ برباد کر سکتے ہیں"

افریقہ کے ان جنگلوں میں یورپ کے اکثر گورے شکاری اس غرور میں آ کر مارے جاتے ہیں اور ان کی لاشیں جنگلی جانوروں کی خوراک بنتی ہیں۔ میرا استاد انگریز شکاری مسٹر میکنزی کہا کرتا تھا۔

"یاد رکھو۔۔۔۔ افریقہ کے ان جنگلوں میں جس نے اپنی رائفل پر بھروسہ کیا وہ مارا گیا۔ یہاں اسلحہ نہیں، حواس کام آتے ہیں۔ یہاں عقل بھی جواب دے جاتی ہے۔ تم عقل سے حساب کا کوئی مشکل سے مشکل سوال حل کر سکتے ہو مگر افریقہ کا کوئی شیر نہیں مار سکتے۔ کیونکہ تمہارے پاس صرف عقل ہوتی ہے اور شیر کے پاس چھٹی بلکہ ساتویں حس بھی ہوتی ہے۔ شیر تو شکاری کے پاؤں کے نشان سے سمجھ جاتا ہے کہ یہ شکاری اناڑی ہے یا تجربہ کار۔۔۔۔

جنگلی درندوں کے علاوہ مجھے میکنزی نے افریقہ کے وحشی قبائل کے رسم ورواج اور ان کی عادات وخصائل کے بارے میں بھی بڑے کام کی باتیں بتا رکھی تھیں جو میری اس مہم یا کہانی میں آگے چل کر میرے بہت کام آئیں۔ چنانچہ جب سمگلر ہارڈی اور گارشیا کے نقلی ماموں نے اسلحہ کی بات کی تو میں نے اسے کہا۔۔۔

"مسٹر ہارڈی! اسلحہ یا تو وہیں پڑا رہ جاتا ہے یا سر کاٹنے والے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں"

ہم جنگل میں آگے چل پڑے۔ کافی آگے جانے کے بعد ہمیں پانی گرنے کی

آواز سنائی دی- ایک چھوٹے سے ٹیلے پر سے چشمے کا پانی نیچے گر کر ایک تالاب میں جمع ہو رہا تھا- بیکر اور ہارڈی تالاب میں اتر کر نہانے لگے- میں پوری طرح چوکس ہو کر بیٹھا تھا- میرے کان جنگل کی طرف لگے ہوئے تھے جہاں کبھی کبھی ایک پرندے کی آواز سنائی دے جاتی تھی- جنگلی قبیلے کے حبشی بھی منہ سے مختلف پرندوں کی آواز نکال کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں میں جنگلی لوگوں کی ان آوازوں کو پہچان لیتا تھا، یہ کسی پرندے کی آواز ہی تھی، اس کے باوجود یہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی- میں نے بیکر اور ہارڈی کو جلدی سے آگے نکل چلنے کو کہا--- وہ کپڑوں سمیت نہا رہے تھے آخر بڑی مشکل سے وہ تالاب سے باہر نکلے اور ہم ایک بار پھر گنجان درختوں میں چلنے لگے- ایک جگہ پہنچ کر میں رک گیا- مجھے فضا میں اس خاص تیل کی بو محسوس ہوئی تھی جسے جنگلی قبیلے کے لوگ جڑی بوٹیوں میں سے نکال کر اپنے چہرے اور بازوؤں پر ملا کرتے تھے- یہ بو صرف وہی آدمی محسوس کر سکتا ہے جو اس قسم کے جنگلوں میں کافی وقت گزار چکا ہو- اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگلی وحشی ہمارے پیچھے آ رہے تھے- جب میں نے بیکر اور ہارڈی کو بتایا کہ وحشی قبائل کے لوگ ہماری تلاش میں چلے آ رہے ہیں تو انہوں نے اسے میرا وہم قرار دیا اور جھاڑیوں کے پاس بیٹھ کر تولیے سے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگے- میں نے تو خطرے کی بو سونگھ لی تھی- جنگلی حبشیوں کے جسموں پر ملے ہوئے رنگدار تیل کی بو میرے حساب سے ابھی کافی دور تھی مگر ان کا کوئی بھروسہ نہیں تھا- یہ لوگ جنگل میں بڑی تیزی سے چلتے ہیں- انہیں سب راستوں کا پتہ ہوتا ہے- میں اپنے ساتھ ان دو سمگلروں کی جان بھی بچانا چاہتا تھا- میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا انجام بریڈی جیسا ہو- مگر وہ مجھے بچہ سمجھ رہے تھے اور فضا میں دو چار لمبے سانس لے کر کہنے لگے---

"ہمیں تو کوئی بو نہیں آ رہی- تم ضرورت سے زیادہ سمارٹ بننے کی کوشش کر رہے ہو" وہ تھک گئے تھے اور وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لے رہے تھے- میں نے سوچا کہ تھوڑا پیچھے جا کر سراغ رسانی کرنی چاہئے کہ جنگلی لوگ کدھر سے آ رہے ہیں اور کتنی دور ہوں گے---- میں نے بیکر سے کہا--- "تم لوگ اس چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاؤ میں اپنا شک دور کر کے ابھی آتا ہوں" میں نے انہیں خاص طور پر

تاکید کی کہ وہ سگریٹ بالکل نہ پئیں- کیونکہ تمباکو کی خوشبو جنگلی لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر سکتی ہے- ہارڈی نے کچھ فکرمند ہو کر کہا-

"تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے"

بیکر بھی میرے جانے پر راضی نہ تھا- ان کا خیال تھا کہ شاید میں انہیں اس جنگل میں اکیلا چھوڑ کر فرار ہو رہا ہوں- میں نے اپنی رائفل ان کے سامنے پھینک دی اور کہا-

"میں اپنی اور تم لوگوں کی جان بچانے اور یہ پتہ کرنے جا رہا ہوں کہ خطرہ ہم سے کتنی دور اور کس طرف ہے" صرف ایک پستول میرے پاس ہے میں غصے میں وہاں سے چل دیا- اس وقت میری چھٹی حس میری راہنمائی کر رہی تھی- جس طرف سے تیل کی بو آ رہی تھی میں اسی طرف چل رہا تھا- میں جھاڑیوں اور درختوں میں جھک کر بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا- اچانک آسمان پر چھائے ہوئے بادل بڑی زور سے گرجے اور بارش شروع ہو گئی- بارش کی وجہ سے تیل کی بو فضا میں مدھم ہوتے ہوئے غائب ہو گئی- میں ایک چٹان کے پاس رک گیا اور بو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا- مگر بو ایک دم غائب ہو گئی تھی- بارش بڑی تیز ہونے لگی- میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا- تیز بارش کی وجہ سے چلنے میں رکاوٹ پیش آ رہی تھی- مگر میں درختوں اور چٹانوں کی نشانیاں دیکھتا واپس چلا گیا- جب میں اس جگہ پہنچا جہاں میں بیکر اور ہارڈی کو چھوڑ گیا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں ہے- میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا- میں جلدی سے ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا- میں ان دونوں میں سے کسی کو آواز دینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا- ذرا بارش ہلکی ہوئی تو میں اٹھ کر پہلے اس جگہ گیا جہاں میرے جانے سے پہلے بیکر اور ہارڈی بیٹھے ہوئے تھے- وہاں کوئی نہیں تھا- پھر میں چٹان کی طرف گیا جہاں میں نے انہیں چھپ کر بیٹھنے کی ہدایت کی تھی- یہاں ایک طرف مجھے ان کا کچھ سامان بکھرا ہوا نظر آیا- میں نے جھک کر دیکھا- چٹان کے قریب ہی آدھا بجھا ہوا سگریٹ پڑا تھا جو بارش میں بھیگ کر نسواری ہو گیا تھا- جو المناک واقعہ وہاں ہو چکا تھا وہ میری سمجھ میں آ گیا تھا- میں دوڑ کر ایک درخت کے

اوپر چڑھ گیا اور اپنے آپ کو شاخوں میں چھپا کر بیٹھ گیا۔ دونوں میں سے کسی ایک نے سگریٹ سلگایا تھا۔ تمباکو کی بو جنگلیوں کو بڑی آسانی سے ان کے پاس لے آئی اور پھر جو ہونا تھا ہو گیا۔

میں دیر تک درخت کی ٹہنیوں میں چھپ کر بیٹھا رہا۔ میں بڑی آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ میری آنکھیں درخت کے نیچے اس چھوٹے سے راستے پر لگی تھیں جو چٹان کی طرف جاتا تھا۔ بارش تھم چکی تھی اب صرف درختوں میں رکا ہوا بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ فضا صاف تھی۔ اس میں جنگلیوں کے رنگدار تیل کی بو کسی طرف سے بھی نہیں آ رہی تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ خطرہ مجھ سے دور ہو چکا ہے تو میں درخت سے نیچے اتر کر چٹان کے پاس آ کر جائزہ لینے لگا۔ بیکر اور ہارڈی کی رائفلیں اور پستول بھی وہاں پر نہیں تھے۔ ٹین کے مگ ایک ٹارچ اور نائیلون کا بندھا ہوا خیمہ بھیگی ہوئی جھاڑیوں میں بکھرا پڑا تھا۔۔۔۔ میں ایک خاص چیز کی تلاش میں تھا۔ آخر وہ شے مجھے مل گئی۔ یہ زہر میں بجھا ہوا ایک بالشت سائز کا بانس کا تیر تھا جو چٹان سے ٹکرا کر نیچے گرا ہوا تھا۔ یہ تیر بیکر یا ہارڈی کو نہیں لگا ہو گا اس کے بعد کے تیروں نے ان دونوں کو ہلاک کر دیا ہو گا۔ مجھے اس بات پر حیرانی تھی کہ ان کی سر کٹی لاشیں وہاں پر کہیں بھی نہیں تھیں۔ خون کا کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ اگر جنگلی وحشیوں نے انہیں زہریلے تیروں سے ہلاک کیا ہے تو پھر ان کی لاشیں کس لئے ساتھ لے گئے تھے؟ انہیں تو لاشوں کے سر کاٹ کر لے جانے چاہیں تھے۔ میرا ذہن اس معمے کو حل نہ کر سکا۔ اب مجھے اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ ان دونوں کے انجام سے میں بھی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے معصوم شکل لڑکی گارشیا کا خیال بھی دل سے نکال دیا اور وہیں سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

ایک بھولی بھالی بے قصور لڑکی کو جنگلی وحشیوں کے قبضے میں اکیلی چھوڑ جانے پر میرا ضمیر مجھے کہہ رہا تھا کہ تم بڑے خودغرض ہو۔ تمہیں گارشیا کو جنگلی لوگوں کے عذاب سے ضرور نکالنا چاہئے۔ یہ تمہارا انسانی فرض ہے ۔۔۔۔ مگر آپ نہیں جانتے۔ جب آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ جنگل اس کا دشمن ہو گیا ہے اور سر کاٹ کر لے جانے والے وحشی درندے اس کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں تو پھر بڑے بڑوں کا

حوصلہ جواب دے جاتا ہے اور میں کوئی اتنا زیادہ تجربے کار شکاری بھی نہیں تھا۔ صرف ایک پستول ہی میرے پاس تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ کبھی کبھی جنگل میں فائر کرنے سے انسان پہلے سے زیادہ موت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ میں نے ضمیر کی ملامت کی کوئی پروا نہ کی اور واپسی کا سفر جاری رکھا۔ میرے پاس بڑا چاقو بھی نہیں تھا۔ جنگل گنجان تھا۔ جھاڑیوں اور جنگلی بیلوں میں بڑی مشکل سے راستہ بنانا پڑ رہا تھا۔ میں اپنی طرف سے بڑا حساب لگا کر اور نشانیاں یاد کر کے واپس جا رہا تھا مگر بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ میں جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ میرے سامنے اور ہی قسم کے درخت اور چٹانیں تھیں۔ یہ وہ درخت اور چٹانیں نہیں تھیں جن کے درمیان سے میں بیکر اور ہارڈی کے ساتھ وہاں تک پہنچا تھا۔ ان چٹانوں کے رنگ گہرے سبز تھے۔ ان میں کائی جمی ہوئی تھی۔ درخت ایسے تھے کہ ان کی ٹہنیاں نیچے جھک کر زمین پر اگی ہوئی لمبی گھاس کو چھو رہی تھیں۔ میں ایک جگہ رک کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کس سمت کا رخ کرنا چاہئے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ویسے بھی وہ کہیں کہیں تھوڑا سا نظر آ جاتا تھا۔ شمال جنوب کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ افریقہ کے جنگلوں میں راستہ بھول جانا موت کی طرف اٹھا ہوا پہلا قدم ہوتا ہے۔

بارش تھم چکی تھی۔ بادل بھی نہیں گرج رہے تھے۔ میں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دن کے سوا دس بج رہے تھے۔ سارے جنگل پر ایک ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت ایسی گہری خاموشی میں کبھی کبھی کسی درخت کی ٹہنی پر سے بارش کے پانی کے ٹپکنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میرے پاس کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔ یہ سارا کچھ جنگل کے وحشی لوگ ساتھ ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں نے درخت پر بیٹھے بیٹھے سمت کا اندازہ لگانا چاہا کہ مجھے کس طرف چلنا چاہئے لیکن میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ابھی تک میرا کسی جنگلی درندے مثلاً شیر ہاتھی یا ریچھ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ہاتھی کو چھوڑ کر باقی درندے عام طور پر رات کو نکلتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے جنگل میں کسی کھلی اور محفوظ جگہ پر پہنچ جاؤں کھلی جگہ پر پہنچنے کے بعد مجھے کم از کم شمال جنوب کا پتہ چل سکتا تھا۔ میں درخت سے اتر کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ مجھے اپنے پیچھے ایسی آواز سنائی دی جیسے

کوئی دوڑا چلا آرہا ہے۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی جنگلی ہے جو مجھے پکڑنے کے لئے آرہا ہے۔ میں نے بھی دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں چٹانیں اور جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان راستہ بنا ہوا تھا۔ میں بھاگتا چلا گیا۔ ایک جگہ تھک کر رک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بھاگتے قدموں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پیچھے جو بلا لگی تھی اس سے جان چھوٹی۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ وہی آواز پھر آنے لگی۔ اس دفعہ دو تین آدمیوں کے بھاگنے کی آواز آئی۔ میں گھبرا کر دوڑ پڑا۔ دل میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کے جنگلی ہیں کہ میرے پیچھے دوڑتے آرہے ہیں حالانکہ یہ لوگ دشمن کا خاموشی سے تعاقب کرتے ہیں اور موقع پاتے ہی زہریلا تیر چلا کر دشمن کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

دوڑتے دوڑتے میں نے جنگل کا ایک علاقہ پار کر لیا۔ آگے چھوٹی سی ندی آ گئی۔ میں نے ندی میں چھلانگ لگا دی پانی کمر تک تھا۔ دوسرے کنارے پر آتے ہی میں پھر دوڑنے لگا۔ مجھے بانس کے بہت ہی گنجان درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک کھنڈر سا نظر پڑا۔ اس کا ایک برج ٹوٹ کر نیچے گرا ہوا تھا۔ میں دوڑتا ہوا کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک چھتی ہوئی ڈیوڑھی تھی۔ ایک زینہ اوپر جاتا تھا۔ میں زینے پر چڑھ کر ڈیوڑھی کی شہ نشین میں آگیا۔ یہاں سے مجھے نیچے کھنڈر کا دروازہ صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے پستول نکال لیا۔ دراصل میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا تھا اور کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھا کہ جہاں میں آڑ میں چھپ کر اپنا بچاؤ کر سکوں۔ مجھے جنگل کی طرف وحشی حبشیوں کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ لوگ اپنے دشمن پر حملہ کرتے وقت اس قسم کی آوازیں نکالا کرتے ہیں۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پستول پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ میں بڑی اچھی پوزیشن میں بیٹھا تھا اور اوپر سے فائر کر کے دشمنوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک حبشی لڑکا جس کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہو گی سخت گھبرایا ہوا ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا میں اس پر فائر کرتے کرتے رک گیا۔ لڑکے کو ڈیوڑھی کا زینہ شاید گھبراہٹ میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ پھر دو تین جنگلی وحشی نیزے لہراتے چیخیں مارتے ڈیوڑھی میں

داخل ہو گئے۔ ایک نے لڑکے کو دبوچ لیا۔ جیسے کسی غیبی آواز نے مجھے کہا کہ اس لڑکے کی جان بچالو۔ میں نے ٹریگر دبا دیا۔ فائر کا دھماکہ ہوا اور جس حبشی نے لڑکے کو دبوچا ہوا تھا چیخ مار کر ایک طرف گرا۔ میں نے فوراً دوسرے وحشی پر بھی فائر کر دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی اور وہ پیچھے گر پڑا۔ ڈیوڑھی کے باہر جو دو جنگلی اندر آنے ہی والے تھے فائر کے دھماکوں میں اپنے ساتھیوں کو چیخ مار کر گرتے دیکھ کر بھاگ گئے۔ حبشی لڑکا حیران ہو کر اوپر ڈیوڑھی کی بارہ دری کی طرف دیکھنے لگا جہاں میں پستول ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ لڑکے کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ بڑا حیران تھا کہ میں اس کھنڈر کی بارہ دری میں اس کی جان بچانے کہاں سے آ گیا ہوں؟ وہ اپنا ہاتھ سینے پر لے گیا جیسے میرا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ یہ جنگلی لوگ کسی کے احسان کا اسی طرح شکریہ ادا کرتے ہیں۔ میں نے اردو میں پوچھا "تم کون ہو؟ یہ لوگ کون تھے" لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ڈیوڑھی کے دروازے تک گیا گردن نکال کر باہر جنگل میں دائیں بائیں دیکھا اور واپس ڈیوڑھی میں آکر میری طرف دیکھنے لگا۔ ڈیوڑھی کے دروازے میں سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس حبشی لڑکے کے ماتھے اور سینے پر نیلے اور سرخ رنگ کی لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا کمر کے ساتھ بندھا تھا۔ ماتھے پر کالے رنگ کی پٹی تھی۔ بال شانوں تک آئے ہوئے تھے۔ اس نے اشارے سے مجھے نیچے بلایا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس لڑکے کا تعلق کسی دوسرے قبیلے سے ہے اور اس کے دشمن قبیلے کے لوگوں نے جنگل میں اسے اکیلا پا کر ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ افریقہ کے جنگلوں میں وحشی قبیلوں کی آپس میں دشمنی قدیم زمانے سے چلی آتی ہے۔ یہ لوگ آپس میں جنگیں کرتے رہتے ہیں۔ راتوں کو ایک دوسرے کی بستیوں پر شب خون بھی مارتے ہیں۔ جھونپڑیوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ مردوں کے سر کاٹ کر لے آتے ہیں اور انہیں اپنی جھونپڑیوں کے [illegible] دیتے ہیں۔ جس کے پاس دشمن کے جتنے سر ہوتے ہیں اسے قبیلے میں اتنا ہی معزز سمجھا جاتا ہے۔

میں بارہ دری یا شہ نشیں سے اتر کر نیچے لڑکے کے پاس آگیا۔ پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور میں اس لڑکے سے بھی محتاط تھا۔ حبشی لڑکے نے پستول پر انگلی

پھیری اور مسکرا کر مجھے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا- پھر اس نے باہر کی طرف اشارہ
کر کے ہاتھوں کو اس طرح حرکت دی جیسے نیزہ مار رہا ہو- اس کا مطلب تھا کہ اس کے
دشمن باہر نیزے لئے جنگل میں کسی جگہ چھپے ہوئے ہوں گے- پھر اس نے دوسری
طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ میرا قبیلہ ادھر طرف ہے اور میں ادھر جانا
چاہتا ہوں- دشمن قبیلے کے دونوں جنگلیوں کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں- انہوں نے
اپنے جسم پر سیندھوری رنگ کی لکیریں ڈال رکھی تھیں- یہ اس لڑکے کے دشمن قبیلے
کا رنگ ہو گا- میں کشمکش میں پڑ گیا کہ کیا کروں- حبشی لڑکے نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لے کر آنکھوں سے لگایا اور اپنی زبان میں کچھ کہا- پھر اسی جانب اشارہ کیا جدھر اس
کے قبیلے کی بستی ہو گی- میرے ذہن میں اچانک خیال آ گیا کہ میں نے اس لڑکے کی
جان بچائی ہے اگر میں اسے اپنی حفاظت میں اس کے قبیلے تک لے جاؤں تو اس کے
والی وارث یا لواحقین کی ہمدردیاں مجھے حاصل ہو جائیں گی اور ان لوگوں کی مدد سے
میں مشرقی سمندر کی کسی محفوظ بندرگاہ تک پہنچ سکوں گا- میں نے اشاروں میں اسے
بتایا کہ میرا پستول ہے اور میں اسے اپنی حفاظت میں اس کے قبیلے تک پہنچا دوں گا- وہ
سمجھ گیا- میں نے یہ دیکھا ہے کہ جنگلی قبائل کے لوگ اشاروں کی زبان بڑی جلدی
سمجھ لیتے ہیں- شاید اس لئے کہ اشاروں کی زبان انسان کی پہلی زبان ہے اور چونکہ
جنگلی لوگ ابھی تک غیر مہذب ماحول میں رہتے ہیں اس لئے وہ یہ زبان فوراً سمجھ
جاتے ہیں-

ہم دونوں کھنڈر سے باہر نکل آئے- باہر نکلنے سے پہلے حبشی لڑکے نے یہ
اطمینان کر لیا تھا کہ دشمن قبیلے کے لوگ وہاں نہیں ہیں- وہ دشمن قبیلے کے دونوں مردہ
جنگلیوں کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر کوئی چاقو یا چھرا نہ ہونے کی وجہ
سے وہ ایسا نہ کر سکا- اب یہ حبشی نوجوان مجھے اپنی رہنمائی میں لے کر جنگل میں آگے
آگے چل رہا تھا- وہ کسی ایسے جنگلی جانور کی طرح جھک کر چل رہا تھا جس نے دشمن کی
بو پالی ہو یا جو دشمن کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو- وہ تیزی سے جھاڑیوں کو پھلانگتا
اور پھر میری طرف دیکھ کر مجھے بھی اسی طرح چلنے کا اشارہ کرتا- ہم ایک ڈھلان نیچے
اترنے لگے- نیچے ایک چھوٹی سی وادی نظر آئی- ندی کے کنارے کتنی ہی جھونپڑیاں

ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں- حبشی نوجوان نے خوش ہو کر میری طرف دیکھا اور کچھ کہا
اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے بتایا کہ یہ میری بستی ہے- جھونپڑیوں کے پاس
آتے ہی اس نے ایک نعرہ لگایا- نعرے کی آواز سن کر جھونپڑیوں میں سے کتنے ہی
جنگلی لوگ باہر نکل آئے- انہوں نے حبشی لڑکے کو دیکھا تو خوش ہو کر اچھلنے اور نیزے
لہرانے اور شور مچانے لگے- پھر ایک شاندار گول چھت والی جھونپڑی سے ایک اونچا
لمبا بھاری بھرکم حبشی باہر نکلا جس نے سر پر سیمرغ کے پروں کا تاج پہن رکھا تھا- گلے
میں رنگ برنگ منکوں اور زمرد کی مالائیں تھیں- ہاتھ میں ایک عصا تھا جس کی موٹھ
پر انسانی کھوپڑی لگی ہوئی تھی- یہ قبیلے کا سردار تھا اور جس حبشی نوجوان کی میں نے
دشمن قبیلے کے لوگوں سے جان بچائی تھی وہ اسی سردار کا بیٹا تھا- حبشی سردار نے لڑکے
کو اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا اور پھر میری طرف لال لال آنکھوں سے گھور کر دیکھا-
نوجوان نے میرے بارے میں اسے بتایا تو اس کے سیاہ کالے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی-
اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنے بیٹے کے ساتھ مجھے بھی جھونپڑی کے اندر لے
گیا جھونپڑی کی دیواریں شیروں کی کھالوں اور برچھے نیزوں سے سجی ہوئی تھیں-
سردار نے ایک جنگلی کو اشارہ کیا وہ ایک اور جنگلی کو اپنے ساتھ جھونپڑی میں لے
آیا- یہ نیا جنگلی دبلا پتلا آدمی تھا جس کی پیاری آنکھوں میں بڑی چمک تھی- سر کے
چھوٹے چھوٹے بال سفید ہو رہے تھے- سردار نے اسے کچھ کہا تو وہ بوڑھا جنگلی میری
طرف دیکھ کر ٹوٹی پھوٹی انگریزوں والی اردو زبان میں کہنے لگا "تم نے سردار کے بیٹے
کی جان بچائی ہے سردار تمہارا شکریہ ادا کرتا ہے"

بوڑھے جنگلی حبشی نے یہ فقرہ بڑا توڑ پھوڑ کر ادا کیا تھا- میں اسے صاف کر
کے سنا رہا ہوں- میں نے اس جنگلی حبشی کے ذریعے سردار سے درخواست کی کہ وہ
مجھے کسی قریبی بندرگاہ تک پہنچا دے- سردار نے جب یہ سنا تو ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور
پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہا جنگلی حبشی نے ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ سردار
نے تمہاری درخواست قبول نہیں کی-

میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی- یہ سردار میرے ساتھ کیا سلوک کرنا
چاہتا ہے؟

میں نے بوڑھے حبشی سے کہا کہ وہ سردار سے پوچھے کہ اس کے انکار کا مقصد کیا ہے۔ بوڑھا حبشی اپنی زبان میں سردار سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم نے سردار کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ وہ تمہیں ایک مہینہ اپنے پاس رکھ کر تمہاری خاطرداری کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تمہاری شادی قبیلے کی سب سے خوبصورت لڑکی سے کر دی جائے"۔ میں نے بوڑھے حبشی سے کہا۔ خدا کے لئے سردار سے کہو کہ میں شادی نہیں کر سکتا۔ ہاں دس پندرہ دن اس کے پاس رہ لوں گا۔ یہ میری مجبوری تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ جنگلی لوگ اپنے رسم ورواج کے بڑے سخت پابند ہوتے ہیں۔ ایک مہینہ نہ سہی لیکن مجھے کچھ روز وہاں رہ کر قبیلے کی رسم کو پورا کرنا ہو گا۔ مجھے ایک چھوٹی سی بجی سجائی الگ جھونپڑی دے دی گئی۔ میں وہاں رہنے لگا۔ قبیلے کے لوگ میری خاطر مدارات کرنے لگے۔ مجھے گارشیا کی بھی فکر تھی۔ میں نے قبیلے کے سردار کو اپنی ساری داستان سنا دی اور کہا کہ وہ گارشیا کو تلاش کرنے میں مدد کرے۔ سردار نے فوراً اپنے ایک خاص جاسوس کو دشمن قبیلے کی طرف روانہ کر دیا۔ دو دن کے بعد جاسوس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ ایک سنہری بالوں والی گوری عورت دشمن قبیلے کے سردار کی قید میں ہے۔ میں نے سردار سے کہا "میں اس لڑکی کو نکال کر اس کے شہر پہنچانا چاہتا ہوں"۔

اس پر سردا نے ہنس کر بوڑھے حبشی کو کچھ کہا۔ جس نے مجھے ترجمہ کر کے بتایا کہ سردار کہتا ہے اتنی خوبصورت گوری عورت کے ساتھ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔

سردار چونکہ میرا ممنون احساس تھا اس لئے وہ مدد کرنے پر مجبور تھا۔ اس

نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ گارشیا کو دشمن کی قید سے آزاد کرانے کی کوشش کرے گا۔ سردار نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ دو دن بعد اس کا آدمی گارشیا کو دشمن قبیلے کی قید سے نکال کر لے آیا۔ گارشیا کا غم کے مارے برا حال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خاوند کا کٹا ہوا سر دیکھ چکی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ وہ اب جس طرح بھی ہو اپنے ملک آسٹریلیا واپس جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ تھوڑے دن صبر کرے۔ سردار ہمیں کسی بندرگاہ تک پہنچا دے گا جہاں سے میں اسے مڈغاسکر لے جاؤں گا اور رچرڈ اس کی واپسی کا سارا بندوبست کر دے گا۔

وہ خاموش ہو رہی۔ جب قبیلے میں رہتے ہوئے مجھے دس پندرہ دن گزر گئے تو ایک روز میں نے سردار سے کہا کہ اب میں گارشیا کو لے کر واپس جانا چاہتا ہوں تو اس نے کہا۔

ٹھیک ہے۔ پرسوں چلے جانا۔ میں تمہارے ساتھ دو آدمی کر دوں گا۔ وہ تمہیں بندرگاہ تک پہنچا دیں گے۔

میں نے گارشیا کو بتایا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

گارشیا میرے ساتھ والی جھونپڑی میں رہتی تھی۔ اسی رات کا ذکر ہے۔

میں جھونپڑی میں لیٹا جاگ رہا تھا کہ سردار کا بیٹا جس کی میں نے جان بچائی تھی گھبرایا ہوا اندر آیا۔ ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس نے مجھے بتایا کہ اس کے باپ کی نیت بدل گئی ہے۔ وہ گارشیا سے خود شادی کر کے مجھے مگرمچھوں کے آگے پھینک دینا چاہتا ہے۔ میں نے سردار کے بیٹے سے کہا۔ خدا کے لئے ہماری مدد کرو۔ وہ بولا۔ میں اسی لئے آیا ہوں۔ اس وقت قبیلے کے سب لوگ سو رہے ہیں۔ گارشیا کو لے کر یہاں سے نکل چلو۔ اگر دیر کر دی تو پھر میں بھی تمہاری مدد نہیں کر سکوں گا۔ تم نے میری جان بچائی تھی۔ میں تمہاری جان بچا کر احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔

میں فوراً حبشی لڑکے کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ رات بڑی تاریک تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی ہوئی جھونپڑیوں پر اندھیرا اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے گارشیا کو اس کے جھونپڑے میں جا کر جگایا۔ جب اسے ساری بات بتائی تو وہ فوراً میرے ساتھ باہر نکل آئی۔ حبشی لڑکے نے ہمیں خاموش رہنے اور اپنے پیچھے

پیچھے چلے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ ہمیں اندھیرے میں خونخوار وحشیوں کے جھونپڑوں کے پیچھے سے لے کر تالاب کے پاس نکل آیا۔ یہاں ہم جھاڑیوں میں جھک کر کافی دور تک چلتے گئے۔ جب وحشی قبیلے کی بستی کافی پیچھے رہ گئی تو حبشی لڑکے نے اندھیرے میں ایک چھوٹے سے ٹیلے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس ٹیلے کے پیچھے دو چٹانوں کے درمیان ایک تنگ راستہ ہے۔ آگے ایک جھیل آئے گی۔ جھیل کے کنارے کنارے مغرب کی طرف چلتے جانا۔ کہیں رکنا بالکل نہیں۔ صبح تمہیں اپنے سامنے ایک دریا نظر آئے گا۔ وہ دریا تمہیں سمندر میں پہنچا دے گا۔ میں تمہاری اتنی ہی مدد کر سکتا ہوں۔ اب جاؤ۔ مجھے واپس جانا ہے"۔

اتنا کہہ کر حبشی لڑکا ہمیں اونچے اونچے درختوں کے اندھیرے میں اکیلا چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ گارشیا نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ انگریزی میں کہنے لگی۔

"یہاں رکنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ نکل چلو"۔

ہم پہلے تو تیز تیز چلتے رہے۔ پھر اپنے آپ ہی دوڑنے لگے۔ جب دوڑتے دوڑتے سانس پھول گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر سانس ٹھیک کیا اور دوبارہ دوڑ شروع کر دی۔ آگے ٹیلہ آ گیا۔ ٹیلے کی چڑھائی بھی کافی تھی۔ مگر ہم دونوں نوجوان تھے۔ بڑی جلدی ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری طرف ڈھلان پر اترنے لگے۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد چاند بھی نکل آیا جس سے جنگل کا اندھیرا کافی حد تک دور ہو گیا۔

حبشی لڑکے کے کہنے کے مطابق ہم نے سامنے دو بہت بڑی بڑی چٹانیں دیکھیں جن کے درمیان ایک تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ راستہ جنگلی گھاس اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ مگر ہم راستہ بناتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ مشرقی عورتیں ایسے حالات میں عام طور پر حوصلہ ہار بیٹھتی ہیں مگر یورپ اور آسٹریلیا کی عورتیں آخر وقت تک حالات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ وہ مصیبتوں اور دکھوں کو زندگی کے کھیل کا ایک حصہ سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں۔ چنانچہ گارشیا بھی اپنے خاوند کی موت کے غم کو بھول کر اس بھیانک صورت حال کا بڑی جی داری سے مقابلہ کر رہی تھی۔

چٹانوں سے باہر نکلے تو جھیل نظر آئی۔ ہم اس کے کنارے کنارے مغرب کی طرف چل پڑے۔ ہلکی ہلکی زرد چاندنی ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔ ہم ساری رات چلتے رہے۔ صبح کا نور پھیلا تو سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ دریا زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دریا کی دونوں جانب گھنا جنگل تھا۔ ہمیں اس دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے اس مقام تک پہنچنا تھا جہاں یہ دریا سمندر میں جا کر گرتا تھا۔

حبشی لڑکے نے ہمیں کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ جہاں دریا سمندر میں گرتا ہے وہاں وہ اتنا پھیل جاتا ہے اور اس کا بہاؤ اس قدر تیز ہو جاتا ہے کہ آدمی چھوٹی موٹی کشتی میں اسے پار نہیں کر سکتا۔ بلکہ کشتی لہروں کے بہاؤ کے ساتھ کھلے سمندر میں چلی جاتی ہے۔ اس کا گارشیا کو بھی علم تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔۔۔۔

"اول تو یہاں کوئی کشتی نہیں ہے۔ اگر کشتی آگے چل کر مل بھی گئی تو بھی ہمیں دریا کے ڈیلٹے سے بہت پیچھے دریا سے باہر نکل آنا پڑے گا"۔

میں نے کہا۔۔۔۔

"اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ہم دریا کے کنارے کنارے سمندر تک پہنچنے کی کوشش کریں"۔

یہ آئیڈیا گارشیا کو بھی اچھا لگا۔ کہنے لگی۔

"میں سخت تھک گئی ہوں۔ ہمیں کچھ دیر یہاں کہیں آرام کر لینا چاہئے۔ پھر آگے چلیں گے"۔

دن کی روشنی اب کافی پھیل چکی تھی بائیں جانب ایک جگہ درختوں کے درمیان مجھے کسی پرانی عمارت کا کھنڈر سا دکھائی دیا۔ میں نے گارشیا سے کہا کہ اس کھنڈر میں چل کر تھوڑی دیر آرام کر لیتے ہیں۔ ہم اس طرف چلنے لگے۔ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ اس پرانے کھنڈر میں ایک بھیانک مصیبت ہمارا انتظار کر رہی ہے تو میں دریا میں کود جاتا مگر ادھر کا رخ نہ کرتا۔

مگر جو کہتے ہیں کہ قسمت میں بعض واقعات لکھے ہوتے ہیں آدمی لاکھ جتن کرے وہ ہو کر ہی رہتے ہیں ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ کھنڈر کسی پرانی عمارت کا تھا جس کے آثار ہی باقی رہ گئے تھے۔ صرف ایک کمرے کی چھت سلامت تھی۔ قد

آدم دیواریں خود رو جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھی تھیں- دروازہ بھی نہیں تھا- فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی ہم گھاس پر بیٹھ گئے بڑے تھک گئے تھے- گارشیا تو دیوار کی طرف منہ کر کے سو گئی- تھوڑی دیر بعد میں بھی وہیں سو گیا- اس کے بعد میں نے ایک خواب دیکھا- خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں اور گارشیا ایک ہوائی جہاز میں بیٹھے ہیں- ہوائی جہاز فضا کی بلندیوں میں پرواز کر رہا ہے- ہم کہاں سے جہاز میں سوار ہوئے تھے؟ جہاز کسی شہر کی طرف جا رہا تھا؟ کچھ معلوم نہیں- جہاز میں اور مسافر بھی بیٹھے ہیں- جن کے چہرے دھندلے نظر آتے ہیں گارشیا میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی کھڑکی کے شیشے سے باہر بادلوں کو دیکھ رہی ہے جن میں کبھی کبھی بجلی سی چمک جاتی ہے- ایک سانولے رنگ کی عورت چھ سات نشستیں چھوڑ کر اگلی قطار میں سے اٹھتی ہے اور میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھتی ہے- اس کی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں مجھے ایک قسم کی مقناطیسی کشش محسوس ہوتی ہے- پھر اچانک ایسا ہوتا ہے کہ جہاز کو ایک دھچکا سا لگتا ہے اور مسافروں کی چیخیں نکل جاتی ہیں- میں گارشیا کی طرف دیکھتا ہوں- وہ سو رہی ہوتی ہے- جہاز میں آگے کی جانب ایک زوردار دھماکہ ہوتا ہے چکا چوند کر دینے والی روشنی ہوتی ہے اور جہاز نیچے کی طرف گرتا ہے ایک دم سے کوئی میرا بازو پکڑ کر مجھے ایک طرف کھینچ لیتا ہے- ہر طرف آگ ہی آگ ہے- مجھے نہ کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی دیتا ہے- میری آنکھیں بند ہیں- کسی نے میرا بازو سختی سے پکڑ رکھا ہے اور میں نیچے ہی نیچے گر رہا ہوں- اس دوران ایک خیال میرے دل کو تسلی دیتا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں اور یہ حقیقت نہیں ہے-

میں سمندر میں گرتا ہوں-

اس ے ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے- میرا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا- ذہن پر خوف سا طاری تھا- میں نے اس طرف دیکھا جہاں گارشیا سوئی ہوئی تھی مگر اب وہ وہاں نہیں تھی- میں نے خیال کیا کہ باہر گئی ہو گی ابھی آ جائے گی- میں گھاس پر بیٹھا ابھی تک ڈراؤنے خواب کے اثر میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خواب کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے- جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے اور گارشیا نہ آئی تو میں اسے دیکھنے خود اٹھ کر باہر آ گیا- گارشیا کہیں دکھائی نہ دی- میں کھنڈر کے دروازے کے سامنے پتھر پر بیٹھ

کر اس کا انتظار کرنے لگا- جب کافی دیر گزر گئی اور گارشیا نہ آئی تو میں پریشان ہو گیا کہ آخر وہ کہاں چلی گئی ہے- میں اسے آوازیں دینے لگا جنگل میں خاموشی چھائی رہی- کسی طرف سے گارشیا کی آواز نہ آئی- کیا اسے کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا ہے؟ میں نے سوچا- اگر کوئی جنگلی وحشی اسے اٹھا لے جاتا تب بھی وہ چیخ و پکار کرتی اور میری آنکھ کھل جاتی- لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی-

گارشیا بڑے پر اسرار طریقے سے غائب ہو گئی تھی- وہ مجھے چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتی تھی- تو پھر کیا اسے زمین کھا گئی تھی؟ یا آسمان نے اٹھا لیا تھا؟ عجیب بات ہے کہ اس دوران کئی بار خواب میں دیکھا ہوا اس چمکیلی آنکھوں والی سانولی عورت کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آتا رہا جو ہوائی جہاز میں مجھے گھورتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی تھی- مگر میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ خواب خواب ہی ہوتا ہے اور میں حقیقت کی دنیا میں رہ رہا تھا- میں نے جنگل میں گارشیا کی تلاش شروع کر دی- دریا کے کنارے کنارے بھی دور تک گیا جگہ جگہ اسے آوازیں دیں مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا- تھک ہار کر دریا کنارے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے- میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا- کسی طرح اس آسیب زدہ جنگل سے نکل کر ٹڈغاسکر اپنے پرانے ٹھکانے پر پہنچوں اور رچرڈ کو جا کر سارا حال سناؤں- اس روز موسم بھی خراب نہیں تھا- میں دریا کے ساتھ چلنے لگا- دل میں یہ خیال تھا کہ آگے کہیں نہ کہیں کوئی گاؤں ضرور ہو گا جہاں گھاٹ پر کشتی مل جائے گی اور دریا پار کر لوں گا- یا وہاں کے لوگوں سے ساحل تک رہنمائی حاصل کروں گا- میں اپنے اندازے کے مطابق دس بارہ میل تک پیدل چلتا گیا کوئی دیہات نظر نہ آیا- جنگلی لوگوں کی کوئی بستی بھی دکھائی نہ دی- ایک جگہ دریا بائیں جانب گھوم جاتا تھا یہاں موڑ پر دو نیگرو دیہاتی ایک کشتی کے پاس کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے- میں جلدی جلدی چل کر ان کے پاس گیا اور انہیں کسی طرح سمجھایا کہ میں دریا کنارے یا دریا پار کسی بڑے قصبہ میں پہنچنا چاہتا ہوں انہوں نے مجھے کشتی میں بٹھا لیا- کشتی دریا کے بہاؤ کے رخ بہنے لگی- انہوں نے مجھے ایک ساحلی قصبے میں پہنچا دیا- یہاں کافی رونق تھی- کچے مکان تھے ایک بازار بھی تھا- میرے پاس اتنے امریکی ڈالر موجود تھے کہ میں ضرورت کی کچھ چیزیں

بھی خرید سکتا تھا اور اپنی منزل تک بھی پہنچ سکتا تھا۔

یہاں ایک دکان میں سمگل کئے ہوئے یا مختلف شکاریوں سے چرائے ہوئے پستول فروخت ہو رہے تھے میں نے ایک پستول اور کچھ گولیاں خرید لیں تاکہ آگے سفر میں اپنی حفاظت کر سکوں۔ پورٹ پر مال اتارا جا رہا تھا یہاں ایک پڑھے لکھے نیگرو نے مجھے بتایا کہ صبح صبح ایک سٹیمر چلے گا جو مجھے پچاس میل دور ایک چھوٹے شہر میں پہنچا دے گا۔ وہاں سے مجھے ایک بڑا سٹیمر پکڑنا ہو گا جو مشرقی موزمبیق کی بڑی بندرگاہ تک لے جائے گا۔ میں بڑا خوش ہوا۔ میرا سفر آسان ہو گیا تھا۔ میں نے رات اسی قصبے میں سیر کی اور صبح صبح سٹیمر میں سوار ہو گیا۔ سٹیمر کی رفتار زیادہ نہیں تھی مگر وہ عام کشتی سے تیز چل رہا تھا۔ اس میں دوسرے مسافر بھی بیٹھے تھے۔ دوپہر کو سٹیمر ایک چھوٹے شہر میں پہنچا۔ یہاں سے مجھے بڑا سٹیمر پکڑنا تھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ بڑا سٹیمر یا جہاز دو دن بعد آئے گا اور مال لے کر اسی دن روانہ ہو جائے گا۔

یہ ایک چھوٹا سا افریقی شہر تھا یہاں ہوٹل وغیرہ کی کوئی سہولیت میسر نہیں تھی۔ بندرگاہ کے قریب ہی ایک چھوٹی سی سرائے میں جگہ مل گئی۔ سرائے کی عمارت شکستہ اور آسیب زدہ سی لگتی تھی۔ بہرحال مجھے وہاں پر دو راتیں گزارنی تھیں۔ شہر کے دو تین بازار تھے جو شام کا اندھیرا ہوتے ہی سنسان ہو گئے۔ میں سرائے میں آ کر کوٹھڑی میں لیٹ گیا۔ دریا کے رخ پر کھلی کھڑکی میں سے ہوا آ رہی تھی مگر مچھر بڑا تنگ کر رہے تھے۔ آدھی رات کو اٹھ کر میں کوٹھڑی سے باہر آ گیا اور دریا کے کنارے ٹہلنے لگا۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ دریا کا گدلا پانی چاندنی میں چمک رہا تھا۔ درختوں میں بھی چاندنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے مجھے محسوس ہوا کہ میں سرائے سے کافی دور نکل آیا ہوں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف چاندنی کا نور پھیلا تھا۔ سرائے میں واپس جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا باغیچہ نظر آیا جس کے اندر درختوں کے نیچے پتھر کا ایک بنچ پڑا تھا سوچا باقی رات اسی بنچ پر لیٹ کر گزار دینی چاہئے میں بنچ پر لیٹ گیا۔ مگر یہاں بھی مچھروں نے حملہ کر دیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ دھندلی چاندنی میں جھاڑیوں کی دیوار کے ساتھ ایک ڈھلانی چھت والا کوارٹر سا دکھائی دیا۔ میں اس طرف چلا کہ اگر کوارٹر خالی ہوا تو مچھروں سے نجات مل جائے گی۔ کوارٹر خالی تھا۔

دروازے پر جالی لگی ہوئی تھی دروازے کی جالی اور کھڑکی میں سے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانا سا صوفہ لگا ہوا تھا۔ میں صوفے پر لیٹ گیا۔ یہاں گرمی ضرور تھی مگر مچھروں سے نجات مل گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے نیند آنے لگی۔ ابھی میں پوری طرح سویا نہیں تھا کہ آہٹ سی ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میری نگاہیں دروازے کی جالی پر تھیں جہاں چاندنی کی وجہ سے کسی انسان کا سایہ نظر آ رہا تھا میں نے جلدی سے پستول نکال لیا۔ سائے نے دروازے پر دستک دی اور ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں کہا۔۔۔۔

"دروازہ کھولو میں تمہارے لئے ایک پیغام لایا ہوں"۔

پہلے تو میں صوفے پر ساکت بیٹھا رہا۔ پھر پستول ہاتھ میں لئے دروازے تک آیا اور اجنبی شخص سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اس نے کہا۔۔۔

"گارشیا زندہ ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس لے جانے آیا ہوں"۔

میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ یہ ایک بوڑھا حبشی تھا جس کے ہاتھ میں لمبی چھڑی تھی اور چمکدار آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"وہ کہاں ہے؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟" بوڑھے حبشی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"میرے ساتھ چلو۔ اس لڑکی کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے"۔

"پستول میرے پاس تھا" گارشیا سے ہمدردی بھی تھی اور طبیعت میں ایڈونچر کا جوش بھی تھا۔ میں اس حبشی کے ساتھ چل دیا۔ وہ میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ ہم دریا سے ہٹ کر ٹیلوں، گھنے درختوں اور گھاٹیوں میں سے گزر رہے تھے۔ چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ حبشی ایک بہت اونچے ٹیلے کے پاس جا کر رک گیا پھر میری طرف پلٹ کر بولا۔

"میں اس لڑکی کو جنگلی لوگوں کی قید سے نکال کر لے آیا تھا۔ وہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ سامنے جو غار دیکھ رہے ہو وہ اس کے اندر ہے وہ بیمار ہے۔

میرے ساتھ آؤ"۔

وہاں جنگلی جھاڑیوں کے پیچھے ایک غار سا بنا ہوا تھا جس کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ حبشی غار میں داخل ہو گیا۔ یہ روشنی آگے غار جہاں گھومتی تھی وہاں سے آ رہی تھی، مجھے لگا وہاں کسی نے تیل کی لالٹین روشن کر رکھی ہے۔ حبشی تیز تیز چل رہا تھا۔ غار کی چھت میرے سر سے کوئی آدھ فٹ اونچی ہو گی۔ وہ غار کا موڑ گھوم گیا۔ جب میں موڑ مڑ کر غار کی دوسری طرف پہنچا تو مجھے حبشی کہیں نظر نہ آیا۔ اب میرے سامنے ایک تنگ سا گول کمرہ تھا جس کی دیوار کے ساتھ ایک مشعل روشن تھی میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا کر لیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ مجھے کسی خطرناک سازش میں پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ حبشی نہ جانے کس طرف بھاگ گیا تھا۔ میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ ایک عورت کی آواز نے میرے قدم وہیں روک لئے۔

"مجھے تمہارا انتظار تھا"۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اونچے نیچے پتھروں کی قدرتی دیواروں والے اس تنگ کمرے میں سامنے کی جانب پتھر کے دو بڑے بڑے ستون تھے۔ یہ آواز ان ستونوں کے پیچھے سے آئی تھی۔ مشعل کی روشنی میں مجھے وہاں کوئی عورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تم کون ہو اور ---- وہ آسٹریلین لڑکی گارشیا کہاں ہے؟ میں اسی سے ملنے آیا ہوں"۔

وہی نسوانی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

"پستول اپنی جیب میں رکھ لو۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سامنے جو دو ستون دیکھ رہے ہو۔ اس کے پیچھے تمہیں ایک دروازہ کھلا ہوا ملے گا۔ اندر آ جاؤ تم جس کی کھوج میں آئے ہو وہ تمہیں مل جائے گا"۔

میں نے پستول جیب میں نہ رکھا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ گروہ ہے جس نے پہلے گارشیا کو اغوا کیا اور اب مجھے پھانسا جا رہا ہے۔ مگر میں خطرے کے اس مقام تک آ چکا تھا جہاں سے واپس جانا زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ جو ہو سو ہو مگر گارشیا کی گمشدگی کا معمہ ضرور حل ہو جانا چاہئے۔ میں چند

قدم چل کر ستونوں کے پیچھے آ گیا۔ یہاں ایک تنگ دروازہ تھا۔ اس کے اندر سے بھی روشنی نکل رہی تھی۔ میں جھک کر دروازے میں سے گزر گیا۔ اب میں ایک دوسرے کمرے میں تھا جس کی چھت بھی اونچی تھی اور جو پہلے کمرے سے زیادہ کشادہ تھا۔ دیواروں پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ سامنے والی دیوار پر سیاہ پردہ لٹک رہا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

"آسٹریلین لڑکی کہاں ہے؟"۔

اس کے جواب میں سیاہ پردہ ایک طرف ہٹ گیا اور میری آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو میری محدود عقل اور سمجھ سے باہر تھا۔

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا، وہ یہ تھا کہ سیاہ پردہ ہٹتے ہی مجھے وہ سانولے رنگ کی چمکیلی آنکھوں والی عورت نظر آئی جسے میں نے دن کے وقت خواب میں دیکھا تھا کہ میں اور گارشیا ایک ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ گارشیا سو رہی ہے اور ایک عورت اگلی قطار سے اٹھتی ہے اور مجھے گھور کر دیکھتی میرے قریب سے گزر جاتی ہے آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے اس عورت کو دیکھ کر کتنی حیرت ہوئی۔ ذرا خیال کریں کہ ایک عورت آپ کو خواب میں نظر آتی ہے۔ آپ نے اسے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا اور جب آنکھ کھل جائے تو وہی عورت حقیقی زندگی میں آپ کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔

وہ میری جذباتی کیفیت کو سمجھ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں، مجھے دیکھ کر تمہیں تعجب ہوا ہے۔ زندگی میں دیکھے ہوئے لوگ خواب میں نظر آجائیں تو کوئی بات نہیں ہوتی لیکن خواب میں پہلی بار دیکھی ہوئی شکل حقیقی زندگی میں سامنے آجائے تو حیرانی ضرور ہوتی ہے۔ میں وہی عورت ہوں جو تمہیں خواب میں ملی تھی میرا نام فائزہ ہے"۔

میں نے پستول جیب میں رکھ لیا تھا اور اس عورت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں ہے۔ میں نے کہا۔

"یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن اس وقت تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی کہاں ہے جس کو ملانے کے لئے مجھے یہاں بلایا گیا ہے"۔

فائزہ نے بڑا زرق برق نیلے رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفید موتی پروئے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں زبردست چمک تھی۔ چہرے

کے نقش و نگار حبشی عورتوں سے بالکل مختلف تھے۔ روشنی کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر آتی اور گزر جاتی تھی۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی خواب میں بات کر رہا ہو۔ یا ایک ہزار برس سوئے رہنے کے بعد بول رہا ہو۔

جب میں نے بے چاری گارشیا کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ہے؟ تو ایک لمحے کے لئے اس پراسرار عورت فائزہ کا چہرہ ساکت ہو گیا۔ میری طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"تمہیں اس عورت کی بہت فکر ہے؟"۔

میں نے کہا۔۔۔ "ظاہر ہے وہ بے یارو مددگار اجنبی عورت ہے اس کا خاوند مارا گیا ہے۔ جنگلی لوگ اسے اغواء کر کے لے گئے ہیں۔ میں اس کی تلاش میں ہی یہاں آیا تھا۔ اب میرا فرض بنتا ہے کہ اسے ڈھونڈ کر واپس اس کے ملک پہنچاؤں"۔

پراسرار سانولی عورت نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کہا۔۔۔

"میرے ساتھ آؤ۔۔۔ میں تمہیں اس کے پاس لئے چلتی ہوں۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو"۔

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو مجھے یوں احساس ہوا جیسے میرے جسم کا جو وزن ہے وہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ مجھ پر غنودگی سی بھی طاری ہونے لگی۔ وہ مجھے پردے کے پیچھے لے گئی جہاں چاروں طرف نیلی روشنی ہی روشنی پھیلی تھی۔ نیلے رنگ کی کرنیں ادھر ادھر سے آکر ایک دوسری سے ٹکرا رہی تھیں اور جیسے ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ ایسا منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں کرنوں کے اس طوفان میں سے گزرتا چلا گیا۔ روشنی کی کرنیں، نیلی روشنی کے غبار میں بدل گئیں اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا ہاتھ اس پراسرار عورت فائزہ کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ملا۔ جب ہاتھ پیچھے ہٹائے تو کیا دیکھتا ہوں کہ نہ وہ غار ہے نہ وہ نیلی روشنیاں ہیں اور نہ وہ پراسرار سانولی عورت ہی کہیں نظر آتی ہے۔ بلکہ میں ایک ماڈرن شہر کی ایک سڑک پر کھڑا

ہوں - میں نے ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں مڈغاسکر کے اسی چھوٹے سے شہر میں آگیا ہوں جہاں میں رچرڈ کے چائے کے کارخانے میں کام کرتا تھا اور جہاں سے گارشیا اپنے خاوند کے ساتھ افریقہ کی جانب روانہ ہوئی تھی - میں نے وہیں سے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا رچرڈ کے پاس پہنچا --- وہ دفتر کے باہر کھڑا مزدوروں سے چائے کے کریٹ ٹرک میں رکھوا رہا تھا --- مجھے دیکھ کر عادت کے مطابق اونچی آواز میں بولا ---

"مسٹر اے ایچ! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"۔

وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گیا - اس نے مجھے بتایا کہ گارشیا کسی نہ کسی طرح افریقہ کے وحشی قبائل کی قید سے نکل کر میرے پاس پہنچ گئی تھی اور میں نے آج ہی اسے آسٹریلیا روانہ کیا ہے - میں خاموش تھا - میری زندگی میں ماورائی واقعات اکثر رونما ہوتے رہے ہیں - سمجھ گیا کہ یہ سارا کارنامہ پراسرار عورت فائزہ کا ہے - میں نے اسے مختصر لفظوں میں اپنی مصیبت کی داستان بیان کی اور اپنے کوارٹر میں آکر سو گیا اور دوسرے دن دوپہر تک سویا رہا ---

میں نے رچرڈ کو پراسرار عورت کے بارے میں کچھ نہ بتایا - مجھے علم تھا کہ اس قسم کی باتوں میں رازداری بڑی ضروری ہوتی ہے - ویسے بھی اگر میں کسی کے آگے ان واقعات کو بیان کروں تو کوئی یقین نہیں کرے گا - لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہماری دنیا، جس کو ہم حقیقت کی دنیا کہتے ہیں، اس دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا بھی ہے جو ہماری دنیا سے بالکل مختلف ہے - ہو سکتا ہے یہ زندگی سے پہلے یا موت کے بعد کی دنیا ہو - اس دنیا کی اصلیت میری سمجھ میں بھی کبھی نہیں آسکی - چونکہ میں نے اکثر اس ماورائی دنیا کی سیر کی ہے اس لئے اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا -

اب وہاں سے میرا جی اچاٹ ہو گیا تھا --- میں واپس اپنے وطن آنے کے پروگرام بنانے لگا - کبھی کبھی پراسرار عورت فائزہ جو ماورائی دنیا کی رہنے والی تھی، مجھے یاد ضرور آتی مگر میں اس سے ملاقات کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا - اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مجھے اپنی حقیقت کی دنیا اور اس دنیا کے لوگ ہی اچھے لگتے تھے اور میں انہی لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا تھا - میں نے وطن واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں - رچرڈ نے سمندری جہاز میں میری سیٹ بھی بک کرا دی - یہ جہاز دو روز بعد کیپ ٹاؤن سے

آنے والا تھا - سفر میں سامان تو میرے پاس کبھی بھی نہیں ہوتا تھا - بس خاکی رنگ کا ایک فوجی تھیلا ہی تھا جس میں میرے دو چار کپڑے اور ایک دو کتابیں پڑی تھیں - میں نے سری لنکا کے شہر کولمبو تک کی ٹکٹ خریدی تھی - میرا ارادہ تھا کہ کچھ روز لنکا کی سیاحت کروں گا - اس کے بعد وہاں سے انڈونیشیا کی طرف نکل جاؤں گا - مگر قدرت میرے اس ارادے پر ضرور مسکرا رہی ہو گی کیونکہ تقدیر نے میرے لئے وہ حالات وواقعات تیار کر رکھے تھے جن کا مجھے وہم وگمان بھی نہیں تھا -

اب میں آپ کو سناتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور میں ایک نئی مصیبت میں کیسے پھنسا - یہ اس دن کا واقعہ ہے جس کے اگلے روز مجھے ولاڈی واسٹک نامی سمندری جہاز میں سوار ہو کر کولمبو کی طرف روانہ ہونا تھا - میں دن بھر شہر کی سیر کرتا رہا - رات کو رچرڈ نے میرے اعزاز میں دعوت دی - کارخانے کے سبھی لوگ دعوت میں موجود تھے بڑی رونق لگی - کافی رات گئے میں دعوت سے فارغ ہو کر اپنے کوارٹر میں آیا اور جیسا کہ میری عادت ہے ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگا - دو چار صفحے ہی پڑھے ہوں گے کہ مجھے نیند آنے لگی - کتاب پھینک کر میں نے ٹیبل لیمپ بجھایا اور کمبل اوپر کر لیا - اچانک باہر سے کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی - یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی غنڈہ کسی عورت کو اغواء کرنے کی کوشش کر رہا ہو - میں جلدی سے باہر آ گیا - میرے کوارٹر کے آگے ایک چھوٹا سا راستہ درختوں میں سے ہوتا ہوا اوپر چائے کے باغات والے ٹیلوں کی طرف جاتا تھا - قریب ہی چائے کا بہت بڑا گودام تھا جس کے باہر بتی جل رہی تھی - اس کی روشنی میں میں نے ادھر ادھر دیکھا - مجھے وہاں نہ تو کوئی عورت نظر آئی اور نہ کوئی غنڈہ دکھائی دیا - مگر میں نے باقاعدہ عورت کی چیخ سنی تھی - دل نے کہا آگے چل کر دیکھو - ایک مصیبت زدہ عورت کی مدد کرنا تمہارا فرض ہے - میں گودام کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا درختوں میں آگیا - یہاں میں نے اس عورت کو آواز بھی دی کہ وہ کہاں ہے - کوئی جواب نہ آیا - مجھے یقین ہو گیا کہ وہ عورت یہاں سے نکل چکی ہے اور اس کا پیچھا کرنا بیکار ہے - میں اپنے کوارٹر میں جانے کے لئے واپس مڑا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا -

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو وہی خواب والی پراسرار عورت زرق برق

ریشمی کپڑوں میں ملبوس کھڑی تھی- میں جیسے سکتے میں آگیا- اس کی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں سے ایسے مقناطیسی شعائیں نکل رہی تھیں کہ میری نظر اس کے چہرے پر نہیں ٹھہرتی تھی- وہ خود ہی بولی-

"جس لڑکی کے بارے میں تم پریشان تھے وہ تو اپنے شہر پہنچ گئی- اب تم کس فکر میں ہو؟"-

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا-

"میں اپنے وطن واپس جارہا ہوں- گھر کے لوگ بہت یاد آرہے ہیں"-

اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور فیصلہ کن انداز میں کہا-

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا"-

میرے بدن میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی- اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اس پراسرار عورت کی ماورائی قوتوں سے واقف تھا- وہ بڑی آسانی سے اپنے فیصلے پر عمل کر سکتی تھی- چنانچہ میں نے بظاہر ذرا بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے مسکرا کر کہا-

"تمہارا شکریہ فائزہ! لیکن میں اب واقعی کچھ عرصے کے لئے گھر جانا چاہتا ہوں"-

وہ ٹکٹکی باندھے مجھے تک رہی تھی- میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آگئی ہے- کہنے لگی-

"تم نے مجھے میرے نام سے پکارا- اتنی محبت سے کبھی کسی نے میرا نام نہیں لیا- میں نے تو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس کی صدیوں سے مجھے تلاش تھی"-

اب تو میں واقعی گھبرا گیا- یہ عورت مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا تہیہ کر چکی تھی- مجھے اس سے چھٹکارا مشکل نظر آرہا تھا- پھر بھی میں نے حواس اپنے قابو میں رکھے اور پراسرار عورت کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ میرا اپنے بھائی بہنوں کے پاس واپس جانا کتنا ضروری ہے- میں دیکھ رہا تھا کہ میری ساری باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں- اس پر میری جذباتی اور گھریلو تعلقات کی اہمیت والی باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا- باہر جو مجھے کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی تھی

وہ بھی اس عورت کا ایک ڈراما تھا- وہ مجھے کوارٹر سے باہر نکالنا چاہتی تھی- میں نے سوچا کہ مجھے وہاں سے جنگل کی طرف بھاگ جانا چاہئے- یہ سوچ کر میرا دل پریشان ہو رہا تھا کہ کل مجھے جہاز پر سوار ہونا ہے- میری سیٹ بھی بک ہو چکی ہے اور اوپر سے یہ بلا نازل ہوگئی ہے جو مجھے ایک طرح سے اغواء کر کے لے جا رہی ہے-

یہ بات میرے ذہن میں بالکل واضح تھی کہ اس عورت کا حقیقت کی دنیا سے صرف اتنا تعلق ہے کہ اپنا قالب بدل کر اس دنیا میں آگئی ہے- اصل میں وہ کوئی ہوائی مخلوق تھی اور اس قسم کی مخلوق سے پہلے بھی میرا کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا- یہ کوئی بری مخلوق نہیں ہوتی- اچھی مخلوق ہوتی ہے- انسانوں کے کام آتی ہے لیکن اس مخلوق کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے- اگر ان میں سے کسی کو آپ پسند آگئے تو پھر اس سے چھٹکارا مشکل ہے- میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا- پراسرار عورت نے میرا بازو پکڑ لیا- اس کی گرفت کی سختی سے معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ مجھے جانے نہیں دے گی- میں بھی اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا- نوجوانی کا زمانہ تھا- خون میں بڑا جوش تھا- میں نے ایک ہی جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ایک طرف منہ اٹھا کر دوڑ پڑا- میں جھاڑیوں پتھروں کو پھلانگتا دوڑتا چلا جا رہا تھا- گھنے درختوں کی وجہ سے یہاں چاند کی روشنی نہیں تھی ایک پتھر سے میرا پاؤں ٹکرایا اور میں منہ کے بل گر پڑا- اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا- جب ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک آرام دہ بستر پر پڑا ہوں- سامنے لمبی محرابی کھڑکی میں سے دن کی روشنی آرہی ہے- میں اٹھ کر بیٹھ گیا- یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس کی دیواریں دبیز ریشمی پردوں سے ڈھکی ہوئی تھیں- پلنگ کے پاس سنگ مرمر کی ایک گول تپائی پڑی تھی- پیچھے پرانے زمانے کے سنہری جھالر والے کاؤچ رکھے ہوئے تھے- میں نے غور سے دیکھا- محرابی کھڑکی میں سلاخیں لگی تھیں- اس کمرے میں مجھے کوئی دروازہ نظر نہیں آرہا تھا- میں پلنگ سے اتر کر کمرے میں دروازہ تلاش کرنے لگا- دیواروں پر گرے ہوئے بھاری پردوں کو ہٹا ہٹا کر دیکھا- پیچھے دیوار ہی دیوار تھی- دروازہ کہیں نہیں تھا- میں کھڑکی کے پاس آگیا- کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں اتنی قریب قریب لگی تھیں کہ آدمی آسانی سے ہاتھ باہر بھی نہیں نکال سکتا تھا- باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس کی روشوں کے ساتھ سنگ مرمر کے مجسمے نصب

تھے- پیچھے سرو کے درخت بالکل ساکت کھڑے تھے- ان کے پیچھے دیوار تھی جو کسی جیل کی دیوار سے بھی اونچی تھی- سب سے پہلا احساس مجھے یہ ہوا کہ میں یہاں قید کر دیا گیا ہوں- پراسرار عورت کے خطرناک عزائم سے میں واقف ہو چکا تھا-

مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی- میں جلدی سے پلنگ پر آ کر لیٹ گیا- میری دائیں جانب بھاری پردہ ایک طرف سمٹ گیا- وہی پراسرار عورت اندر داخل ہوئی اس نے زرد رنگ کا ریشمی لباس پہنا ہوا تھا- اس کے ساتھ ایک گہرے سانولے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی تھی- جس نے پھلوں سے بھرا ہوا طشت اٹھا رکھا تھا- پردے کے پیچھے یہ دروازہ مجھے نظر نہیں آیا تھا- میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں پراسرار عورت فائزہ سے کس انداز سے بات کروں- جی تو چاہتا تھا کہ اسے شوٹ کر دوں-

اس عورت کی وجہ سے میں ایک ایسی مصیبت میں گرفتار ہو چکا تھا کہ جس سے رہائی ناممکن نظر آتی تھی- افسوس یہ کہ میرے پاس پستول نہیں تھا- پستول ہوتا بھی تو وہ بیکار تھا- کیونکہ اس عورت پر کوئی گولی اثر نہ کرتی- نوجوان خادمہ نے پھلوں کا ٹرے پلنگ والی تپائی پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی-

پراسرار عورت فائزہ نے اشارہ کیا- خادمہ واپس چلی گئی- اب کمرے میں میری مصیبت اور میں ---- اکیلے تھے- وہ کاؤچ پر بیٹھ گئی اور مسلسل مجھے گھورتی رہی- میں نے اپنے بھڑکتے ہوئے جذبات کو دبا کر بڑے ادب سے پوچھا-

"تم مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"-

وہ ذرا سا مسکرائی- ایک شان بے نیازی سے گردن کو ذرا پیچھے لے جا کر بولی-

"ان باتوں کو بھول جاؤ ---- میں تمہیں جہاں لے آئی ہوں اب تمہیں اسی جگہ ساری زندگی رہنا ہے- ایسی باتیں سوچنے سے کیا فائدہ؟"-

مجھے بڑا غصہ آیا- اس عورت کو کیا حق پہنچتا تھا کہ مجھے اپنا غلام بنائے- جذبات میں آ کر میں پھٹ پڑا اور میں نے اسے بہت سخت سست کہا- اس کا چہرہ شعلے کی طرح دہکنے لگا- وہ کاؤچ سے اٹھ کر میرے قریب آئی- اس کی آنکھوں سے چنگاریاں

پھوٹ رہی تھیں- وہ بڑے غضب ناک لہجے میں کہنے لگی-

"تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ میرے آگے تمہاری حقیقت کیا ہے؟ یہ میں ہوں جس نے تمہیں زمین سے اٹھا کر اس عالی شان محل کی خواب گاہ میں لا بٹھایا ہے- میری بات غور سے سنو---- میں تم پر اپنی طاقت استعمال نہیں کرنا چاہتی- تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اپنے وطن، اپنے گھربار اپنے بھائی بہنوں اور اپنی گذشتہ زندگی کو بھول جاؤ---- یہاں تمہیں میرا ہر حکم ماننا پڑیگا-

مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس وقت مجھ پر کونسا بھوت سوار ہو گیا تھا- صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے پلنگ پر سے کسی جنگلی درندے کی طرح اس منحوس عورت پر چھلانگ لگائی اور اسے زمین پر گرا کر اس کا گلا دبانا شروع کر دیا- لیکن بہت جلد مجھے محسوس ہوا کہ میرے ہاتھوں کی طاقت زائل ہو رہی ہے- میرے ہاتھ سن ہو رہے ہیں- نہ معلوم کدھر سے تین چار حبشی غلام نکل کر آئے اور مجھے لاتوں اور گھونسوں سے مارتے ہوئے کھینچ کر لے گئے- میں تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا- جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرے پاؤں میں زنجیر بندھی ہے اور ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوں- دل میں پریشانی بھی تھی کہ خدا جانے اب اس قید سے کب نکلوں گا لیکن اس خیال سے تھوڑا سکون بھی ملا کہ میں نے اس منحوس عورت پر اپنے دل کا غصہ اتار لیا تھا- اب جو ہو گا دیکھا جائے گا- کوٹھڑی میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ رات کا وقت ہے کہ دن کا وقت ہے- کوئی کھڑکی روشن دان بھی نہیں تھا- دیوار میں صرف ایک طاق تھا جس میں مٹی کا دیا جل رہا تھا- سامنے والی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا- میرے پاؤں کی زنجیر لمبی تھی- میں اٹھ کر دروازے تک گیا- اسے باہر کی طرف دھکیلا- ظاہر ہے دروازے کے باہر تالہ لگا تھا- ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اگر یہ منحوس عورت کوئی آسیبی یا ہوائی مخلوق ہے تو میرے ساتھ نارمل انسانوں والا سلوک کیوں کر رہی ہے- اس کے پاس تو آسیبی طاقت بھی ہے- وہ اپنی آسیبی طاقت سے میرے ذہن کو بدل سکتی ہے- مجھے اپنا طرفدار بنا سکتی ہے- مجھے بے حس بنا کر اپنے مکان میں کہیں بھی ڈال سکتی ہے- اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرے- میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر کوٹھڑی میں بند کر دے- یہ عورت

مجھے ایسے لگی جیسے کوئی اداکارہ کسی خوفناک ڈرامے میں ڈبل رول ادا کر رہی ہو۔ وہ اپنی پراسرار آسیبی طاقت سے ذرا سا کام بھی لے لیتی تھی اور پھر اس سے ہاتھ بھی کھینچ لیتی تھی۔ مجھ سے محبت کی طالب بھی تھی اور مجھ پر جبر بھی کر رہی تھی اور مجھے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ بہرحال میں کوئی ہوائی مخلوق یا آسیب نہیں تھا۔ حقیقت کی دنیا میں رہنے والا انسان تھا۔ میں اس کی آسیبی قوت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس کا غلام بن کر ساری زندگی اس کے ساتھ رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت مجھے الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آ رہی تھیں۔ الہ دین کے چراغ والا جن یاد آ رہا تھا۔ کاش وہ چراغ میرے پاس ہوتا اور میں جن کو بلا کر تاریک قید خانے سے بھاگ سکتا۔ اس پراسرار عورت پر کسی روحانی عمل یا خاص طلسم سے ہی قابو پایا جا سکتا تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا طلسم بھی نہیں تھا مجھے کوئی روحانی عمل بھی نہیں آتا تھا۔ بے چاری گارشیا تو اپنے گھر پہنچ گئی تھی مگر میں زمین اور آسمان کے درمیان لٹک گیا تھا۔

نیم روشن چاردیواری تھی۔ طاق میں جلتا ایک دیا تھا اور میں تھا۔ کوئی خبر نہیں تھی کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ باہر دن ہوگا کہ رات ہوگی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ آسیبی عورت مجھے دنیا کے کس خطے میں لے آئی ہے۔ یہ کونسا ملک ہے۔ کونسا شہر ہے؟ جس خادمہ کو مین نے اس عورت کے ساتھ دیکھا تھا اس کے خدوخال بھی حبشی عورتیں ایسے نہیں تھیں۔ رنگ سانولا تھا مگر حبشی عورتوں کی طرح بالکل سیاہ نہیں تھا۔ سر کے بال بھی سیدھے تھے۔ میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ سر پتھر کی دیوار کے ساتھ لگا دیا اور خدا کے حضور دعائیں مانگنے لگا کہ وہ مجھے اس مشکل سے نکالے۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ میں کب تک اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا بے قراری سے پہلو بدلتا رہا۔ طاق میں جو دیا جل رہا تھا اس کا تیل ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ایک بار بھی لو دھیمی نہیں ہوئی تھی۔ طاق فرش سے کافی اونچا تھا۔ ورنہ میں دیا نیچے اتار کر دیکھ لیتا کہ تیل کتنا ختم ہوا ہے۔ اس سے وقت گزرنے کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا۔ وہ ایک طرح کی نیم روشن قبر تھی۔ جہاں میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ میرے پاؤں میں جو زنجیر بندھی تھی اس کے آہنی پٹے میں چابی جتنا سوراخ تھا۔ یعنی اسے چابی لگا کر بند کیا گیا تھا۔ یہ لوہے کی زنجیر کافی موٹی تھی اور میرا پاؤں درد کرنے لگا تھا۔ میں دیوار

سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے پڑا تھا کہ اچانک مجھے دروازے کے باہر ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی تالہ کھول رہا ہو۔ کوئی حبشی غلام میرے لئے پانی یا قیدیوں والا کھانا لے کر آ رہا ہوگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جونہی وہ میرے پاس آئے گا میں ایک دم سے حملہ کر کے زنجیر سے اس کا گلا دبا دوں گا۔ میں نے زنجیر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی جھولی میں ڈال لیا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ چراغ کی روشنی میں مجھے ایک نوجوان لڑکی نظر آئی جو دروازہ بند کر کے دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ یہ آسیبی عورت کی وہی خادمہ تھی جو میرے لئے پھل لائی تھی۔ میں نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا----

"خاموش رہو"----

اس کی مٹھی میں چابی تھی۔ وہ چابی لگا کر میری زنجیر کھولنے لگی----

نوجوان خادمہ نے میرے پاؤں کی زنجیر کھول دی- اب میں آزاد تھا- مگر
سوال یہ تھا کہ یہ لڑکی اسی طلسمی جہنم سے کیسے باہر نکالے گی جہاں آسیبی عورت فائزہ کی
حکومت تھی- میں اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا- کیونکہ اس نے مجھے خاموش
رہنے کی ہدایت کی تھی- یہ لڑکی پراسرار عورت فائزہ کی خادمہ تھی-

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ مجھے فائزہ کے حضور پیش کرنے لئے جارہی ہے- مگر
جب اس نے رازداری کے انداز میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ
یہ معاملہ میری سوچ کے برعکس ہے- خادمہ نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا-
کوٹھڑی سے نکل کر ہم بائیں جانب ایک خفیہ زینے سے اترنے کے بعد ایک سرنگ
میں آگئے- یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیئے جل رہے تھے جن کی ہلکی روشنی میں
سرنگ کا راستہ نظر آرہا تھا- سرنگ میں بڑی گرمی تھی- خادمہ کبھی دائیں مڑجاتی اور
کبھی بائیں- خدا خدا کرکے سرنگ ختم ہوئی اور ہم ایک جگہ جھاڑیوں میں سرنگ سے
باہر نکل آئے- باہر رات کا وقت تھا- آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے- تھوڑا آگے
گئے تو ایک دریا بہتا نظر آیا- یہاں ایک کشتی کنارے پر بندھی ہوئی تھی- یہ سارا انتظام
خادمہ نے پہلے سے کر رکھا تھا- ہم کشتی میں بیٹھ گئے اور کشتی دریا کی لہروں پر چل
پڑی- ہم دریا کے بہاؤ پر چلے جارہے تھے- چپو ہمارے ہاتھوں میں تھے مگر انہیں چلانے
کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی- تاروں کی دھیمی روشنی میں دریا کا پانی دھندلا
نظر آرہا تھا- دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا- دوسرے کنارے پر درختوں کے سیاہ
جھنڈ دھبوں کی شکل میں صاف دکھائی دیتے تھے-

یہاں میں نے خادمہ سے پوچھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں؟

میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ اس خادمہ کی شکل حبشی عورتوں ایسی نہیں تھی-
رنگ ضرور گندمی تھا مگر چہرے کے خدوخال حبشی عورت سے بالکل مختلف تھے-
میرے سوال پر اس لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا-

"میرا نام سعدیہ شارل ہے"-

میں نے پوچھا--- سعدیہ تو مسلمانوں والا نام ہے مگر شارل فرنچ نام ہے"
---- وہ کچھ دیر خاموش رہی- دریا کی لہروں کو تکتی رہی- پھر چپو پانی میں ڈال کر
کشتی کا رخ بائیں جانب کنارے کی طرف موڑا اور بولی-

"میری ماں مسلمان تھی- وہ مصر کی رہنے والی تھی مگر پیرس کی ایک
یونیورسٹی میں پڑھتی تھی- وہیں اس نے ایک فرانسیسی ڈاکٹر سے شادی کرلی- میری
پیدائش کے چار سال بعد اس کا انتقال ہوگیا- میرے باپ نے مجھے ایک بورڈنگ
ہاؤس داخل کرا دیا- میں نے وہیں تعلیم حاصل کی- تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں
اپنے والد کے پاس آگئی- میرا باپ پیرس کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر تھا- میں ایک کالج
میں سوشل سٹڈیز پڑھانے لگی- اسی دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی- جرمن
فوجیں ایک طوفان کی طرح سارے یورپ پر چھا گئیں- فرانس پر جرمنوں کا قبضہ ہو
گیا- میرا باپ مزاحمتی گروپ میں شامل ہوگیا- میں بھی اس کے ساتھ تھی- ہم نے
جرمنوں کے کئی فوجی ٹھکانوں کو اڑا دیا- ایک رات ہم نے گستاپو کے ہیڈکوارٹر پر
کمانڈو اٹیک کیا- مگر ہمارے بہت سے ساتھی مارے گئے- میرے باپ کو گرفتار کرلیا
گیا- میں فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی- اب مجھے اپنے باپ کی تلاش تھی- مجھے خفیہ
ذرائع سے پتہ چلا کہ میرے باپ پر تشدد کیا گیا ہے اور اسے جرمنوں نے ایک چھوٹے
جنگی جہاز میں قید کیا ہوا ہے جو وہ ایک روز میں جنوبی افریقہ کی برطانوی نو آبادی کے
خلاف گوریلا جنگ لڑنے کے لئے بحرہند کی طرف روانہ ہو رہا ہے- میں کسی نہ کسی
طرح نرس بن کر اس جرمن جنگی جہاز پر پہنچ گئی- اس جہاز کا نام سالسبرگ تھا- جہاز
جنوبی افریقہ کی طرف روانہ ہوگیا- مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ میرا باپ جہاز کے لوئر ڈیک
کے ایک کیبن میں قید ہے- میں جہاز کے میڈیکل عملے میں ایک مصری نرس کی حیثیت
سے ملازم تھی- کسی کو میرے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا- ایک دن میں اپنے باپ کو

دوائی کھلانے کے بہانے اس کے تنگ و تاریک کیبن میں پہنچ گئے۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ دوائی کھلائی اور حوصلہ دیا کہ جہاز ساحل پر لگا تو میں اسے وہاں سے نکال کر لے جاؤں گی۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تین دن کے سفر کے بعد جہاز جنوبی افریقہ کے ایک ویران ساحل سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ یہاں میرے باپ کو جہاز سے اتار کر ایک چھوٹے سے قلعے میں بند کر دیا گیا جس پر جرمنوں کا قبضہ تھا۔ ہمیں جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر میں ایک رات جہاز سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں، میں قلعے کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک ایک زرق برق لباس والی عورت درختوں میں سے نکل کر میرے سامنے آ گئی---- میں یہی سمجھی کہ یہ کوئی بھوت پریت ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ میں نے پستول نکال لیا۔ جانتے ہو وہ عورت کون تھی؟ وہ یہی پراسرار عورت فائزہ تھی جس کی قید سے ہم دونوں نکل کر آئے ہیں۔ اس عورت نے کہا---- تم آج سے میرے پاس رہو گی۔ میں نے پستول کا فائر کر دیا۔ گولی کا اس عورت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے ساری گولیاں چلا ڈالیں۔ مگر یہ آسیبی عورت ویسی ہی کھڑی مسکراتی رہی۔ اس نے آگے بڑھ کر میری گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش میں آئی تو منحوس محل میں تھی جہاں تم بعد میں قید میں ڈالے گئے۔ تمہیں دیکھ کر میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے ساتھ تمہیں بھی اس جہنم سے نکال کر لے جاؤں گی۔ چنانچہ آج مجھے موقع مل گیا اور میں تمہیں نکال لائی ہوں۔ بس یہ میری کہانی ہے"۔

سعدیہ خاموش ہو گئی---- اس کے الفاظ دریا کی خاموشی میں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مجھے دو باتوں کی خوشی ہو رہی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ میں اس منحوس آسیبی عورت کی قید سے نکل آیا تھا۔ دوسری اس بات کی خوشی تھی کہ میں طلسمی دنیا سے نکل کر اپنی حقیقی اور ماڈرن دنیا میں پہنچ گیا ہوں جہاں ایک پڑھی لکھی لڑکی مجھ سے ہمکلام ہے۔ کشتی اب دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی تھی۔ میں نے سعدیہ سے کہا۔

"تم نے جو واقعات سنائے ہیں ان سے میں بڑا متاثر ہوا ہوں۔ مگر یہ بتاؤ کہ

اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"۔

کشتی کنارے کے ساتھ لگ گئی تھی۔ ہم کشتی سے اترے سعدیہ کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس علاقے سے واقف ہے۔ سلیٹی رنگ کے اندھیرے میں درخت اور دریا کنارے کی چٹانیں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ وہ مجھے لے کر چٹان کی طرف چلنے لگی، پھر گہرا سانس لے کر بولی۔

"مجھے تو ہر حالت میں اپنے باپ کو جرمنوں کی قید سے نکالنا ہے۔ اگر میں نے مزید دیر کر دی تو میرا باپ مر جائے گا۔ جرمن اس پر بڑا تشدد کر رہے ہیں۔ اس سے فرنچ مزاحمتی گروپ کے لوگوں کے نام اور ٹھکانے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہاں---- تم آزاد ہو---- جہاں چاہے جا سکتے ہو"۔

مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ ایک محب الوطن باپ کی بہادر اور مسلمان بیٹی تھی۔ اسے اتنی خطرناک جدوجہد میں اکیلا چھوڑ دینا مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"سعدیہ! ابھی تک تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور چاہتا ہوں کہ جب تک تم اپنے باپ کو دشمنوں کی قید سے چھڑا نہیں لیتیں تمہارے ساتھ ہی رہوں"۔

سعدیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم چٹانوں سے ہٹ کر اب ایک ٹیلے کی طرف جا رہے تھے جو رات کے اندھیرے میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سعدیہ کہنے لگی۔

"میں تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرتی ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ میری خاطر تم اپنی زندگی خطرے میں ڈالو۔ کیونکہ ہم جس علاقے کی طرف جا رہے ہیں وہاں جرمن فوجوں کا قبضہ ہے۔ ان کے جنگی جہاز بھی وہاں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اگر ہم پکڑے گئے تو جرمن ہمیں اسی وقت شوٹ کر دیں گے۔ تم ناحق اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو"۔

میں اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ میری اپنی زندگی ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھی۔ پیچھے آسیبی عورت فائزہ کا دھڑکا لگا تھا۔ وہ کسی بھی وقت ہم پر حملہ کر سکتی تھی اور آگے جرمن فوجیں چاروں طرف پھیلی

ہوئی تھیں۔ انہوں نے پکڑ لیا تو پھر ایک اذیت ناک موت ہی میرا انجام ہو سکتی تھی۔ میں سعدیہ کو بھی دشمن کے علاقے میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ خود بھی وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے سعدیہ سے کہا۔

"تم میری فکر نہ کرو---- ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں---- میں تمہاری زیادہ مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مگر اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ تمہیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں"۔

مجھے سعدیہ کی ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔ اندھیرے میں مجھے اس کا چہرہ سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ کہنے لگی----

"یہاں ہم میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ ذرا آگے دشمن کا علاقہ شروع ہو جائے گا۔ وہاں ہمیں ہر قدم پر موت کا سامنا ہو گا"۔

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ پھر میرا بازو کھینچ کر جلدی سے مجھے جھاڑیوں کے پیچھے کیا اور سرگوشی میں بولی۔

"کوئی آرہا ہے"----

ہماری آنکھیں جھاڑیوں کے پیچھے سے اندھیرے میں گھور کر دیکھنے لگیں۔ دو سائے باتیں کرتے چلے آرہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو معلوم ہوا کہ دونوں جرمن فوجی ہیں۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ تھے اور رائفلیں کندھوں سے لٹک رہی تھیں۔ اچانک ایک جرمن فوجی رک گیا۔ ہم نے بھی اپنے سانس روک لئے----

میں اور سعدیہ جھاڑیوں میں سانس روکے بیٹھے تھے---- دونوں فوجی ہم سے بمشکل چار قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے جرمن زبان میں کچھ باتیں کیں اور پھر آگے چلے گئے۔ سعدیہ جرمن زبان جانتی تھی۔ فوجیوں کے جانے کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ مزید گشت پر آگے جائیں یا واپس لوٹ چلیں۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ تھوڑا اور آگے جا کر واپس ہو جائیں گے۔ ہم ابھی تک جھاڑیوں کی اوٹ میں اندھیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ سعدیہ پریشان تھی۔ کہنے لگی----

"ہم جرمن فوجی علاقے میں آگئے ہیں۔ ہمیں بڑی احتیاط کرنی ہو گی"۔

میں نے سعدیہ سے پوچھا کہ وہ جانا کہاں چاہتی ہے۔ اس پر وہ بولی----

"میرا باپ پرانے قلعے میں قید ہے جس پر جرمنوں کا قبضہ ہے۔ ظاہر ہے میں کسی نہ کسی طرح اس قلعے میں داخل ہو کر اپنے باپ کو آزاد کرانا چاہتی ہوں"۔

"مگر تم قلعے میں کیسے داخل ہو گی؟ تم تو پکڑی جاؤ گی۔ اگر میں تمہارے ساتھ ہوا تو میں بھی پکڑا جاؤں گا"۔

سعدیہ نے آہستہ سے کہا----

"میں نے ایک طریقہ سوچ رکھا ہے۔ مگر اس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟"۔

میں نے کہا---- "تم نے مجھے آسیبی جہنم سے نجات دلائی ہے مجھ پر تمہارا بہت بڑا احسان ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری مدد نہ کروں۔ بتاؤ---- مجھے کیا کرنا ہو گا؟ اتنے میں ہمیں جرمن سپاہیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں جرمن سپاہی ایک جگہ سے گھوم کر واپس آرہے تھے۔ ہم خاموش ہو گئے۔ جرمن سپاہی باتیں کرتے ہمارے قریب سے گزر گئے۔ ان کے جانے کے بعد سعدیہ نے کہا---- یہاں سے تھوڑا شمال مشرق کی طرف ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری ہے جس کی انچارج ایک مراکشی مسلمان عورت ڈاکٹر رابعہ ہے۔ اس سارے علاقے پر جرمنوں کا قبضہ ہے۔ ڈاکٹر رابعہ کو میرے حالات کا علم ہے۔ وہ ہماری مدد کر سکتی ہے۔ میرا ارادہ اسی کے پاس جانے کو تھا"۔

"تو چلو---- وہیں چلتے ہیں"۔

ہم جھاڑیوں سے نکل کر سامنے والے درختوں کی طرف ہو گئے۔ اب ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ یہاں جنگلی جھاڑیاں زیادہ نہیں تھیں۔ راستے میں ہمیں کوئی جرمن سپاہی بھی نہ ملا۔ ہم آدھا گھنٹہ چلتے رہے۔ اس کے بعد ذرا دور ٹیلے کی اوٹ میں گاؤں کی دو چار روشنیاں جھلملاتی دکھائی دیں۔ سعدیہ نے بتایا کہ یہی وہ گاؤں ہے۔ ہم چھپتے چھپاتے گاؤں کی دوسری طرف جدھر ڈسپنسری تھی ادھر آگئے۔ ڈسپنسری کی چھوٹی سی عمارت دو منزلہ تھی۔ نچلی منزل میں مدہم روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ سعدیہ نے پچھلے دروازے پر آکر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے سرگوشی

میں کہا۔

"رات اتنی گزر گئی ہے ---- رابعہ تو سو رہی ہو گی"۔

سعدیہ نے کہا ---- "ڈاکٹروں کی نیند کچی ہوتی ہے۔ انہیں رات کے کسی بھی وقت کوئی مریض آکر جگا سکتا ہے" تیسری بار دستک دینے پر اوپر والی منزل کی بتی روشن ہو گئی۔ سعدیہ اور میں جلدی سے دروازے کی ایک طرف ہو گئے۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ اس نے عربی زبان میں پوچھا تھا۔ کون ہے؟ عربی سعدیہ کی مادری زبان تھی۔ اس نے عربی میں ہی اپنا نام لے کر کچھ کہا۔ دروازہ کھل گیا۔ یہ اوپر جانے والے زینے کی ڈیوڑھی تھی۔ یہاں بھی روشنی تھی۔ میں نے ایک پختہ عمر کی سانولے رنگ کی عورت کو دیکھا جس کے بالوں میں ہلکی سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔

یہ ڈاکٹر رابعہ تھی ---- اس نے مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ سعدیہ نے میرا تعارف کرایا۔ ان کی عربی زبان میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ صرف اشاروں اور اپنے نام سے میں سمجھ گیا کہ میرا تعارف کرایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر رابعہ ہمیں اوپر اپنے چھوٹے سے کمرے میں لے گئی جو ڈرائینگ روم بھی تھا اور بیڈ روم بھی تھا۔ اس نے اوپر آتے ہی دیوار والی بتی بجھا کر ٹیبل لیمپ روشن کر دیا جس پر گہرے رنگ کا شیڈ پڑا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باہر سے کسی کو پتہ چلے کہ رات کے وقت کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر رابعہ نے پلنگ سے ایک تکیہ اٹھا کر میری طرف پھینکا اور انگریزی میں کہنے لگی "تم اس سامنے والے صوفے پر آرام کرو ---- ہم پلنگ پر سو جائیں گی" پھر سعدیہ سے کہا ----

"باقی ساری باتیں صبح ہوں گی"۔

اس کے بعد ٹیبل لیمپ بجھا دیا گیا۔ میں سخت تھکا ہوا تھا۔ صوفے پر گرتے ہی سو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو باہر کسی فوجی ٹرک کی آواز آرہی تھی۔ کمرے میں دن کی روشنی پھیلی تھی۔ رابعہ اور سعدیہ کمرے میں نہیں تھیں۔ مین جلدی سے اٹھا۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر نیچے دیکھا۔ ایک فوجی ٹرک ڈسپنسری کے سامنے درخت کے نیچے کھڑا

تھا۔ اس کا انجن چل رہا تھا۔ ایک جرمن فوجی ٹرک کا انجن بند کر کے باہر نکلا اور ڈسپنسری کی طرف بڑھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سعدیہ اوپر آئی۔ کہنے لگی ----

"نیچے ایک جرمن فوجی افسر آیا ہے۔ وہ ڈاکٹر رابعہ کے پاس قلعے کی میڈیکل سپلائی سے کچھ دوائیاں لا کر بیچ دیتا ہے۔ رابعہ اس کی مدد سے ہمیں جرمن قلعے کے اندر پہنچا دے گی"۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"۔

سعدیہ نے کہا ----

"بیٹھ جاؤ ---- میں تمہیں ساری بات سمجھاتی ہوں۔ رابعہ کو سارے معاملات کا علم تھا۔ وہ میرے ڈیڈی کو جرمنوں کی قید سے آزاد کرانے کے لئے میری ہر طرح مدد کرنا چاہتی ہے۔ مگر یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ افریقہ میں جنگ زوروں پر ہو رہی ہے۔ یہ سارا ساحلی علاقہ جرمنوں کے قبضے میں ہے۔ اس قلعے میں جرمنوں نے اسلحہ اور گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ یہاں سے بحری جہازوں میں آس پاس کے سمندر میں جرمن جنگی جہازوں کو اسلحہ سپلائی کیا جاتا ہے۔ قلعے پر سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ باہر سے کوئی چڑیا بھی اندر پر نہیں مار سکتی۔ لیکن میں قلعے میں داخل ہوئے بغیر اپنے باپ کو وہاں سے باہر نہیں نکال سکتی۔ لیکن یہ کام میں اکیلی نہیں کر سکتی۔ اگر تم میرے ساتھ رہو تو ایک بیٹی اپنے بدنصیب باپ کو موت کے منہ سے بچا سکتی ہے"۔

مین ویسے بھی سعدیہ کا احسان مند تھا۔ اس نے مجھے ایک جہنم سے نکالا تھا۔ دوسرے یہ ایک انسانی ہمدردی کا کام بھی تھا۔ میں نے کہا ---- "میں تمہارے ساتھ ہوں، تم یہ بتاؤ کہ ہم قلعے کے اندر کس طرح سے جائیں گے اور پھر تمہارے ڈیڈی کو وہاں سے کیسے نکال سکیں گے" سعدیہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"سکیم یہ ہے کہ ڈاکٹر رابعہ اپنے واقف کار جرمن فوجی سے ہمارا یہ کہہ کر تعارف کرائے گی کہ ہم دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ ہم شادی کے بعد یہاں ڈاکٹر رابعہ کے ہاں چھٹیاں گزارنے آئے تھے کہ علاقے پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب ہم

یہاں سے واپس مصر نہیں جاسکتے۔ ہمارے پاس جو تھوڑے بہت پیسے تھے وہ ختم ہو گئے ہیں۔ اگر ہمیں قلعے کے اندر کچھ کام مل جائے تو ہماری مشکل آسان ہو جائے گی اور ہم اپنا خرچ پورا کر سکیں گے"۔

میں نے سعدیہ سے کہا۔۔۔

"مگر ہم کیا کام کریں گے وہاں؟"۔

سعدیہ نے جواب دیا۔۔۔ میں نے ڈاکٹر رابعہ سے کہا ہے کہ جرمن فوجی افسر سے کہنا کہ ہم لانڈری کا کام جانتے ہیں۔ مصر میں بھی ہماری لانڈری کی دکان ہے"۔

میں نے کہا۔۔۔ مجھے کپڑے دھونے تو آتے ہیں مگر استری کرنے میں بالکل نہیں جانتا" سعدیہ بولی۔۔۔ "وہ میں تمہیں سکھا دوں گی"۔

"چلو یہ تو ہو جائے گا مگر سوال یہ ہے کہ قلعے کے اندر ہم تمہارے ڈیڈی تک کیسے پہنچیں گے اور پھر اتنے زبردست حفاظتی حصار میں اسے باہر کیسے لا سکیں گے؟"

سعدیہ نے بڑے پرعزم لہجے میں کہا۔۔۔

"یہ ہم قلعے کے اندر جا کر سوچیں گے"۔

ڈاکٹر رابعہ نے جرمن قلعے میں اپنا کچھ ایسا اعتماد بنایا ہوا تھا کہ اس کی سفارش پر مجھے اور سعدیہ کو وہاں لانڈری کا کام مل گیا۔ ہم دونوں کو صبح ایک فوجی ٹرک قلعے کے اندر لے جاتا اور شام کو ڈسپنسری میں چھوڑ جاتا۔ دوپہر کا کھانا ہم قلعے کے اندر فوجی کینٹین میں ہی کھاتے۔ ہمارا کام فوجی وردیاں، چادریں، میز پوش وغیرہ مشین میں ڈال کر انہیں دھونا، سکھانا اور پھر استری کرنا تھا۔ یہ کام میرے لئے بالکل نیا تھا۔ مگر سعدیہ نے مجھے سب کچھ سکھا دیا۔ ہمیں قلعے میں کام کرتے جب ایک ہفتہ گزر گیا تو سعدیہ نے کہا۔۔۔ "اب مجھے اپنے باپ کو قلعے میں تلاش کر کے اس کے پاس پہنچنا اور اسے وہاں سے باہر نکالنے کی سکیم پر عمل کرنا ہو گا"۔

ہم ڈاکٹر رابعہ کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ رابعہ کہنے لگی۔

"تم لوگوں کو سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہو گا کیونکہ اب تمہارے ساتھ میری زندگی کا بھی سوال ہے"۔

اس دوران ہم نے قلعے کے اندر جرمنوں پر اپنی ساکھ بنالی تھی۔ ہم نے اپنے رویئے سے یہ ثابت کیا تھا کہ ہم بڑے سیدھے سادھے ہیں، بھولے ہیں، ہمیں جنگ کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور محض اپنی روزی کمانے کے لئے وہاں کام کر رہے ہیں۔ ہم نے بڑی محتاط سراغ رسانی کر کے اتنا پتہ چلا لیا تھا کہ ایک فرانسیسی قوم پرست قیدی قلعے کے تہہ خانے میں بند ہے۔ ہم نے یہ بھی پتہ لگا لیا تھا کہ لانڈری روم سے آگے ایک کوریڈور ہے جہاں سے ایک زینہ نیچے تہہ خانے کو جاتا ہے۔ اب صرف کوئی ایسا بہانہ تلاش کرنا تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک تہہ خانے میں جاسکے۔ بہت جلد مجھے اس کا موقع مل گیا۔ ایک روز ایک جرمن افسر لانڈری روم میں آیا اور میری طرف انگلی سے اشارہ کر کے مجھے بلا کر کہنے لگا۔

"میرے ساتھ آؤ۔۔۔ نیچے سے میلے کپڑوں کا گٹھا اوپر لانا ہے"۔

سعدیہ نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں جرمن افسر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کوریڈور سے گزر کر وہ زینے کی طرف مڑا۔۔۔ میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔۔۔ ہم تہہ خانے کی طرف جا رہے تھے۔

نیچے تہہ خانے میں جا کر میں نے دیکھا کہ ایک نیم روشن لمبی راہ داری کے آمنے سامنے کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے دروازے لوہے کی موٹی سلاخوں کے تھے- ایک جرمن سپاہی وہاں چل پھر کر گارڈ ڈیوٹی دے رہا تھا- جرمن افسر مجھے ایک کوٹھڑی میں لے گیا جہاں پرانے کپڑوں کا ایک گٹھڑ پڑا ہوا تھا- میں نے اسے اٹھایا اور جرمن افسر کے پیچھے پیچھے واپس چل پڑا-

میں بڑے غور سے کوٹھڑیوں کا جائزہ بھی لے رہا تھا- کوٹھڑیوں میں دھیمی روشنی والے بلب جل رہے تھے- ایک کوٹھڑی میں ایک حبشی دیکھا جو فرش پر اوندھا پڑا تھا- زینے سے دو کوٹھڑیاں چھوڑ کر ایک کوٹھڑی میں میری نظر ایک بوڑھے آدمی پر پڑی جس کا رنگ گورا تھا- ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے- وہ دیوار سے ٹیک لگائے سر جھکائے بیٹھا تھا- یہ سعدیہ کے باپ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تھا- میں نے جان بوجھ کر اس کوٹھڑی کے سامنے کپڑوں کا گٹھڑا گرا دیا- جرمن افسر نے مجھے زور سے لات ماری اور برا بھلا کہنے لگا- میں نے جلدی سے گٹھڑ کو دوبارہ سر پر رکھ لیا- اس دوران کوٹھڑی میں بیٹھے بوڑھے قیدی کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیا- اس بوڑھے نے بھی سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا- اس کے چہرے پر موت کی زردی تھی- میں زینے پر چڑھنے لگا- لانڈری روم میں آ کر میں نے سعدیہ سے کوئی بات نہ کی- سعدیہ استری کر رہی تھی- جب تھوڑی دیر بعد ہم کمرے میں اکیلے رہ گئے تو میں دو چار سوکھی ہوئی چادریں لے کر سعدیہ کے پاس آیا اور اس کے کان کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا-

"میں تمہارے باپ کو دیکھ آیا ہوں"-

سعدیہ کا ہاتھ استری کرتے کرتے ایک لمحے کے لئے رکا- اس نے استری سیدھی کی اور کپڑے کو الٹتے ہوئے سرگوشی میں کہا-

"میرا ڈیڈی! میرا ڈیڈی!"-

"ہاں---- گھر جا کر بات کریں گے"-

کام ختم کر کے ہم فوجی ٹرک میں بیٹھ کر قلعے سے باہر نکلے تو ہم دونوں خاموش تھے- ڈاکٹر رابعہ کے کمرے میں آتے ہی سعدیہ بے تابی سے اپنے باپ کے بارے میں سوال کرنے لگی- میں نے کہا---- "تمہارا باپ زندہ ہے مگر اس کی حالت مردوں سے بدتر ہے"---- سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے- میں نے سعدیہ کو اس کے باپ کا حلیہ بتایا تو وہ بولی---- "ہاں! وہی میرا ڈیڈی ہے" اتنے میں رابعہ بھی اوپر آ گئی- میں نے اسے ساری روداد سنائی-

وہ بولی----

"تمہیں سب سے پہلے یہ تصدیق کرنی ہو گی کہ وہی بوڑھا قیدی سعدیہ کا باپ ہے"-

میں نے کہا---- "وہاں دوسرا کوئی گورا قیدی نہیں ہے"-

رابعہ کہنے لگی---- "پھر بھی تصدیق کئے بغیر تم لوگوں کو کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے"-

"مگر اس کی تصدیق کیسے ہو گی؟" میں نے سوال کیا----

سعدیہ کہنے لگی---- "میں یہ کام کر لوں گی"-

رات دیر تک ہم سعدیہ کے باپ کے بارے میں باتیں کرتے رہے- ڈاکٹر رابعہ نے رات کو ڈسپنسری میں میرے سونے کا انتظام کر دیا تھا- میں نیچے ڈسپنسری میں آ کر بڑے صوفے پر لیٹ گیا- رات کو سونے سے پہلے مجھے آسیبی عورت فائزہ کا ضرور خیال آ جاتا کہ کہیں وہ یہاں بھی نہ آ جائے- ابھی تک میں اس سے بچا ہوا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی تک اس نے میرے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی-

اگلے روز ہم معمول کے مطابق فوجی ٹرک میں بیٹھ کر قلعے کے اندر گئے اور اپنے کام میں لگ گئے---- بیچ میں سعدیہ کچھ دیر کے لئے غائب ہو گئی- جب واپس

آئی تو میرے پاس آکر بستر کی چادروں کو تہہ کرتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"تمہارا اندازہ ٹھیک ہے ---- وہ میرا ڈیڈی ہی ہے"۔

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ کون ایسی بیٹی ہو گی جس کی آنکھیں باپ کو بدحالی میں دیکھ کر اشکبار نہیں ہوں گی اور سعدیہ کو اپنے باپ سے بڑی محبت تھی۔ اس نے تو اپنے باپ کی جان بچانے کے واسطے اپنی جان کی بازی لگا دی ہوئی تھی۔

اب ہم نے دن رات اس بات پر غور کرنا شروع کر دیا کہ سعدیہ کے باپ کو قلعے سے باہر کیسے نکالا جائے۔ یہ کام بہت مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس کے لئے قلعے کے اندر اپنے کسی رازدار آدمی کا ہونا ضروری تھا جو ہماری مدد کرتا اور قلعے میں سب جرمن فوجی ہی تھے جو ہر وقت ہمارے سروں پر سوار رہتے تھے اور ہماری ہر حرکت کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ اس دوران کچھ مزید سویلین حبشی قیدی قلعے میں لائے گئے جن کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ یہ اتحادیوں کے لئے وہاں جاسوسی کرتے تھے۔ انہیں بھی تہہ خانے والی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد ڈاکٹر رابعہ کے دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ وہ کہنے لگی۔

"ہم صرف مردہ حالت میں سعدیہ کے باپ کو قلعے سے باہر لا سکتے ہیں"۔

ہم حیران ہو کر ڈاکٹر رابعہ کا منہ تکنے لگے۔ سعدیہ کو رابعہ کا یہ فقرہ ناگوار بھی لگا۔ مجھے بھی تعجب ہوا کہ ڈاکٹر رابعہ نے یہ کیا بات کہہ دی ہے۔ ڈاکٹر رابعہ نے ایک ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر ہمیں مطمئن رہنے کا اشارہ کیا اور بولی ----

دراصل مجھے اس طرح بات شروع نہیں کرنی چاہئے تھی۔ بہرحال ----

اب پوری توجہ سے میری بات سنو ---- جرمنوں کا یہ قلعہ کوئی معمولی سا مورچہ نہیں ہے۔ یہ ان کے اسلحے کا بہت بڑا گودام ہے۔ یہاں سے پورے جنوبی بحر اوقیانوس میں گشت کرنے والے جرمن جہازوں اور آبدوزوں کو اسلحہ اور تیل وغیرہ سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں جرمنوں نے سکیورٹی کا بڑا زبردست انتظام کر رکھا ہے۔ یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ میرے یقین دلانے پر تمہیں قلعے کے اندر جانے کی اجازت مل گئی ورنہ میں جب سے جرمنوں نے یہاں قبضہ کیا ہے دیکھ رہی ہوں کہ کبھی باہر کے کسی آدمی کو قلعے میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بات کو تو تم اپنے ذہن سے

نکال کر باہر رکھ دو کہ تم بدنصیب بوڑھے باپ کو زندہ حالت میں قلعے سے باہر نکال سکو گے"۔

سعدیہ نے رابعہ کی بات کاٹ کر پوچھا ----

"زندہ حالت سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تم جو کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔ میں جانتی ہوں تم ہماری خیر خواہ ہو"۔

ڈاکٹر رابعہ کے ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی۔ پیالی اس نے میز پر رکھ دی اور کہا۔

"میرے ذہن میں جو سکیم آئی ہے اسے غور سے سنو ---- اگر ہم اس سکیم میں صحیح ٹائمنگ کے ساتھ عمل کر سکے تو سعدیہ کا ڈیڈی اپنے آپ قلعے سے باہر آجائے گا"۔

سعدیہ نے بے چین ہو کر کہا ---

"پلیز رابعہ! گفتگو کو مزید مت الجھاؤ۔ ہمیں بتاؤ تمہاری سکیم کیا ہے؟"۔

رابعہ کہنے لگی ---- "میں تمہیں ایک چھوٹا سا کیپسول دوں گی کسی نہ کسی طریقے سے اپنے ڈیڈی تک پہنچانا ہو گا۔ کاغذ پر تم صرف ایک فقرہ لکھو گی اور وہ فقرہ یہ ہو گا۔ پیارے ڈیڈی! یہ کیپسول کھا لیں۔ اس کے بعد ہم آپ کو باہر نکال لے جائیں گے"۔

"اور ---- اس کیپسول میں کیا ہو گا؟"۔

سعدیہ نے تشویش کے انداز میں پوچھا ---- ڈاکٹر رابعہ بولی ----

"اس کیپسول میں ایک ایسی دوائی کا سفوف ہو گا جس کے کھانے سے تمہارا ڈیڈی بے ہوش ہو جائے گا۔ لیکن یہ بے ہوشی اتنی شدید ہو گی کہ ڈیڈی کے دل کی دھڑکن کو سٹیتھوسکوپ بھی محسوس نہ کر سکے گی۔ جرمنوں کو یقین ہو جائے گا کہ تمہارا ڈیڈی مر گیا ہے۔ وہ اس کی لاش کو قلعے کے پیچھے جنگل میں ایک جگہ گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دیں گے۔ جرمنوں نے ہاں بہت سے گڑھے کھود رکھے ہیں۔ جب کوئی قیدی ان کے تشدد کی تاب نہ لا کر مر جاتا ہے تو وہ اسے اسی جگہ جا کر گڑھے میں ڈال آتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ اس کے بعد ہم تمہارے ڈیڈی کو وہاں سے نکال

لائیں گے- میں انہیں ایک انجکشن لگادوں گی جس سے وہ ہوش میں آجائیں گے- یہ میری سکیم ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ صرف اسی ایک طریقے سے تم اپنے باپ کو قلعے کے جہنم سے نکال سکتی ہو"-

ڈاکٹر رابعہ کی سکیم بڑی خوفناک تھی- ہم ایک منٹ تک تو بالکل ہی خاموش رہے- سعدیہ بے چاری خالی خالی آنکھوں سے کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی ڈاکٹر رابعہ کو دیکھنے لگتی- میں نے سوال کیا-

"کیا گڑھے کی قبر میں دم گھٹنے سے ڈیڈی کی موت واقع نہیں ہو جائے گی؟

ڈاکٹر رابعہ نے اس کے جواب میں کہا---

"ایسی بات نہیں ہوگی- یہ بات میرے علم میں ہے کہ جرمن فوجی قیدیوں کی لاش کو گڑھے میں پھینکنے کے بعد اوپر صرف اتنی مٹی ڈالتے ہیں جس سے لاش اچھی طرح سے چھپ جائے- ان کے لئے کوئی باقاعدہ قبر نہیں بنائی جاتی- گڑھا بھی زیادہ گہرا نہیں ہوتا- گڑھے میں نرم مٹی کے نیچے بے ہوش آدمی کو اتنی آکسیجن ملتی رہتی ہے کہ وہ کم از کم چار چھ گھنٹوں تک جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھ سکے اور پھر ہم بھی تمہارے ڈیڈی کو قبر سے باہر نکالنے میں دیر نہیں کریں گے- اب کیپسول کو اپنے ڈیڈی تک پہنچانا اور اسے کھلانا یہ تمہارا کام ہے- اگر تم اس میں کامیاب ہو گئیں تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہارا باپ آزاد ہو کر زندہ حالت میں تم تک پہنچ جائے گا"-

سکیم تو ہماری سمجھ میں آگئی تھی مگر اس پر عمل کرنا سانپ کے منہ سے ہیرا نکالنے والی بات تھی- دو دن تو ہم اپنے اپنے طور پر ڈاکٹر رابعہ کی خطرناک سکیم پر غور ہی کرتے رہے- تیسرے روز سعدیہ نے یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا کہ "میں اس سکیم پر عمل کروں گی" میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا- میں نے سعدیہ سے کہا-

"میں تمہارے ساتھ ہوں"-

اب سوال یہ تھا کہ نیچے سعدیہ کے باپ کی کوٹھڑی میں کیپسول کیسے پہنچایا جائے- یہ کام بھی سعدیہ کو کرنا تھا کیونکہ اس کا باپ کسی دوسرے کے ہاتھ سے

کیپسول کبھی نہ کھاتا- وہ اپنی بیٹی پر ہی اعتبار کر سکتا تھا- اس کام کے لئے سعدیہ کی تہہ خانے تک رسائی بہت ضروری تھی- اس معاملے میں کچھ قدرت بھی ہماری مدد کر رہی تھی- میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ قلعے میں کچھ مزید قیدی آگئے ہوئے تھے- وہ بھی تہہ خانے والی کوٹھڑیوں میں بند تھے- ان کے کپڑے بھی دھلائی کے لئے اوپر لانڈری روم میں آنے لگے- اب ایک کی بجائے پرانے کپڑوں کے دو تھیلے مجھے تہہ خانے سے اوپر لانے پڑتے- مجھے ایک موقع مل گیا- جو جرمن افسر مجھ سے کپڑوں کا تھیلا اٹھوا کر لاتا تھا اس پر میں نے اپنی شرافت اور بھولپن کا کافی اثر ڈال رکھا تھا- ایک دن میں نے اسے کہا کہ سر! قیدیوں کے کپڑوں کے دو تھیلے مجھے باری باری نیچے سے اوپر لے جانے پڑتے ہیں- اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے آیا کروں- ایک تھیلا وہ اٹھا لیا کرے گی- جرمن فوجی نے مجھے اجازت دے دی- اب ہر چار پانچ دنوں کے بعد سعدیہ بھی پرانے کپڑے لے جانے میرے ساتھ تہہ خانے میں آنے لگی- وہ اپنے باپ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب تھی- پہلے دو پھیروں میں تو میں نے اسے اپنے باپ کی کوٹھڑی کے پاس جانے کی اجازت نہ دی- اب ایسا ہوا کہ جرمن فوجی کو ہم پر بھروسہ ہو گیا تھا چنانچہ وہ ہمارے ساتھ نیچے نہ آتا تھا- تیسرے پھیرے پر میں اور سعدیہ اکیلے ہی نیچے تہہ خانے میں آئے تہہ خانے کی راہ داری میں صرف جرمن سنتری ہی تھا جو چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا- وہ بھی ہمیں جانتا تھا چنانچہ ہمارے آنے پر وہ بے نیازی سے کونے میں جا کر سٹول پر بیٹھ جاتا اور سگریٹ سلگا لیتا- پرانے کپڑوں کی ڈھیری تیسری خالی کوٹھڑی میں لگی ہوتی تھی- ہم اندر جا کر کپڑوں کو تھیلوں میں ڈال کر انہیں اٹھا کر لانڈری روم میں آجاتے- تیسرے پھیرے پر میں نے سعدیہ کو اپنے باپ کو اپنی شکل دکھانے اور اس کی شکل دیکھنے کی اجازت دے دی لیکن اسے سختی سے تاکید کی کہ وہ جذبات میں نہ آجائے- باپ سے بات کرنے کی کوشش نہ کرے- ڈیوٹی پر موجود جرمن سپاہی کو اگر ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ تم نے کسی قیدی سے بات کی ہے یا تم اسے جانتی ہو تو ہم دونوں کو شوٹ کر دیا جائے گا- یا پھر ہمیں بھی ان کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جائے گا اور ہم پر اتنا تشدد ہو گا کہ ایک روز ہماری لاشیں بھی قلعے کے پیچھے والے گڑھوں میں دبا دی جائیں گی-

تاکید تو میں نے کر دی تھی مگر میں جانتا تھا کہ باپ بیٹی جب ایک دوسرے کو
دیکھیں گے تو یہ بڑا جذباتی لمحہ ہو گا ہو سکتا ہے دونوں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں
اور سارا راز فاش ہو جائے۔ میں دل میں بس خدا سے دعا ہی مانگ سکتا تھا مگر سعدیہ
ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ یورپ میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ وہ اپنے جذبات کو
اپنے قابو میں رکھنا جانتی تھی۔ ہم پرانے کپڑوں کے تھیلے اٹھائے کوٹھڑی سے باہر نکل
کر راہ داری میں آ گئے سوچی ہوئی سکیم کے مطابق میں تیز تیز قدموں سے پہلے ہی
سنتری کے پاس پہنچ گیا اور میں نے وہاں اس طرح تھیلا نیچے گرا دیا جیسے میں توازن
برقرار نہیں رکھ سکا۔ سنتری میری مدد کو میری طرف بڑھا۔ اس اثنا میں سعدیہ نے اپنی
گٹھڑی اپنے ڈیڈی کی کوٹھڑی کے آگے گرا دی تھی اور کپڑوں کو دوبارہ سمیٹتے ہوئے
اس نے اپنے باپ کو آہستہ سے آواز دی۔

سعدیہ نے بعد میں مجھے بتایا کہ بیٹی کی آواز سن کر بوڑھے شکستہ دل باپ نے
اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ سامنے دروازے کے جنگلے کے پاس اپنی پیاری بیٹی کا چہرہ دیکھا تو اٹھ
کر سلاخوں کے پاس آنے لگا۔ سعدیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دروازے کے
پاس آنے سے منع کیا اور فرانسیسی زبان میں صرف اتنا کہا--- خدا ہماری مدد کرے
گا اور تھیلا اٹھا کر ہماری طرف آ گئی۔ اس دوران اگرچہ میں نے جرمنی سنتری کو باتوں
میں لگائے رکھا تھا اور یہ ظاہر کرتا رہا تھا کہ تھیلا بھاری ہے---- جب سعدیہ مجھے
اپنی طرف آتی نظر آئی تو میں زینے کی طرف ہو گیا---

راہ دار میں نہ تو سعدیہ کی جذباتی آواز سنائی دی تھی نہ اس کے قیدی باپ کا
ہی کوئی ردعمل محسوس ہوا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو نہیں
دیکھا۔ ضرور سعدیہ کا باپ نیم بے ہوش پڑا ہو گا لیکن ہم لانڈری روم میں آئے تو مجھے
سعدیہ کا چہرہ بڑا جذباتی لگا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے میں نے آہستہ سے پوچھا---

"تم نے ڈیڈی کو دیکھا؟"۔

"ہاں" سعدیہ کی آواز ایسے آئی جیسے اس نے آہ بھری ہو۔ میں نے خدا کا
شکر ادا کیا کہ یہ قیامت کی گھڑی خیر خیریت سے گزر گئی۔ ورنہ یہ ہم دونوں کے لئے
موت کی گھڑی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد سعدیہ نے مجھ سے اس بارے میں

کوئی بات نہ کی۔ وہ پریشان پریشان سی رہی۔ شام کو ہم فوجی ٹرک میں بیٹھ کر واپس
آئے تو ڈاکٹر رابعہ ڈسپنسری میں کچھ مریضوں کو دیکھ رہی تھی۔ ہم اوپر والے کمرے
میں آ گئے سعدیہ کمرے میں آتے ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ مجھ سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میرے ڈیڈی کو بعد میں ہوش آ جائے گا؟"۔

میں نے کہا--- "ڈاکٹر رابعہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے میڈیسن پر اسے کافی
عبور حاصل ہے۔ اس کا تجربہ بھی بہت ہے۔ وہ یونہی تو تمہارے ڈیڈی کو کوئی دوا نہیں
دے سکتی۔ ویسے آخری فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔ ابھی وقت ہے سوچ لو"----
سعدیہ اضطراب کی کیفیت میں صوفے سے اٹھ کر کھڑکی تک گئی۔ پردہ ہٹا کر نیچے دیکھا۔
واپس آ کر صوفے پر بیٹھی اور بولی---

"میں اکیلی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری رائے چاہئے"۔

میں کیا رائے دیتا--- سعدیہ کے باپ کو جرمنوں کے عقوبت خانے سے
نجات بھی دلانی تھی۔ اس کی زندگی بھی بچانی تھی اور اوپر کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا
تھا۔ میں نے یہی مشورہ دیا کہ ہمیں ڈاکٹر رابعہ سے ایک بار پھر بات کر لینی چاہئے۔ کچھ
دیر بعد ڈاکٹر رابعہ کلینک بند کر کے اوپر آئی تو سعدیہ نے اسے اپنے باپ سے ملاقات کا
حال بھی بتا دیا اور اپنے شک و شبے کا اظہار بھی کر دیا۔

رابعہ کہنے لگی---

"سعدیہ! اتنا میں تمہیں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ میری دوائی کھانے سے
تمہارے ڈیڈی کی موت واقع نہیں ہو گی۔ وہ صرف بے ہوش ہو گا اور بظاہر یہی لگے
گا کہ وہ مر گیا ہے۔ یہ حالت اس پر صرف چھ گھنٹے طاری رہے گی۔ ہاں اگر گڑھے میں
دفن کر دینے کے بعد تم لوگوں نے دیر کر دی تو میں اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دے
سکتی۔ باقی تم خود سوچ لو"۔

سعدیہ نے جذباتی انداز میں رابعہ کا ہاتھ تھام لیا اور بولی---

"رابعہ! مجھے تم پر بھروسہ ہے"۔

اگلے روز جب ہمیں جرمنوں کی فوجی گاڑی رابعہ کے کلینک یا ڈسپنسری سے
اٹھا کر قلعے کی طرف چلی تو میری جیب میں دو بڑی اہم چیزیں رکھی تھیں۔ ایک ڈاکٹر

رابعہ کا دیا ہوا بے ہوشی کا کیپسول اور دوسرا اس کے گرد لپٹا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا جس پر سعدیہ کے ہاتھ سے فرانسیسی زبان میں صرف یہ جملہ لکھا تھا۔

"ڈیڈی! یہ کیپسول نگل لیں۔ خدا ہماری مدد کرے گا---- سعدیہ"۔

تہہ خانے میں قیدیوں کے پرانے کپڑے لینے ہمیں ہفتے میں دو بار جانا ہوتا تھا۔ میں نے کاغذ میں لپٹا ہوا کیپسول لانڈری روم کی ایک الماری میں کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا تھا۔ تین دن کے بعد جب ہم قیدیوں کے میلے کپڑے لینے نیچے تہہ خانے میں جانے لگے تو میں نے کیپسول الماری میں سے نکال کر سعدیہ کے حوالے کر دیا اور کہا----

"جلدی مت کرنا---- اگر موقع نہ مل سکا تو اسے واپس لے آنا۔ اگلی بار سہی"۔

سعدیہ نے کوئی جواب نہ دیا---- خاموشی سے کیپسول لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ ہم نیچے تہہ خانے میں آ گئے۔ کوٹھڑی میں پہلے تو کپڑے باندھ کر رکھے ہوئے تھے۔ اب ویسے ہی پھینک دیئے جاتے تھے۔ ہم خود انہیں گٹھڑیوں میں باندھتے تھے۔ یہ ہمارے حق میں اچھا ہی تھا۔ اس طرح ہمیں وہاں زیادہ دیر رہنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ جس کوٹھڑی میں سعدیہ کا باپ قید تھا وہ پیچھے ایک کوٹھڑی چھوڑ کر تھی۔ میں سکیم کے مطابق پہلے باہر نکل آیا---- جرمن سنتری زینے کے پاس سٹول پر بیٹھا تھا۔ اس نے سر دیوار سے لگا رکھا تھا۔ میں کپڑوں کے تھیلے کو راہ داری کے فرش پر گھسیٹتا ہوا اس کے پاس جا کر باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے مصری سگار پیش کیا جو اس نے بڑی خوشی سے لے لیا۔ میں اس کے سامنے اس طرح کھڑا تھا کہ وہ سعدیہ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں سعدیہ کو موقع دے رہا تھا کہ وہ کیپسول اپنے باپ تک پہنچا دے۔ سنتری کو میں زیادہ دیر باتوں میں بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے سعدیہ کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ کپڑوں کا بڑا تھیلا اٹھائے میرے قریب سے گزر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے اوپر جاتے زینے کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ سعدیہ اپنا کام کر چکی ہے۔

لانڈری روم میں آتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا اور گٹھڑی ایک طرف پھینکتے ہوئے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ سعدیہ نے آہستہ سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے"----

اس وقت سہ پہر کے پانچ بج رہے تھے۔ ہماری چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ مگر ہم ایک خبر کو سننے کے لئے وہیں موجود رہے اور کام کرتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد باہر راہ داری میں کسی فوجی کے تیز تیز قدموں سے چلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد کوئی آدمی دوڑتا ہوا گزر گیا۔ اتنے میں دروازہ کھلا---- ہمارے ساتھ جو افریقی لڑکا کام کرتا تھا وہ اندر آیا اس نے بتایا کہ تہہ خانے میں ایک قیدی نے خودکشی کر لی ہے۔ یہ قیدی سعدیہ کا باپ ہی ہو سکتا تھا۔ اب ہمیں یہ انتظار تھا کہ قیدی کی لاش کو جنگل میں دفنانے کے لئے کب قلعے سے باہر لایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہمیں اس لاش کو زندہ کر کے اپنے ساتھ لے جانا تھا۔

سعدیہ کے باپ کی حقیقت میں بے ہوشی اور بظاہر موت کی خبر قلعے میں ہمیں پورے چھ بجے ملی تھی۔ اسے ہم نے جو دوائی کھلائی تھی اس کا اثر چھ گھنٹے تک رہنا تھا۔ یعنی رات کے پورے بارہ بجے اسے ہوش میں آ جانا تھا۔ ہم نے ٹائم نوٹ کر لیا۔

اور کام ختم کر کے قلعے سے واپس آ گئے۔ ڈاکٹر رابعہ کو خبر کر دی کہ سعدیہ کے ڈیڈی کو کیپسول کھلا دیا گیا ہے۔ اور اس کی موت واقع ہو گئی ہے۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر ڈسپنسری کے سٹور میں گئی۔ وہاں ایک پرانا بیلچہ پڑا تھا۔ کہنے لگی۔۔۔۔

"اس بیلچے سے تمہیں قبر سے مٹی ہٹانی ہو گی"۔

سعدیہ نے پوچھا۔۔۔۔

"میرے ڈیڈی کو رات کے بارہ بجے ہوش آ جائے گا نا؟"۔

رابعہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"ضرور ہوش آ جائے گا۔ میں کوئی اناڑی ڈاکٹر نہیں ہوں۔ لیکن اسے بارہ بجے سے پہلے قبر میں سے نکال لانا ہو گا۔ وہ بوڑھا اور کمزور ہے۔۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ قبر کی گھٹن برداشت نہ کر سکے"۔

یہ سن کر سعدیہ تو پریشان ہو گئی۔ میں نے فوراً کہا۔۔۔۔

"ہم جلدی اسے قبر میں سے نکال لائیں گے"۔

میں نے بیلچہ اٹھا لیا۔ ہم اوپر والے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ رابعہ کہنے لگی۔۔۔۔

"تم ڈیڈی کو یہاں نہیں لاؤ گے۔ اس کے لئے میں نے جنگل میں ایک خفیہ تہہ خانے کا پہلے سے سوچ رکھا ہے۔ تم لوگ اسے جنگل میں قیدیوں کے قبرستان سے

نکال کر ایمبولینس تک لاؤ گے۔ میں ایمبولینس میں موجود ہوں گی۔ اس کے بعد ہم اسے خفیہ مقام پر لے جائیں گے"۔

پھر اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولی۔۔۔۔

"اب ہمیں ایک ایک منٹ کا حساب رکھنا ہو گا"۔

پھر اس نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں قلعے کے پیچھے جنگل میں جا کر چھپ جاؤں اور جیسے ہی جرمن سپاہی سعدیہ کے باپ کی لاش کو گڑھے میں دبا کر جائیں میں بیلچے سے مٹی کھود کر لاش کو باہر نکالوں۔ اسے درختوں میں کسی جگہ چھپاؤں اور واپس آ کر انہیں اطلاع کروں۔۔۔۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ سپاہی کس وقت اس کے باپ کی لاش کو گڑھے میں دبانے آتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر رابعہ ایمبولینس کو اتنی دیر تک جنگل میں کھڑی رہنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے بیلچہ ایک تھیلے میں ڈالا اور جنگل والے قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ جگہ ڈسپنسری سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر قلعے کے پیچھے درختوں میں آ کر چھپ گیا۔ میرے سامنے تھوڑے فاصلے پر مٹی کی دس بارہ ڈھیریاں لگی تھیں۔ یہ ان بدنصیب قیدیوں کی قبریں تھیں جو قلعے میں جرمنوں کے تشدد سے ہلاک ہو گئے تھے اور جنہیں یہاں گڑھوں میں ڈال کر اوپر قبریں بنا دی گئی تھی۔ میری نگاہیں اندھیرے میں قلعے کے بڑے دروازے کی طرف لگی تھیں جس کی بتی دور سے جلتی نظر آ رہی تھی۔ دل میں صرف ایک ہی پریشانی تھی کہ اگر جرمن سپاہیوں نے قیدی کی لاش قبرستان لانے میں دیر کر دی تو اسے وہیں ہوش آ جائے گا اور ہماری سکیم فیل ہو جائے گی اور پھر یہ حربہ ہم دوسری بار سعدیہ کے باپ پر آزما بھی نہ سکیں گے۔ جب میں ڈسپنسری سے چلنے لگا تو سعدیہ بھی اسی خیال سے فکرمند تھی۔ لیکن ہم اس سلسلے میں کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ حالات کو اتفاقات پر چھوڑ دیا تھا۔

ویسے میں اپنے دل میں خدا سے دعا ضرور مانگ رہا تھا کہ جرمن سپاہی لاش قلعے سے باہر نکالنے میں دیر نہ کریں اور ایک غم نصیب بیٹی کو اس کا بوڑھا باپ مل جائے۔ قلعے کے گیٹ کے اوپر جو بتی جل رہی تھی اس کی روشنی میں مجھے دو سپاہی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گیٹ کے آگے ٹہلتے ضرور نظر آ جاتے تھے۔ یہ فاصلہ دو

اڑھائی سو قدموں سے زیادہ نہیں تھا- مجھے درختوں میں بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ گزر گیا- میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا- قلعے کے گیٹ پر خاموشی طاری تھی- نہ کوئی اندر جا رہا تھا نہ قلعے کے اندر سے باہر آ رہا تھا- پہلے میں کبھی اس قسم کی ہیجانی کیفیت میں نہیں پڑا تھا- میں اٹھ کر درختوں کے نیچے اندھیرے میں ٹہلنے لگا- بار بار میری نظریں قلعے کے دروازے کی طرف اٹھ جاتیں-

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا- رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے اس کا مطلب تھا کہ سعدیہ کے قیدی باپ کے ہوش میں آنے میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا اور ابھی تک لاش کو قلعے سے باہر نکالنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے- مجھ پر مایوسی چھانے لگی- میں سمجھ گیا کہ جرمنوں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ قیدی کی لاش کو دن کے وقت قبرستان میں دفنایا جائے- میں حالت اضطراب میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا- اچانک مجھے فوجی جیپ کے ہارن کی آواز سنائی دی- میں نے چونک کر دور قلعے کے گیٹ کی طرف دیکھا- قلعے کے گیٹ میں سے ایک گاڑی باہر نکل رہی تھی- میں اس گاڑی پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا- گاڑی کا رخ قبرستان کی طرف تھا- میں جلدی سے پہلے درخت سے ہٹ کر پیچھے والے درخت کی اوٹ میں ہو گیا-

گاڑی جنگل کے ناہموار کچے راستے پر چلتی قبرستان میں قبروں کی ڈھیریوں کے پاس آ کر رک گئی- یہ ایک سٹیشن ویگن قسم کی فوجی گاڑی تھی- تین جرمن سپاہی گاڑی میں سے باہر نکلے- ان کے ہاتھوں میں بیلچے تھے- پیچھے جا کر انہوں نے گاڑی میں سے ایک انسانی لاش نکالی جو پرانے کپڑوں والے تھیلے میں بند تھی- لاش والے تھیلے کو انہوں نے ایک جگہ ڈال دیا اور زمین میں گڑھا کھودنے لگے- پورے گیارہ بجے گڑھے میں لاش ڈال کر اوپر مٹی بھر دی گئی-

اس کے بعد سپاہی فوجی گاڑی میں بیٹھ کر واپس قلعے کی طرف چلے گئے- ان کے جاتے ہی میں نے گھڑی دیکھی- سعدیہ کے قیدی باپ کی لاش کو ہوش میں آنے میں صرف پونہ گھنٹہ باقی تھا-

اب میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا- قبرستان اندھیرے میں خالی اور سنسان پڑا تھا- میں درختوں سے نکل کر قیدی کی قبر پر گیا اور بیلچے سے قبر کھودنی شروع

کر دی- تازہ تازہ مٹی پڑی تھی- مجھے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی- دس پندرہ منٹ کے بعد میں لاش کا تھیلا کاندھے پر ڈالے درختوں کی تاریکی میں آیا- تھیلے کا منہ رسی سے بند کیا ہوا تھا- میں نے جلدی سے رسی کھول دی- جھک کر غور سے دیکھا کہ کہیں یہ کسی دوسرے قیدی کی لاش تو نہیں اٹھا لایا- مگر ایسا نہیں تھا- میں نے سعدیہ کے باپ کو پہچان لیا- یہ اسی کی لاش تھی- میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا تو مجھے دل کی دھڑکن ذرا سی بھی محسوس نہ ہوئی، میں نے سوچا کہیں اس بے چارے کا سچ مچ ہی انتقال تو نہیں ہو گیا؟ میں نے لاش کو وہیں جھاڑیوں میں چھپایا اور اندھیرے میں ڈسپنسری کی طرف دوڑ پڑا-

ڈاکٹر رابعہ اور سعدیہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے- مجھے دیکھتے ہی سعدیہ نے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا میرے ڈیڈی زندہ ہیں؟ میں نے کہا----

"بالکل زندہ ہیں"-

ڈاکٹر رابعہ بولی----

"جلدی سے ایمبولینس میں بیٹھ جاؤ"-

میں اگلی سیٹ پر ڈاکٹر رابعہ کے ساتھ بیٹھ گیا- میں نے دبی زبان میں کہا کہ قیدی کے دل کی دھڑکن محسوس نہیں ہو رہی- وہ انجن سٹارٹ کرتے ہوئے بولی----

"اگر دل کی دھڑکن محسوس ہو جاتی تو جرمن اسے کبھی مردہ سمجھ کر قبرستان میں نہ پھینکتے"-

ایمبولینس تیز رفتاری سے قبرستان کی طرف جا رہی تھی- زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا- تھوڑی ہی دیر میں قبرستان کے پیچھے والے درختوں کے پاس ایمبولینس رک گئی- ہم جلدی جلدی گاڑی سے نکلے- میں انہیں جھاڑیوں میں لے آیا- یہاں لاش تھیلے میں بند پڑی تھی- صرف منہ کی طرف سے تھیلا کھلا تھا- ڈاکٹر رابعہ نے اسی لمحے سٹیتھو سکوپ نکال کر لاش کا معائنہ کیا- سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ یاس و امید کے دوراہے پر کھڑی اپنے باپ کے چہرے کو تک رہی تھی جو رات کی تاریکی میں دھندلا اور زرد دکھائی دے رہا تھا- رابعہ نے سٹیتھو سکوپ جیب میں ڈالی جلدی سے

سرنج نکال کر قیدی کی لاش کو انجکشن لگایا اور میری طرف دیکھ کر کہا---

"اسے فوراً ایمبولینس میں ڈالو"۔

سعدیہ کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ڈاکٹر رابعہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا---

"تمہارا باپ زندہ ہے"۔

یہ بہت بڑی خوشخبری تھی سعدیہ کے لئے---اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہم نے لاش والے تھیلے کو ایمبولینس میں ڈال دیا۔ رابعہ نے کہا---

"میں نے جو انجکشن دیا ہے اس کا اثر ایک گھنٹے تک رہے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ سعدیہ کے باپ کو مزید ایک گھنٹے بعد ہوش آئے جب تک کہ ہم اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں"۔

ایمبولینس ڈاکٹر رابعہ خود چلا رہی تھی۔ جنگل میں سے نکل کر گاڑی رات کی تاریکی میں ٹیلوں کے درمیان چلی جا رہی تھی کہ اچانک ایک موڑ مڑتے ہوئے سڑک پر دو جرمنی سپاہی نمودار ہوئے اور انہوں نے ایمبولینس روکنے کا اشارہ کیا۔ ایک سپاہی نے رائفل تان رکھی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں ٹارچ روشن تھی۔ ہم سب کے رنگ اڑ گئے۔

دونوں فوجی ہماری ایمبولینس کی طرف بڑھے---

ایک فوجی رائفل تان کر ذرا پیچھے کھڑا ہو گیا دوسرا ہمارے قریب آیا۔ میں اور ڈاکٹر رابعہ گاڑی کی اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سعدیہ پیچھے اپنے بے ہوش باپ کے سرہانے بیٹھی تھی۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی تھی کہ ہم نے سعدیہ کے باپ کو تھیلے سے نکال کر ایمبولینس کے اندر ڈالا تھا۔ ورنہ اس تھیلے کو جرمن فوجی صاف پہچان لیتے کہ یہ قلعے میں لاشیں ڈالنے والا تھیلا ہے۔ جرمنی فوجی نے ہم پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور جرمن زبان میں پوچھا کہ ہم کون ہیں۔ کدھر جا رہے ہیں؟

ڈاکٹر رابعہ نے بغیر کسی گھبراہٹ کے بڑے سکون کے ساتھ کہا---

"میں ڈاکٹر ہوں--- میرے باپ کو دورہ پڑا ہے۔ ہم اسے شہر کے ہسپتال لے جا رہے ہیں"۔

فوجی نے ایمبولینس کا دروازہ کھلوا کر سعدیہ اور اس کے بے ہوش باپ پر روشنی ڈال کر دیکھا۔ جب اس کی تسلی ہو گئی تو ہمیں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رابعہ نے چھوٹی سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے کہا---

"اگر سعدیہ کے باپ شارل کو ہم نے تھیلے میں ہی ڈال رکھا ہوتا تو پھنس گئے تھے"۔

میں نے پوچھا---

"ابھی ہمیں کتنی دور جانا ہے؟"۔

"بس پہنچنے والے ہیں"۔

ایک جگہ مجھے بائیں جانب سمندر کی کھاڑی کا پانی تاروں کی روشنی میں چمکتا دکھائی دیا۔ یہاں سمندر کنارے کو کاٹ کر اندر آگیا تھا اور اس نے نصف دائرے میں ایک جھیل سی بنالی تھی۔ ہماری گاڑی کھاڑی کے پہلو میں پام اور ناریل کے درختوں کے نیچے چلی جا رہی تھی۔ پھر اس نے دو تین موڑ گھومے اور ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ اس کے بعد اترائی آگئی۔ یہاں ایک جھونپڑی کے باہر لالٹین جل رہی تھی۔ ڈاکٹر رابعہ نے جھونپڑی کے آگے گاڑی روک دی۔ گاڑی کی آواز پر جھونپڑی میں سے ایک بوڑھا حبشی آنکھیں ملتا باہر نکل آیا۔ رابعہ نے وہاں کی مقامی زبان میں اس سے کوئی بات کی۔ وہ آگے کو دوڑ پڑا۔ ہماری گاڑی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

آگے ایک احاطے کا گیٹ تھا۔ بوڑھے حبشی نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی احاطے میں آکر ایک طرف رک گئی۔

یہ ایک بیرک نما عمارت تھی جس پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ حبشی نوکر نے بیرک میں جا کر ایک کمرے کی بتی جلا دی۔ ہم سعدیہ کے باپ شارل کو سٹریچر پر ڈال کر کمرے میں لے آئے۔ یہ کمرہ کسی کلینک کی طرح تھا۔ الماری میں دوائی کی شیشیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک لوہے کی لمبی میز تھی۔ سعدیہ کے باپ کو اس میز پر لٹا دیا گیا۔ حبشی نوکر پانی گرم کرنے لگا، ہم قریب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر رابعہ نے سعدیہ کے باپ بوڑھے شارل کو ایک اور انجکشن دیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سعدیہ باپ

سے لپٹ گئی- یہ منظر بڑا رقت انگیز تھا-

بوڑھے شارل کو تکیئے کے سہارے بٹھا دیا گیا- اسے کافی پلائی گئی- اب وہ پوری طرح سے ہوش میں آ چکا تھا- اگرچہ قلعے کی قید میں رہ کر بے حد کمزور ہو گیا تھا اس نے اپنی بیٹی کو شفقت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا---

"بیٹی! جب میں نے تمہیں پہلی بار قلعے میں دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا"-

ڈاکٹر رابعہ تے کہا---

"انکل! اب آپ آرام کریں- آپ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے- باقی ساری باتیں صبح کو ہوں گی"-

بوڑھے شارل کو وہیں آرام سے لٹا کر ہم لوگ دوسرے کمرے میں آ گئے- رات کافی گزر چکی تھی- ہم وہیں ادھر ادھر پڑ کر سو گئے- صبح کافی دن نکل آیا تھا جب میری آنکھ کھلی- میں نے دیکھا کمرے میں سعدیہ اور اس کی ڈاکٹر سہیلی نہیں تھی- میں دوسرے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ سعدیہ اور ڈاکٹر رابعہ بوڑھے شارل کے پاس بیٹھی ناشتہ کروا رہی تھیں- میں بھی کرسی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گیا- اس دوران سعدیہ اپنے باپ شارل کو ساری داستان سنا چکی تھی- بوڑھے شارل نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور میرا شکریہ ادا کرنے لگا-

ڈاکٹر رابعہ نے جنگل کے اس خفیہ مقام پر شارل کا علاج معالجہ شروع کر دیا- میں اور سعدیہ اسی روز ڈسپنسری میں واپس آ گئے تھے- ہمیں قلعے میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا- اس ڈیوٹی کی اہمیت اب ختم ہو گئی تھی- قلعے میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ جس قیدی کو مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا تھا وہ اسی جنگل کی ایک بیرک میں زندہ حالت میں موجود ہے- ڈاکٹر رابعہ دن میں ایک بار شارل کے باپ کو دیکھنے ضرور جاتی- وہ اب پوری طرح صحت مند ہو گیا تھا- میں اور سعدیہ مل کر سوچنے لگے کہ اب آگے ہمیں کیا کرنا ہے- سعدیہ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے باپ کو پیرس نہیں لے جا سکتی- کیونکہ فرانس پر جرمنی کا قبضہ ہے- میں نے کہا---

"تم یہاں بھی اپنے باپ کو لے کر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتیں- اگر یہ راز کھل

گیا تو ڈاکٹر رابعہ بھی ہمارے ساتھ ہی ماری جائے گی"-

سعدیہ نے کچھ سوچ کر کہا---

"میں چاہتی ہوں، ڈیڈی کو قاہرہ لے جاؤں مصر اتحادیوں کے زیر اثر ہے- وہاں ہمارا پرانا گھر بھی ہے"-

سعدیہ کی تجویز بڑی معقول تھی--- مگر مصر پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا- چاروں طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے- شمالی افریقہ خاص طور پر الجزائر سے لے کر طبروق تک جنگ کی لپیٹ میں تھا- ہمیں پورے وسطی افریقہ کے جنگلوں میں سے گزرنا پڑتا تھا جو بڑے جان جوکھوں کا کام تھا- سعدیہ کا بوڑھا باپ اس دشوار گزار سفر کو برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا- کافی سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ جب تک کوئی معقول تجویز سامنے نہیں آتی شارل کو اسی محفوظ مقام پر رکھا جائے- ہم نے قلعے کی نوکری چھوڑ دی تھی- میں اور سعدیہ ہم دونوں جنگل والی بیرک میں سعدیہ کے باپ کے پاس ہی آ گئے تھے- ڈاکٹر رابعہ ہفتے میں دو بار ہمارے پاس آ کر جنگ کی صورتحال سے آگاہ کر جاتی تھی- جنگ کی صورتحال یہ تھی کہ شمالی افریقہ کے محاذ پر جرمن فوجیں پے در پے شکستوں کے بعد پیچھے ہٹنا شروع ہو گئی تھیں- ادھر روس اور یورپ کے محاذوں پر بھی جرمنوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا- ڈاکٹر رابعہ کا خیال تھا کہ جرمن عنقریب افریقہ خالی کر جائیں گے- ہماری گمنام بیرک کے پیچھے چھوٹا سا ویران باغیچہ تھا- سعدیہ کے باپ نے یہاں گھاس وغیرہ صاف کر کے کچھ پودے اگا دیئے تھے وہ دن بھر باغیچے کی آرائش میں مصروف رہتا- ایک مہینہ گزر گیا جنگ بڑے زوروں پر تھی- شمالی افریقہ میں جرمن ابھی تک لڑ رہے تھے- الجزائر سے لے کر مراکش تک بحیرہ روم کے ساحل پر جرمنوں کا قبضہ تھا- سعدیہ مایوس ہو گئی تھی- کہنے لگی---

"یہ جنگ بڑی لمبی ہو جائے گی- جرمن افریقہ خالی نہیں کریں گے اور ہمارے ساتھ یہ ہو گا کہ ہم ایک دن پکڑ لئے جائیں گے- یہاں کوئی بھی ہماری جاسوسی کر سکتا ہے"-

میرے دل میں بھی اسی قسم کے خیال آتے مگر اوپر اوپر سے میں اسے تسلی

دیتا۔ سعدیہ کے باپ کی حالت نارمل نہیں تھی۔ جرمنوں کی قید میں مسلسل اذیتیں اٹھانے سے وہ زیادہ دیر گم سم بیٹھا رہتا تھا۔ ہم جنگ پر تبصرہ کرتے تو وہ ہماری طرف خالی خالی نظروں سے تکتا رہتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ جملہ بولتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ اس سے کوئی مشورہ نہیں لیا جا سکتا تھا۔

سعدیہ کے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا کہ وہ اور اس کا باپ پکڑے جائیں گے۔ وہ کئی بار اس خدشے کا اظہار کر چکی تھی کہ حبشی نوکر جرمنوں کے آگے ان کی مخبری کر دے گا، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ایک دن کہنے لگی۔۔۔

"ہم ڈاکٹر رابعہ کو بتائے بغیر یہاں سے چل پڑتے ہیں۔ ہم افریقہ کے جنگل عبور کر لیں گے"۔

میں نے کہا۔۔۔

"افریقہ میں جنگل ہی نہیں صحرا بھی آتے ہیں جہاں سینکڑوں میل تک ریت ہی ریت ہے"۔

وہ بولی۔۔۔

"آخر ہم یہاں کب تک خطرے کی حالت میں پڑے رہیں گے؟" میں نے سعدیہ کو تسلی دی"۔

"بہت جلد کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ اس طرح گھبرا کر ہمیں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے"۔

لیکن قدرت ہمارے معاملے میں فیصلہ کر چکی تھی۔ رات کا ایک بجا تھا کہ باہر گاڑی آ کر رکی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ ڈاکٹر رابعہ گھبرائی ہوئی کمرے میں آئی اور بولی۔

سعدیہ اور اس کا باپ کہاں ہے؟ انہیں جگاؤ، کسی نے مخبری کر دی ہے۔۔۔ جرمن سپاہی تم لوگوں کی تلاش میں ہیں۔ یہاں سے جلدی نکل چلو"۔

ساتھ والے کمرے میں سعدیہ اور اس کا باپ سو رہے تھے۔ جلدی جلدی انہیں جگایا گیا۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھے اور رات کی تاریکی میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

باقی ساری رات ہماری گاڑی ہیبت ناک درختوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان سفر کرتی رہی۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ مگر زمین ناہموار تھی۔ جگہ جگہ اونچی اونچی گھاس اور جنگلی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی ایک گہرے خشک نالے کے کنارے کچی سڑک پر جا رہی تھی۔

سعدیہ اور اس کا باپ گاڑی کے پیچھے سو رہے تھے۔ میں اور رابعہ اگلی سیٹوں پر تھے۔ رابعہ گاڑی چلاتے چلاتے تھک گئی تھی۔ میں نے سٹیرنگ پر بیٹھنا چاہا تو وہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔۔۔

"تمہیں نہیں معلوم ہمیں کہاں جانا ہے"۔

میں نے پوچھا۔۔۔

"ہمیں جانا کہاں ہے؟"۔

ڈاکٹر رابعہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم نالے کے پل پر سے گزر کر ایک چٹانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہاں سلیٹی رنگ کی چھوٹی بڑی چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک چٹان کے قریب رابعہ نے گاڑی روک دی۔ قریب ہی ایک پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا۔ رابعہ اپنے ساتھ سینڈوچز اور کافی کی تھرمس بھر کر لائی تھی۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ بوڑھا شارل خالی خالی نظروں سے ہمیں تک رہا تھا۔ پہلے وہ پھر بھی کوئی بات کر لیتا تھا مگر اب اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ سعدیہ اپنے باپ کی اس حالت سے الگ پریشان تھی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم آگے چل پڑے۔ ڈاکٹر رابعہ نے ہمیں صرف اتنا بتایا کہ دریا پار ایک چھوٹا سا فارم ہے جو ایک بیوہ مسلمان افریقی عورت سفاریہ کی ملکیت ہے۔ یہ بیوہ عورت ڈاکٹر رابعہ کی بڑی اچھی

دوست تھی۔ ہمیں اسی فارم میں جا کر پناہ حاصل کرنی تھی۔ میں نے سوال کیا کہ اس کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟

رابعہ کہنے لگی۔۔۔۔

"سفاریہ بڑے اثر ورسوخ والی عورت ہے۔ اگر تم لوگوں کا پروگرام مصر جانے کا ہے تو سفاریہ تمہارے واسطے اس کا بندوبست بھی کر دے گی"۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ سفاریہ کیا انتظام کرے گی۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی سفر نہیں تھا۔ ہزاروں میل کا سفر تھا۔ راستے میں وحشی قبائل کے جنگل اور لق و دق بھیانک صحرا بھی پڑتے تھے۔ بہرحال میں خاموش رہا۔ میں بھی ان کے ساتھ اچھے برے حالات کے دھارے پر بہا جا رہا تھا۔ ہم دریا پار کر کے افریقی مسلمان خاتون سفاریہ کے فارم پر پہنچ گئے۔

سفاریہ ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم سیاہ فام عورت تھی جس نے خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ رابعہ نے مختصر الفاظ میں ہمارا تعارف کرایا اور سارے واقعات بیان کر دیئے۔ سفاریہ نے ہنس کر کہا۔۔۔۔

"کوئی فکر کی بات نہیں۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ادھر جرمنوں کی آمد روفت نہ ہونے کے برابر ہے"۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم سب سو گئے۔ تھکے ہوئے تھے۔ دن کے سوئے شام کو اٹھے۔ سفاریہ نے کھانے کا بڑا پر تکلف اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس فارم پر اس نے اپنے لئے ایک چھوٹا سا مکان بنوا رکھا تھا جس میں ایک الگ مہمان خانہ تھا۔ ہم اسی مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ نوکروں کے لئے الگ کوارٹر تھا۔ تین چار خادمائیں بھی تھیں۔ رات کو کھانے کے بعد ہمارے لئے کافی آئی تو ڈاکٹر رابعہ نے سفاریہ سے پوچھا کہ کیا اس بات کا امکان ہے کہ یہ لوگ کسی طرح خشکی کے راستے سفر کرتے مصر تک پہنچ جائیں؟

سفاریہ کا بھاری بھرکم چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

میں اور سعدیہ قریب ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ بوڑھا شارل دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ سفاریہ نے کہا۔۔۔۔

"اگر یہ لوگ سفر کی صعوبتیں برداشت کر لیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ سنٹرل افریقہ کے دو ملک یعنی نائیجیریا اور چاڈ سے گزر کر سوڈان میں داخل ہوں گے۔ یہ بڑا لمبا اور کٹھن سفر ہے۔ سوڈان کی شمالی سرحد مصر کی سرحد سے ملتی ہے۔ وہاں سے یہ مصر میں داخل ہو سکیں گے"۔

رابعہ نے سفاریہ سے پوچھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہے۔ اس افریقی خاتون نے کہا۔۔۔۔

"ہمارے قصبے کی گھاٹ پر ہفتے میں ایک بار کھانے پینے کا سامان اور مٹی کا تیل لے کر آتا ہے۔ اسٹیمر کا مالک جیکی میرا بھانجہ ہے۔ وہ تم لوگوں کو نائیجیریا کی سرحد پار کرا دے گا اور میری وجہ سے آگے ایسے آدمیوں کے حوالے کر دے گا جو تمہیں ملک چاڈ پہنچا دیں گے۔ یہاں سے سوڈان میں داخل ہونا تم لوگوں کا کام ہو گا۔ بس میں اتنا کچھ ہی کر سکتی ہوں"۔

یہ بہت کچھ تھا۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔

"لیکن کیا بوڑھا شارل سفر کی تکلیفیں برداشت کر لے گا؟"۔

ڈاکٹر رابعہ نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔۔۔۔ سعدیہ کہنے لگی۔

"اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے ڈیڈی اس وقت ذہنی طور پر کچھ پریشان ہیں لیکن وہ بڑے سخت جان ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ سفر کی تکلیفیں سہہ جائیں گے"۔

جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ہمیں اسی طرح افریقہ کے جنگلوں، میدانوں اور صحراؤں میں سے سفر کرتے ہوئے ہی مصر تک پہنچنا ہو گا تو سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ڈاکٹر رابعہ نے سعدیہ کی بڑی مدد کی۔ سارے اخراجات وہ خود اٹھا رہی تھی۔ سہیلی ہو تو ایسی ہو۔ مشکل کے وقت وہ سعدیہ کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے ہمیں کچھ امریکی ڈالر اور برطانوی پاؤنڈ بھی دیئے جنہیں ہم نے سنبھال کر رکھ لیا۔ سفاریہ نے کہہ دیا تھا کہ اس کا بھانجہ جیکی ہم سے نائیجیریا تک کا سٹیمر کا کرایہ وصول نہیں کرے گا۔ رابعہ ہمیں سفاریہ کے حوالے کر کے ہم سے جدا ہو گئی۔ تیسرے دن سٹیمر گھاٹ پر آ کر لگا تو سفاریہ نے ہمیں اپنے بھانجے اور سٹیمر کے مالک اور کپتان جیکی کے

سپرد کر دیا- جیکی مضبوط قد کاٹھ کا حبشی تھا- شکل ہی سے وہ جرائم پیشہ لگتا تھا- سفاریہ نے اسے ہماری بابت سب کچھ سمجھا دیا تھا- جیکی عربی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں خوب بول لیتا تھا- ہندوستانی پر بھی اسے عبور حاصل تھا کیونکہ اس علاقے میں برصغیر کے بے شمار لوگ کاروبار کرتے تھے- جیکی ہمیں سٹیمر کے نیچے جو ایک علیحدہ کیبن بنا ہوا تھا وہاں لے گیا- بوڑھے شارل کو تو اس نے اوپر برتھ پر لیٹا دیا- ہمیں اس نے کافی پلائی اور ضروری باتیں ہمیں سمجھانی شروع کر دیں---- کہنے لگا----

"ابھی ہمارا اسٹیمر جس ملک میں ہے اس پر جرمنوں کا قبضہ ہے- یہ لوگ بڑے ظالم ہیں- مفرور قیدیوں کو تو وہیں گولی مار دیتے ہیں- تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا- اس لئے تمہیں بڑی سختی سے میری ہدایات پر عمل کرنا ہو گا- دریا میں سرحد تک جرمنوں کے گن شپ سٹیمر گشت لگاتے رہتے ہیں- تمہیں اپنے آپ کو نوکر ظاہر کرنا ہو گا- بوڑھے کو میں بیمار مسافر بتاؤں گا- تم سوائے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی کے اور کسی زبان میں بات نہیں کرو گے باقی میں سنبھال لوں گا"-

جیکی نے ہمیں سٹیمر کے نوکروں ایسے کپڑے پہنا دیئے تھے- سعدیہ نے قمیض کے اوپر ایپرن باندھ لیا تھا- جیسے وہ باورچن ہو- میں سٹیمر کے اوپر والے ڈیک کی ایک طرف آلو چھیلنے بیٹھ گیا- گھاٹ پر مال اتارنے اور لادنے کے بعد سٹیمر دریا کی لہروں پر بہاؤ کے رخ پر روانہ ہو گیا- یہ چھوٹا سا سٹیمر تھا اور ڈیزل سے چلتا تھا- اس کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی- راستے میں جیکی سواریاں بھی بٹھاتا رہا- ہر آدھے گھنٹے بعد سٹیمر دریا کنارے کسی نہ کسی گھاٹ پر تھوڑی دیر کے لئے رکتا---- پرانی سواریاں اتار کر نئی سواریاں بٹھاتا- ان سے کرایہ وصول کرتا اور آگے چل پڑتا- دوپہر کو اس نے ہمیں مچھلی چاول کھلائے تھے- کہنے لگا----

"اس دریا کی مچھلی سارے افریقہ میں مشہور ہے"-

مچھلی سعدیہ نے پکائی تھی- جو بڑی لذیذ تھی- جوں جوں سٹیمر آگے بڑھ رہا تھا اور سرحد قریب آ رہی تھی ہماری بے چینی بھی بڑھ رہی تھی- رات کے وقت جیکی نے ایک جگہ سٹیمر کھڑا کر دیا- یہ رات ہم نے وہیں بسر کی- دوسرے دن صبح صبح ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا- پہلے تو دریا کی دونوں جانب جنگل نظر آتے تھے- اب مکان

بھی نظر آنے لگے- جیکی نیچے انجن روم میں گیا ہوا تھا- میں اور سعدیہ سٹیمر کے ڈیک پر جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے کہ ہماری نظر ایک دوسرے سٹیمر پر پڑی جو دریا میں سامنے کی طرف سے آ رہا تھا- اس کی رفتار تیز تھی- سعدیہ نے اس پر لہراتا ہوا جھنڈا دیکھ لیا- وہ گھبراہٹ میں میرا بازو کھینچ کر نیچے کی طرف دوڑی- جرمن پٹرول بوٹ تھی- ہم نے نیچے جا کر جیکی کو بتایا تو اس نے اوزار وہیں پھینکے اور ہمیں کیبن میں رہنے کی ہدایت کر کے اوپر چلا گیا- سعدیہ کا باپ اوپر والی برتھ پر بیٹھا کیبن کی چھت کو تک رہا تھا- اب وہ کسی سے بات ہی نہیں کرتا تھا-

جرمن گن بوٹ کی آواز قریب آ رہی تھی- پھر یہ آواز ہمارے بہت قریب آ گئی- کسی نے جرمن زبان میں کچھ کہا- اس کے جواب میں جیکی نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا کہ میں سامان لے کر دوسرے گاؤں جا رہا ہوں- اوپر بھاری فوجی جوتوں کے چلنے کی آواز آئی- پھر جیسے مزید دو تین سپاہی کود کر سٹیمر کے ڈیک پر آ گئے- اس کے ساتھ کسی نے لات مار کر ہمارے کیبن کا دروازہ کھول دیا- دو جرمن سپاہی رائفلیں تانیں کیبن میں گھس آئے- ہمیں دیکھ کر وہ وہیں رک گئے- ایک نے جرمن زبان میں پوچھا---- کون ہو---- سعدیہ نے ہندوستانی میں کہا ہم سرونٹ ہیں- دوسرے سپاہی نے اوپر برتھ پر بیٹھے سعدیہ کے باپ کی طرف دیکھا- چشم زدن میں رائفل کی نالی اوپر کو اٹھی- فائر کا دھماکہ ہوا- سعدیہ کی چیخ بلند ہوئی اور بوڑھا شارل خون میں لت پت برتھ پر سے نیچے گر پڑا- یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ میں بھی سکتے میں آ گیا- سعدیہ باپ کی طرف لپکی جرمن سپاہی اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اوپر لے چلا- دوسرے نے رائفل کے اشارے سے مجھے بھی اوپر چلنے کو کہا---- سعدیہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی- وہ رو رہی تھی- جرمن سپاہی اسے کھینچے لئے جا رہا تھا- ہمیں سٹیمر سے جرمن گن بوٹ میں لے جا کر الگ الگ بند کر دیا گیا-

ہم ایک بار پھر جرمنوں کی قید میں تھے- میرا خیال تھا کہ جرمنوں نے ہمیں پکڑا ہے تو ہم پر تشدد کریں گے- پوچھ گچھ کریں گے- خدا جانے کیسی کیسی اذیتیں دیں گے- مگر انہوں نے ہمیں ہاتھ تک نہ لگایا- بس اتنا ہی کیا کہ دوسرے دن شام کے

وقت مجھے اور بے چاری سعدیہ کو قید سے نکال کر ایک ٹیلے کی چوٹی پر لے گئے اور فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ سعدیہ کا رنگ بھی زرد پڑ گیا تھا۔ صرف چند سیکنڈ کی زندگی باقی تھی۔ پانچ جرمن فوجی کوئی پندرہ قدم کے فاصلے پر رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ وہ بار بار پیچھے ٹرک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں اپنے کسی آفیسر کا انتظار تھا جس کے سامنے ہمیں گولیوں سے اڑایا جانا تھا۔ انھوں نے ابھی تک نہ ہمارے ہاتھ باندھے تھے، نہ ہماری آنکھوں پر پٹی ہی باندھی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق کی بات تھی کہ ان کا کوئی فوجی عہدیدار پیچھے ٹرک میں بیٹھا رہ گیا تھا ورنہ اسی وقت ہمیں گولی مار دی جاتی۔ میں نے پیچھے نظر ڈالی۔ ٹیلے کی دوسری جانب نیچے کافی گہرائی میں ایک دریا بہہ رہا تھا۔ میں نے گھبراہٹ میں سعدیہ کو کہا کہ کود جاؤ۔

سعدیہ پہلے ہی یہی سوچ رہی تھی۔ میرے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ اس نے پہلو بدل کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی کود گیا۔ ہم دریا میں جا گرے۔ اوپر سے ہم پر گولیاں فائر ہونے لگیں۔ قسمت اچھی تھی۔ زندگی باقی تھی کہ کوئی بھی گولی ہمیں نہ لگی۔ دریا یہاں گہرا تھا۔ میں ایک بار تو پانی کی تہہ میں جا لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہاں چٹانیں اور پتھر نہیں تھے ورنہ میرا بچنا محال تھا۔ میں پانی کے اندر ہی اندر ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ یہاں دریا کا بہاؤ بھی بڑا تیز تھا۔ اس نے مدد بھی کی۔ میں چند سیکنڈ میں بہت آگے نکل گیا۔ ابھی تک مجھے سعدیہ کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ دریا میں گری ہے کہ باہر کنارے پر گر کر مر گئی ہے۔ ذرا آگے جا کر دریا پہاڑی کا موڑ گھوم گیا۔ یہاں دریا کی لہریں بڑی تیز تھیں۔ میں کافی آگے نکل گیا۔ دریا کا پاٹ چوڑا ہوتا گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے دو تین بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر سعدیہ کا سر دریا کی سطح پر باہر نکلا ہوا نظر آ گیا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتی چلی آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ بھی زندہ ہے۔

یہ کوئی معجزہ ہی ہو گیا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم ایک فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑے ہونے کے بعد اپنی زندگی کو بچا کر لے آئے ہیں اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اگر ٹیلے کی دوسری جانب نیچے دریا نہ ہوتا تو ہماری زندگی کا وہیں خاتمہ ہو گیا تھا۔ میں

دریا کے بہاؤ تیرتا چلا جا رہا تھا۔ سعدیہ مجھ سے کافی پیچھے تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بھی برابر تیرتی چلی آ رہی تھی۔ وہ پیرس کی یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی تھی۔ تیراکی کی اس نے باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی تھی۔ دریا نے ایک اور پہاڑی کا موڑ کاٹا اور ایک جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہاں پانی میں بڑی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے لہروں کا زور بڑھ گیا تھا۔ یہ بات ہمارے حق میں تھی اور ہم جرمنوں کی پہنچ سے دور سے دور تر ہوتے جا رہے تھے۔

دریا کی دونوں جانب اونچے اونچے بڑے گھنے درخت تھے۔ ایک بار دریا کا پاٹ کافی چوڑا ہو گیا۔ پھر چھوٹا ہوتے ہوتے اتنا رہ گیا کہ کنارے پر اگی ہوئی جھاڑیاں صاف نظر آنے لگیں۔ سعدیہ تیرتے تیرتے اب میرے قریب پہنچ گئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی خیریت پوچھی اور تیرتے چلے گئے۔ سعدیہ نے ہاتھ سے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیں یہاں دریا سے نکل کر جنگل میں داخل ہو جانا چاہئے۔ میں نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ ہمیں ابھی مزید کچھ دور تیرتے رہنا چاہئے چونکہ ہم دریا کے بہاؤ کے رخ تیر رہے تھے اس لئے ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی اور تھکاوٹ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ہم صرف اتنا ہی کر رہے تھے کہ کسی طرح سر پانی سے باہر رہے۔ پانی کا تیز بہاؤ ہمیں دریا میں بہت آگے لے گیا۔ آخر ایک جگہ ہم دریا سے نکل کر کنارے پر آ گئے۔ سعدیہ بھی حیران ہو رہی تھی کہ وہ کیسے زندہ بچ گئی۔ میں نے کہا کہ خدا نے ہمیں بچا لیا ہے۔ ورنہ کسی فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑے ہونے کے بعد آج تک کوئی بچ نہیں سکا۔ اب ہماری پریشانی یہ تھی کہ مصر کیسے پہنچا جائے۔ کیونکہ ہمارا ٹارگٹ مصر ہی تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ سعدیہ کو قاہرہ میں اس کے بھائی بہنوں کے پاس پہنچانے کے بعد میں بھی وہاں سے اپنے وطن پاکستان روانہ ہو جاؤں۔ مجھے گھر سے نکلے اور مشکل حالات کا مقابلہ کرتے ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر رابعہ کے دیئے ہوئے کرنسی نوٹوں کی شکل میں کچھ پاؤنڈ ضرور تھے جو گیلے ہوئے تھے۔ انہیں ہم نے وہیں سوکھنے کے لئے ڈال دیا تھا۔ سعدیہ کو اس قسم کے سنگین واقعات کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ بہادر عورت ضرور تھی مگر اس قسم کے حالات سے اسے پہلی بار

واسطہ پڑا تھا۔ مجھے اس علاقے کی سیاحت کا تھوڑا بہت تجربہ ضرور تھا۔ میرا تجربہ اور میرا علم یہ کہتا تھا کہ اگر ہم دریا کے کنارے کو چھوڑ کر جنگل میں شمال کی طرف چلے تو جنگل ہمیں مار دے گا۔ اگر کسی طرح جنگل کی آفتوں سے بچ کر نکل بھی گئے تو آگے شمالی افریقہ کا صحرائے اعظم ہمارے استقبال کو موجود ہو گا جو بے سروسامان مسافروں کو بڑی جلدی موت کی آغوش میں لے جاتا ہے۔ میں نے سعدیہ کو مشورہ دیا کہ ہمیں جنگل میں داخل ہونے کی بجائے دریا کے ساتھ ساتھ چلنا ہو گا۔ سعدیہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے اتنا ضرور کہا کہ دریا ہمیں کسی ایسے علاقے میں نہ پہنچا دے جہاں جرمنوں کا قبضہ ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ وسطی افریقہ میں جرمنوں کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ آگے ان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم اللہ کا نام لے کر دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ سعدیہ کی وجہ سے میں بھی زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ شام کا اندھیرا بھی چھانے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی محفوظ جگہ تلاش کروں جہاں رات بسر کی جائے کیونکہ افریقہ کے جنگلوں میں راتوں کو سفر کرنا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا کہ ہمیں ایک بستی کی روشنی دکھائی دی۔ یہ افریقی ماہی گیروں کی بستی تھی۔ ان لوگوں نے ہمیں کھانا کھلایا۔ سعدیہ عورتوں کے پاس ایک جھونپڑی میں چلی گئی اور میں ساتھ والی جھونپڑی میں رات گزارنے کے لئے لیٹ گیا۔

دوسرے دن ماہی گیروں کا ایک آدمی ہمیں چھوٹی سی کشتی میں بٹھا کر پندرہ بیس میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبے کے گھاٹ پر چھوڑ گیا۔ اس گھاٹ سے ہمیں ایک سٹیمر مل گیا۔ جس نے ایک بڑے قصبے میں پہنچا دیا۔ قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی اس بڑے قصبے سے ایک ریل گاڑی سوڈان کے سرحدی شہر تک جاتی تھی۔ رات کے دس بجے ہم سوڈان میں داخل ہوئے۔ اب ہم ہر طرح سے محفوظ تھے۔ کیونکہ یہاں کوئی جنگ وغیرہ نہیں ہو رہی تھی۔ ہم ایک ماڈرن شہر میں آ گئے تھے۔ جہاں ہمیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ قصہ مختصر ہم تین دن کے بعد قاہرہ جا پہنچے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ سعدیہ بڑی مطمئن تھی۔ صرف اسے اپنے باپ کے جدا ہو جانے کا صدمہ ضرور تھا۔ وہ اپنی بڑی بہن کے گھر آ گئی تھی۔ وہاں ہمارا خیر مقدم کیا گیا۔ باپ کی موت

کا سن کر سعدیہ کی بڑی بہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے پاکستان واپسی کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں مسافر بردار طیاروں کی اتنی زیادہ آمدورفت نہیں تھی۔ میرا پروگرام مصر کے مشرقی ساحل سے بحیرہ احمر عبور کرنے کے بعد حجاز مقدس میں داخل ہونے کا تھا۔ ماحول پرامن تھا۔ بحیرہ احمر میں سٹیمر اور تجارتی جہاز چلنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب پاکستان تو جا ہی رہا ہوں ایک دفعہ پھر اہرام مصر کی سیر کر لینی چاہئے۔ یہ بڑے تاریخی اہرام ہیں اور ہزاروں برس پہلے فراعنہ مصر نے اپنے مقبروں کے طور پر بنائے تھے۔ سعدیہ اپنے رشتے داروں، عزیزوں اور بہن بھائیوں میں بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ ایک روز میں اکیلا ہی اہرام دیکھنے چل پڑا۔ شہر سے ایک بس وہاں تک جاتی تھی۔ بس میں دوسرے ملکوں کے سیاح بھی بیٹھے تھے۔ بس نے ہمیں ابوالہول کے شکستہ مجسمے کے پاس پہنچا دیا۔ مصر ایک بہت پرانا ملک ہے۔ یہاں قدم قدم پر سینکڑوں برس پہلے کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ مصر کے اہرام تو اپنی تاریخی اور پراسرار حیثیت کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ان اہرام کی قیمتی چیزیں قاہرہ کے عجائب گھر میں رکھ دی گئی ہیں۔ اہراموں میں سیاح لوگ تہہ خانے اور وہ چبوترے دیکھنے جاتے ہیں۔ جہاں کچھ ممیوں کے کانسی کے بت سیاحوں کے لئے ویسے ہی رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس روز صرف ایک اہرام کھلا تھا۔ میں نے بھی ٹکٹ خریدا اور دوسرے غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ اہرام میں داخل ہو گیا۔ میں پہلے بھی ان اہراموں کی سیر کر چکا تھا۔ مگر یہاں کا ماحول کچھ ایسا پراسرار اور آسیبی ہے کہ میرے ایسے آسیب پسند آدمی کا بار بار آنے کو دل چاہتا ہے۔ اہرام کے تہہ خانے زمین کے اندر کافی گہرائی میں بنائے گئے تھے۔ یہاں روشنی اور تازہ ہوا کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ اہرام میں ایک جگہ جنگلا لگا تھا۔ کچھ سیاح کھڑے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں ریت پر انسانی پاؤں کے نشان تھے۔ گائیڈ بتا رہا تھا کہ فرعون مصر کو جب دفن کیا جاتا تھا تو ساتھ ہی کچھ غلام اور کنیزیں بھی زندہ دفن کر دی جاتی تھیں تاکہ ان کے خیال کے مطابق وہ اگلی دنیا میں بادشاہ کی خدمت کر سکیں۔ یہ غلام اور کنیزیں اہرام بند ہو جانے کے بعد دم گھٹ کر مر جاتے تھے۔ یہ نشان ایک ایسی ہی ایک کنیز کے پاؤں کا نشان ہے جو فرعون

کی لاش کے ساتھ اس اہرام میں دفن کردی گئی تھی۔ پاؤں کا یہ نشان تین ہزار سال
سے ویسے کا ویسا ہے۔ میں حیران ہو کر کنیز کے پاؤں کا نشان دیکھ رہا تھا۔ اس کنیز کی
ہڈیاں بھی باقی نہیں بچی تھیں مگر اس کے پاؤں کا نشان ریت پر ویسے ہی تھا۔ میری نظر
تہہ خانے کی عقبی دیوار کی طرف گئی تو مجھے وہاں ایک عورت کھڑی نظر آئی جس نے
فرعون مصر کے زمانے کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس
نے مجھے اپنی طرف بلایا تو میرے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

سیاح جنگلے کے اوپر جھکے ہوئے کنیز کے پاؤں کے نشان دیکھ رہے تھے۔ اس کی
تصویریں بھی اتار رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے سے ہو کر دیوار کے پاس آیا جہاں
فرعون مصر کے زمانے کی عورت کھڑی تھی۔ میرے دل میں یہی خیال آیا کہ یہ محکمہ
سیاحت والوں کی کوئی خاتون ہے جسے پرانے زمانے کا لباس پہنا کر وہاں کھڑا کر دیا گیا ہے
تاکہ ماحول کو حقیقت کا روپ دیا جائے۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس عورت کی طرف کوئی
بھی ٹورسٹ متوجہ نہیں تھا۔ ورنہ لوگ اس کی تصویریں بناتے۔ میں عورت کے پاس
گیا تو وہ دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اب وہاں مجھے ایک زینہ نظر آیا جو اوپر کو جاتا تھا۔
عورت نے مجھے اشارے سے بلایا اور خود زینہ پر چڑھ گئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ
یہیں سے واپس ہو جاؤں۔ کہیں پھر کسی آسیبی چکر میں نہ پھنس جاؤں۔ میں اس
حقیقت سے صرف واقف ہی نہیں تھا بلکہ مجھے اس کا تجربہ بھی تھا کہ آسیب انسان کی
زندگی کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ انسان کو کسی مافوق الفطرت شے سے ملنے کا اتفاق
ہو چاہے نہ ہو لیکن اس کے وجود کا خیال انسان کے لاشعور میں ضرور موجود ہوتا ہے۔
آدھی رات کو قبرستان میں سے گزرتے وقت اگر پیچھے سے کوئی چڑیل کی طرح آواز
دے۔ تو بڑے سے بڑا سائنس دان بھی خوف زدہ ہو جائے گا۔ میں ذاتی طور پر چونکہ
روحوں کو مانتا ہوں اس لئے مجھے کبھی زیادہ خوف محسوس نہیں ہوتا ایک بار ضرور
بدن میں سنسنی دوڑتی ہے۔ جو کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ پھر نارمل ہو جاتا ہوں۔

جب میں نے اہرام کے تہ خانے میں فرعون مصر کے زمانے کی عورت کو دیکھا
تو ایک دفعہ ضرور خوف محسوس ہوا۔ مگر جب میں اوپر جاتے زینے کے پاس آیا تو میرا
خوف دور ہو چکا تھا۔ خوف کی جگہ تجسس سا پیدا ہو گیا تھا کہ اگر یہ واقعی تین ہزار سال

پرانے زمانے کی کوئی روح ہے تو اس سے قدیم مصر کی تاریخ کی بہت سی باتیں معلوم کروں گا- چنانچہ میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ زینے پر چڑھنے لگا میں نے دیکھا کہ زینہ خالی تھا- وہ عورت نہیں تھی میں زینہ پر چڑھ کر اوپر گیا تو سامنے ایک نیم روشن دان آگیا- چھت نیچی تھی چھوٹے چھوٹے کتنے ہی ستون فرش سے چھت تک گئے ہوئے تھے- میں نے ادھر ادھر دیکھا- وہ عورت کہیں دکھائی نہ دی- میں ستونوں کے درمیان سے گزرتا ذرا آگے گیا تو دیوار میں ایک آدھ کھلا دروازہ نظر پڑا جس کے اندر سے روشنی باہر آرہی تھی- ہلکا سا ڈر بھی لگا کہ کہیں کسی بدروح کے چکر میں نہ پھنس جاؤں- مگر مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے میرا ایمان ہے کہ خدا سارے جہانوں کا مالک ہے کائنات کی تمام مخلوق اس کے تابع ہے اور اصل طاقت اللہ ہی کی ہے اور اگر انسان کا ایمان مضبوط ہے تو پھر کائنات کی کوئی منفی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی-

میں دروازے کے قریب آگیا مجھے کسی مرد کی آواز آئی آواز بھاری تھی اس میں ایک پراسراریت بھی تھی اور جلال بھی تھا- آواز نے میری زبان میں کہا تھا-

"اندر چلے آؤ"---- میں تہ خانے میں داخل ہو گیا- کیا دیکھتا ہوں کہ بڑا سجا سجایا کمرہ ہے، فرش پر قالین بچھا ہے، چھت پر فانوس روشن ہے، دیواروں پر مخمل کے پردے لٹک رہے ہیں، سنگ مرمر کی میز پر چاندی کی صراحی کے پاس دو پیالیاں پڑی ہیں، سامنے پرانے زمانے کے کاؤچ پر ایک سفید ریش بزرگ بڑے جاہ و جلال کے انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں- سر پر سفید عمامہ ہے، سرخ فرغل پہن رکھا ہے میں نے انہیں سلام کیا انہوں نے جواب میں وعلیکم السلام کہا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا- میں ان کے سامنے والے کاؤچ پر بڑے ادب سے بیٹھ گیا- ابھی تک روپے میں سے بارہ آنے میرا یہی خیال تھا کہ یہ کمرہ بھی مصر کے محکمہ ٹورازم والوں نے پرانی وضع پر سجا رکھا ہے اور یہ بزرگ محکمے کے کوئی بڑے افسر ہیں جو پرانی کاسٹیوم میں سیاحوں سے ملاقات کرتے ہیں-

اسی خیال کے تحت میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ کا محکمہ داد کے لائق ہے کہ جس نے اپنی پبلسٹی اور ٹورازم کے فروغ کے لئے اتنا عمدہ اہتمام کر رکھا ہے- وہ

بزرگ مجھے گھور کر دیکھنے لگے- ان کی آنکھوں میں مجھے ایک مافوق الفطرت چمک سی محسوس ہوئی- وہ مسکرائے اور میری زبان میں کہنے لگے ----"میں جانتا ہوں تمہیں تاریخ سے اور خاص طور پر مسلمانوں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے"-

میں نے جلدی سے کہا-

"جی ہاں اسلامی تاریخ میرا محبوب سبجیکٹ ہے"-

اب میرا تجسّس ختم ہو چکا تھا- میں نے اس بزرگ کو محکمہ سیاحت کا افسر تسلیم کر لیا تھا اور جو خاتون مجھے اشارے سے بلا کر اوپر لے گئی تھی اسے میں محکمے کی کوئی ملازم خاتون ہی سمجھ رہا تھا- بزرگ نے پتھر کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے صراحی میں سے چائے کے رنگ کا کوئی گرم مشروب اس میں انڈھیلا-

"قہوا پیو گے"؟

"جی ہاں---- شکریہ"-

انہوں نے اپنی پیالی میں بھی قہوہ ڈالا اور خاموشی سے پینے لگے- میں نے تھوڑا سا قہوہ پیا تو محسوس ہوا کہ یہ کوئی انوکھی خوشبو ہے- انوکھا ہی ذائقہ ہے- میں نے کہہ دیا کہ اس کی خوشبو عجیب و غریب ہے- میں نے ایسا قہوہ پہلے کبھی نہیں پیا- کیا یہ قاہرہ میں پیدا ہوتا ہے؟ اس بزرگ نے کوئی جواب نہ دیا- وہ خاموشی سے قہوہ پیتے رہے- میں نے بھی دوبارہ کوئی سوال نہ کیا- ماحول ایسا بن گیا تھا کہ کسی وقت لگتا کہ یہ سب کچھ حقیقی زندگی میں ہو رہا ہے اور دوسرے لمحے محسوس ہوتا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں- وہ شخص مجھ سے ایک بار پھر ہم کلام ہوا-

"تم نے تاریخ کو کتابوں میں پڑھا ہے- اگر میں تمہیں وہاں لے چلوں جہاں تمہیں تاریخ چلتی پھرتی نظر آئے جہاں تم وہ واقعات اپنے سامنے ہوتے دیکھو جنہیں تم تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہو تو کیسا رہے گا؟ میں سمجھا وہ بزرگ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں- مگر وہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہے تھے- میں نے کہا کہ آپ ضرور مجھے کوئی تاریخی فلم دکھانا چاہتے ہیں وہ ان کا جواب تھا-

"نہیں---- فلم تو تاریخ کی نقل ہوتی ہے- میں تمہیں اصل کے پاس لے جاؤں گا- تم اسلامی سپہ سالاروں کو مجاہدین کے لشکر کے ساتھ بڑے بڑے قلعوں کو فتح

کرتے دیکھو گے۔ تم قرطبہ اور غرناطہ کی تجربہ گاہوں میں مسلمان سائنس دانوں کو مختلف علوم پر عملی تجربے کرتے دیکھو گے۔ کیا تم تاریخ کے ایوانوں میں داخل ہونے کو تیار ہو میرے لئے یقیناً یہ ایک نیا تجربہ اور انوکھی بات تھی۔ میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔۔۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے جناب کہ میں سائنس کے جدید دور سے نکل کر سات آٹھ سو برس پہلے کے زمانے میں پہنچ جاؤں؟"۔

وہ فرمانے لگے۔۔۔ "میں اگر سمجھانے کی کوشش بھی کروں تو یہ نقطہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں ایسا صرف تمہارے شوق کی خاطر کر رہا ہوں اور یہ ثابت کرنے کے لئے بھی کہ خدا ماضی حال مستقبل کا مالک ہے۔ تینوں زمانے اس کے قبضہ قدرت میں ہیں"۔

میں تیار ہو گیا۔ بزرگ نے قہوے کی خالی پیالی میز پر رکھ دی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کس مقام سے تاریخ کا سفر دیکھنا پسند کرو گے؟" میں نے کہا "میں اس زمانے کے اندلس مین جانا چاہتا ہوں جب وہاں مسلمانوں کی حکومت تھی"۔

بزرگ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر اپنے فرغل کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے چاندی کی ایک انگوٹھی دی جس پر سرخ عقیق جڑا ہوا تھا۔ "یہ اپنی انگلی میں پہن لو جب تک یہ انگوٹھی تمہارے پاس رہے گی تم جب خواہش کرو گے آج کے زمانے میں واپس آ جاؤ گے۔ لیکن اگر یہ انگوٹھی تم نے گم کر دی تو پھر اپنے زمانے میں واپسی ناممکن ہو جائے گی۔ پھر قدیم زمانے میں ہی رہو گے اور تاریخ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آج کے زمانے تک پہنچ سکو گے۔" میں نے انگوٹھی لے کر انگلی میں پہن لی اور کہا کہ میں اس کی پوری حفاظت کروں گا۔ مجھے تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اس قدر شوق تھا کہ میں یہ بھول گیا کہ ماضی کے سفر میں میرے ساتھ ہلاکت خیز حالات بھی پیش آ سکتے ہیں اور پھر اگر انگوٹھی گم ہو گئی تو میں اپنے ملک میں کبھی واپس نہ آ سکوں گا۔ میں نے بزرگ سے سوال کیا کہ ماضی کے زمانے میں پہنچنے کے بعد کیا میں کسی حادثے میں مر بھی سکتا ہوں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا "نہیں۔۔۔ تم خدا کی

قدرت سے زندہ رہو گے۔" مگر ایک بات کا تمہیں خیال رکھنا ہو گا اور وہ بات یہ ہے کہ تم تاریخ کے واقعات میں دخل اندازی نہیں کرو گے"۔

میں نے وعدہ کیا کہ میں کسی تاریخی واقعے میں دخل نہیں دوں گا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بزرگ مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہیں گے اور جب میں آنکھیں کھولوں گا تو آج سے آٹھ نو سو برس پہلے کے اندلس میں پہنچ چکا ہوں گا۔ مگر ایسا نہ ہوا بزرگ نے فرمایا! "وہ سامنے جو چھوٹا دروازہ ہے اس میں سے گزر جاؤ تم جہاں پہنچنا چاہتے ہو پہنچ جاؤ گے"۔

میرے دل میں کچھ خوف بھی تھا کچھ تجسس اور شوق بھی تھا۔ میں اسی عالم میں دروازے میں سے گزر گیا باہر آیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے کاریں پارک تھیں وہاں تین چار اونٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور شہر کی فصیل نظر آ رہی تھی جس کے دروازے کے برج دھوپ میں چمک رہے تھے دو گھوڑ سوار گھوڑے دوڑاتے میرے قریب سے گزر گئے۔ پھر ایک رتھ گزر گیا۔ میں قدیم مصر کے زمانے میں پہنچ چکا تھا۔ آپ ضرور کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تو خواب کی باتیں ہیں میں کہوں گا کہ اگر ہم خواب میں بھی اپنی تاریخ کی عظمت کی ایک جھلک دیکھ لیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے، آج کے مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جمال اپنا اگر خواب میں بھی دیکھے تو
ہزار ہوش سے بہتر تیری شکر خوابی

آپ اپنے آباؤ واجداد کی تاریخ کو پڑھتے ہیں۔ میں آپ کو تاریخ دکھانے چلا ہوں۔ میرے ساتھ رہیے آپ تاریخ کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے دیکھیں گے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خواب دیکھ رہا ہو تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کیفیت تھی میں کئی سو سال پہلے ماضی کے زمانے میں چلا گیا تھا اور مجھے احساس تھا کہ میں سائنس کے زمانے سے نکل کر یہاں آیا ہوں اور میرا مقصد تاریخ کا مشاہدہ ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ میرا لباس بھی

اسی زمانے کا ہو گیا تھا جس زمانے میں، میں آیا ہوا تھا۔ جب میں اہرام مصر دیکھ رہا تھا تو میں نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی مگر اب میرا لباس یہ تھا کہ ایک لمبا کھلا کرتہ تھا کمر کے ساتھ کالے رنگ کی رسی پیٹی کی طرح بندھی ہوئی تھی، پاؤں میں عجیب قسم کے جوتے تھے، کاندھے پر نیلی چادر تھی، ایک تھیلا کمر کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے تھیلے کی تلاشی لی اس میں سونے چاندی کے سکے اور ایک خنجر تھا۔ میں سمجھ گیا یہ میرا زادراہ تھا۔ میری انگلی میں عقیق والی انگوٹھی بھی موجود تھی۔ مجھے اس کی حفاظت کرنی تھی اس کے گم ہو جانے کی صورت میں اپنی دنیا یا آپ یوں کہ لیجئے کہ اپنے عہد ماضی کے خواب سے حالت بیداری میں واپس نہیں آسکتا تھا۔ یہ میرا ہی عہد ماضی نہیں تھا بلکہ یہ ہماری تاریخ کا درخشاں عہد ماضی تھا۔ آپ ایک لمحے کے لئے بھی ایسا مت سوچیں کہ میں آپ کو خواب کی دنیا میں لے جا رہا ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے یہ خواب ضرور ہے مگر ایسا خواب ہے جس میں آپ اپنی تاریخ کی حقیقت کو گوشت پوست کی شکل میں حقیقی واقعات کے ساتھ متحرک دیکھیں گے۔ میں خواب کے دروازے میں آپ کے ساتھ داخل ہونے سے پہلے ایک بار پھر کہوں گا کہ آپ نے اپنے اجداد کی تاریخ پڑھ رکھی ہے۔ میں آپ کو وہی تاریخ دکھانے چلا ہوں۔ بلکہ ہمارے بہت سے دوستوں کو تو علم ہی نہیں ہے کہ اندلس دمشق اور بغداد میں مسلمانوں نے فلسفہ، طب، میڈیسن، جیومیٹری، ریاضی، طبیعات اور جغرافیہ کے علوم میں کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیئے تھے یورپ ابھی تک ان کے دریافت کئے ہوئے اصولوں اور دکھائے ہوئے راستوں پر عمل کر رہا ہے۔ سرجری اور میڈیسن کے علاوہ دوسرے عملی علوم پر اندلس کے مسلمان سائنس دانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے تراجم آج بھی یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ عہد رفتہ کی اس دنیا کی سیر کریں جس کو بعض لوگ خواب کی دنیا، ماضی کی دنیا کہتے ہیں اور جسے میں حقیقت کی دنیا کہتا ہوں۔ ایک بات ضرور ذہن میں رکھیے گا کہ جو قومیں اپنے ماضی سے سبق حاصل نہیں کرتیں وہ دنیا میں ترقی نہیں کر سکتیں میں اپنی زندگی کے ایک حیرت انگیز تجربے سے گزرنے والا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس تجربے میں میرے ساتھ رہیں۔ اس انوکھے سفر میں آپ میرے ساتھ ایڈونچر بھی کریں گے۔

آپ خطرناک مہموں میں بھی شریک ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اس زمانے کے مسلمان، یورپ کی نیم وحشی قوموں کو کس طرح تہذیب، شائستگی اور رواداری کا عملی درس دے رہے تھے۔ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں لکھ رہا اس حقیقت کا اعتراف یورپ کے مستند دانشوروں نے بھی کیا ہے اور وہ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ جب لندن میں کسی پادری کے پاس کوئی علمی کتاب ہوتی تھی تو لوگ اسے دیکھنے آتے تھے اور اس وقت قرطبہ اور غرناطہ کے ہر محلے میں لائبریریاں قائم تھیں اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے بچے بھی سکولوں میں پڑھنے جاتے تھے۔

مصیبت یہ ہے کہ ہم نے اندلس کے زوال پر تو بہت لکھا ہے مگر اس کے عروج پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ میں آپ کو اندلس کے عروج کے زمانے میں لے جا رہا ہوں۔

دیکھئے یہ دسویں صدی عیسوی کا اندلس ہے۔ اندلس پر مسلمان خلیفہ امیر عبدالرحمان سوم کی حکومت قائم ہے۔ ابوالقاسم بن ابی العباس الزہراوی خلیفہ وقت کے طبیب خاص بھی ہیں اور دارالحکومت قرطبہ کے شاہی ہسپتال کے چیف سرجن بھی ہیں۔ ابوالقاسم الزہراوی کے زمانے میں مسلمان جراحی یعنی سرجری میں بڑے ماہر تھے اور ہسپتالوں میں سرجری کے فن میں ماہر بنانے کے لئے میڈیکل سٹوڈنٹس کو چیرپھاڑ کی مشق بھی کرائی جاتی تھی جیسے آج کل میڈیکل کالجوں میں کرائی جاتی ہے۔ ابوالقاسم نے سرجری پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا عربی سے لاطینی زبان میں اور لاطینی سے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یورپ نے اس سے فائدہ حاصل کیا۔

اندلس کے اس نامور مسلمان سائنس دان نے سرجری کے کئی اوزار بھی بنائے جو آج بھی ہمارے ہسپتالوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یورپ کے دانشوروں نے اعتراف کیا ہے کہ ہم نے ابوالقاسم سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر آج بھی ہم عمل کرتے ہیں۔ ابوالقاسم نے اپنی سرجری کی کتاب میں سرجری کے اوزاروں کی تصویریں بھی چھاپی ہیں۔ میں آپ کی ملاقات اسلامی دور کے اس بہت بڑے طبیب اور سرجن یعنی ابوالقاسم زہرادی سے بھی کراؤں گا۔ آپ ان کی گفتگو بھی سنیں گے۔ قرطبہ کے میڈیکل کالج میں ان کے لیکچر بھی سنیں گے۔

قاہرہ سے میں ایک قافلے کے ساتھ صحرا میں سفر کرتا بحیرہ روم کی بندرگاہ قرطاضیہ پہنچا تھا جس کا اس زمانے میں کار تصیج نام تھا۔ یہی نام کثرت سے استعمال سے آج قرطاضیہ بن گیا ہے۔ یہاں سے میں ایک قدیم زمانے کے بادبانی جہاز میں سوار ہوا اور سپین یعنی مسلمان کے اندلس کے ساحل پر جا اترا۔ غرناطہ سے ایک بار پھر قافلہ پکڑا اور قرطبہ پہنچ گیا۔ اب میں وہاں سے اپنی تاریخی داستان کو شروع کرتا ہوں جب مجھے قرطبہ میں آئے ابھی پہلا دن ہی تھا۔ سرائے بڑی کشادہ اور پختہ عمارت والی تھی۔ سورج غروب ہو جانے کے بعد میں قرطبہ کی سیر کو نکل پڑا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قرطبہ کی گلیاں کھمبوں پر لگے ہوئے لیمپوں کی روشنی میں بقعہ نور بنی ہوئی تھیں۔ یقین کریں اتنی روشنی ہمارے سمن آباد کی گلیوں میں نہیں ہوتی جتنی روشنی آج سے نو سو برس پہلے مسلمان کے قرطبہ شہر کے گلی کوچوں میں تھی۔ فرش پختہ تھے اور پتھروں کو جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ اس قسم کے فرش آج کے جرمنی ہالینڈ اور پیرس کی گلیوں کے ہوتے ہیں۔ ایک انگریز مورخ نے لکھا کہ عربوں نے ہسپانیہ کو ترقی اور خوشحالی کے نقطہ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے ہسپانیہ میں عالی شان مسجدیں بنائیں، خوشنما باغات لگائے، ہسپتال تعمیر کرائے، دریاؤں پر پل باندھے، پرشکوہ محلات اور قلعے تعمیر کیے۔ آب رسانی اور نکاسی آب کا ایسا عمدہ انتظام کیا کہ ان کے بعد تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پھلدار باغات لگائے، سونے چاندی اور سکے کی کانیں دریافت کیں۔ اندلس میں ریشم، اون اور روئی کی اعلیٰ ترین مصنوعات تیار ہو کر سمندری راستے سے قسطنطنیہ اور یورپ کے شہروں تک پہنچی تھیں۔ یہ ساری باتیں میں نے تاریخ میں پڑھی تھیں اور اب میں مسلمانوں کے اندلس کی یہ ساری ترقی و خوشحالی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ قرطبہ شہر ایک خوبصورت سرسبز وادی میں بنایا گیا ہے جس کو دریائے وادالکبیر سیراب کرتا ہے۔ مسجد قرطبہ کا تقدس اور جلال دیکھ کر میرا سر فرط عقیدت سے جھک گیا۔ رات کے وقت بھی دکانیں کھلی تھیں۔ یہ دکانیں روشن تھیں اور ان میں ہر قسم کا سامان فروخت ہو رہا تھا۔ مسلمان اور غیر مسلم خواتین اپنی خادماؤں کے ساتھ پوری آزادی سے چیزیں خرید رہی تھیں۔

قرطبہ میں عربی، عبرانی، لاطینی اور پرتگالی ساری زبانیں بولی جاتی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ اندلس پہنچنے کے بعد میں یہ ساری زبانیں بولنے اور سمجھنے لگا تھا یہ سارا خواب کا اثر تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی جب میں سرائے میں واپس آیا میرے پاس سونے کے سکے تھے میں نے الگ کمرہ لے لیا تھا اسے آپ چھوٹا سا حجرہ کہہ سکتے ہیں جس کی محرابی کھڑکی آدھی کھلی تھی، فرش پر قالین بچھا تھا، گاؤ تکیے لگے تھے۔ قرطبہ کا موسم خوشگوار تھا ادھ کھلی کھڑکی میں سے آتی ہوا اچھی لگ رہی تھی تپائی پر شیشے کے گلوب والی شمع روشن تھی۔ میں نے کھڑکی بند نہ کی اور چادر لے کر قالین پر لیٹ گیا۔ جب مجھے نیند آنے لگی تو میں نے شمع بجھا دی اندھیرا ہوتے ہی کھڑکی میں سے قرطبہ کے نیلے آسمان پر کھلے ہوئے ستاروں کی ہلکی ہلکی نیلی روشنی اندر آنے لگی۔ خواب کی طرح کا ماحول ہو گیا۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے اندر ایک سنسنی سی محسوس کی کہ میں مسلمانوں کے اندلس کی سرزمین پر آگیا ہوا ہوں اور باہر ہسپانیہ کے نیلے آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں میں ان ستاروں کو دیکھنے کے لئے حجرے سے باہر نکل آیا۔ سرائے کے احاطے میں مسافر ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ایک اندلسی اپنے گٹار پر کوئی ہسپانوی لوک گیت گا رہا تھا اور نیلا کھلا آسمان تھا جس پر ستاروں کے سفید نیلے پھول کھل رہے تھے۔ فضا میں اندلس کے سیاہ گلابوں کی خوشبو تھی یہ سیاہ گلاب اور خوشبوئیں، بہادر مور اور عرب اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ میں نے اتنا رومانسٹر ماحول زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں نہ گرد و غبار تھا نہ پٹرول کا جلا ہوا دھواں تھا نہ ویگنوں، رکشوں اور سکوٹروں کا شور تھا۔ میں سوچنے لگا کہ قدرت کے مناظر اپنی نیچرل فضاؤں میں کس قدر حسین اور حیرت انگیز ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی ماڈرن دنیا سے اپنی گھڑی بھی ساتھ نہ لا سکا تھا۔ کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کتنی رات گزر گئی ہے۔ لگتا تھا وقت تھم گیا ہے۔ رات چلتے چلتے رک گئی ہے۔ میری نظر انگلی میں پڑی انگوٹھی پر پڑی اس کا سرخ عقیق چمک رہا تھا۔ یہ انگوٹھی میری واپسی کا پاسپورٹ تھا۔ اس کے گم ہو جانے سے میں اپنے وطن پاکستان واپس نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے انگوٹھی کی بڑی حفاظت کرنی ہو گی۔ یہ سوچ کر میں اپنے حجرے میں آگیا۔ حجرے میں اندھیرا تھا کھڑکی میں سے ستاروں کی دھیمی روشنی آ رہی تھی میں قالین پر لیٹنے لگا تو

مجھے محسوس ہوا کہ حجرے میں کوئی موجود ہے- میں نے اندھیرے میں چاروں طرف غور سے دیکھنے کی کوشش کی ایک سایہ کونے سے نکل کر کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا میں نے پوچھا کون ہے؟ اس کے ساتھ ہی سایہ غائب ہو گیا اور کھڑکی زور سے بند ہو گئی میں نے دوڑ کر کھڑکی کھولی اور باہر دیکھا-

مجھے ایسے لگا جیسے سایہ کھڑکی میں سے باہر نکل گیا ہے-

پھر خیال آیا کہ شاید یہ میرا وہم ہو- سینکڑوں برس پرانے زمانے میں آگیا ہوں- رات کا وقت ہے- بڑی پراسرار فضا ہے- ہو سکتا ہے یہ میری نگاہ کا فریب ہو- میں نے اپنا تجسس دور کرنے کے لئے اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا- باہر سرائے کے صحن میں ایک جانب آگ کا الاؤ روشن تھا اور ایک اندلسی عرب دھیمے سروں میں گٹار پر کوئی گیت گا رہا تھا- چونکہ میں خواب یا علم کے زیر اثر تھا اور ماضی کے زمانے میں آتے ہی میرا نہ صرف لباس بدل گیا تھا بلکہ میں اس زمانے کے اندلس میں بولی جانی والی زبانیں، عبرانی لاطینی اور عربی زبانیں بھی سمجھنے اور بولنے لگا تھا- مجھے اندلسی عرب کے لوک گیت کے بول صاف سمجھ میں آ رہے تھے- اس کے گیت میں اپنے خاوند سے بچھڑی ہوئی خاتون کا ہجر و فراق میں ڈوبا ہوا نوحہ تھا-

کیا میرے گھر کے آنگن کے گلابوں کی خوشبو ماند پڑ گئی تھی؟
کیا میری بانہوں میں محبت کی گرمی باقی نہیں رہی تھی؟
کیا چاندنی راتوں میں انار کے پھول نہیں کھلتے تھے
اور کیا تم اس نخلستان کو بھول گئے
جہاں کھجوروں کی گرم خوشبوؤں میں
ہم چاندنی رات میں پہلی بار ملے تھے؟
اگر یہ سب کچھ ایسا ہی ہے
تو تم مجھے چھوڑ کر پردیس کیوں چلے گئے ہو؟

اس گیت میں بڑا درد تھا- میں قالین پر لیٹ گیا- اوہ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے

نیلی چاندنی کا غبار سرائے کے حجرے میں آرہا تھا- چاندنی کے اس غبار کے ساتھ قرطبہ کے سیاہ گلابوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بھی آرہی تھی- میں اپنے کمپیوٹرائزڈ اور خلائی شٹل اور فضاؤں میں آلودگی پھیلاتی کاروں، سکوٹروں، ہوائی جہازوں اور ایٹمی تابکاری کی دنیا سے نکل کر چھ سات سو برس ماضی کے زمانے میں آگیا تھا- یہ مسلمانوں کے اندلس کے عروج کا زمانہ تھا- میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس زمین کا آسمان کبھی اتنا شفاف اور اس آسمان کی رات کبھی اتنی نکھری ہوئی، آئینے کی طرح شفاف اور خوشبو بھی ہو سکتی ہے- یہ وہ صاف اور پاکیزہ رات تھی جب چاند نکلا ہوا تھا اور رات کی گرتی شبنم میں زمین کے ہر خطے اور باغ کے ہر درخت اور درخت کے ہر شگوفے کی خوشبو تھی- قدرت نے یہ رات سو جانے کے لئے نہیں بنائی تھی- ایسی جمال آفریں رات کے حسن بلاخیز کی جانب سے آنکھیں بند کر کے سو جانا کفران نعمت تھا- میری نیند اس رات کے حسن نے اڑا دی تھی-

میں بے اختیار ہو کر اٹھا اور حجرے کے باہر نکل آیا- صحن میں آتے ہی قرطبہ کی چاندنی میں سرشار شبنمی رات نے میرا ماتھا چوم لیا- یہ رات کے شبنمی ہونٹوں کا لمس تھا- اس لمس میں سارے کرہ ارض کے ان تمام پھولوں کی خوشبو تھی جو آج تک زمین نے اپنے اپنے جنگلوں اور باغوں میں کھلائے تھے- میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سرائے کے محرابی دروازے میں سے گزر کر سرائے کے باہر آگیا- مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے زمانے سے نکل کر سینکڑوں برس ماضی کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں اور چاندنی رات کا وہ منظر دیکھ رہا ہوں جس کو گزرے سینکڑوں سال ہو چکے ہیں- کوئی ربی طاقت تھی جس نے تاریخ کے سنہری ورق میرے سامنے کھول دیئے تھے اور ان کے گزرے ہوئے کرداروں اور لوگوں اور واقعات میں جان ڈال دی تھی- اور یہ میرا خواب تھا- اگر میں واقعی کوئی خواب دیکھ رہا تھا تو میری خواہش تھی کہ یہ خواب کبھی ختم نہ ہو- میں جس سڑک پر جا رہا تھا وہ پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اور اس کی دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھمبوں پر زیتون کے تیل کے فانوس روشن تھے-

چلتے چلتے میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی چاندنی

میں ایک ٹیلے کے اوپر بنے ہوئے ایک محل نما چھوٹی سی عمارت کی طرف جا رہی تھی- میں ٹیلے پر چڑھ گیا- عمارت کے قریب آیا تو چاندنی میں اس کی دیوار کے چاروں جانب چھوٹے چھوٹے برج بنے ہوئے دیکھے- عمارت دو منزلہ تھی- اس کا صدر دروازہ بند تھا- دروازے کے اوپر ایک بالکونی تھی جس پر چڑھی ہوئی گلاب کی بیل میں سے سفید گلاب کے پھول ستاروں کی طرح نظر آرہے تھے- فضا میں ان جنگلی گلابوں کی خواب انگیز ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی- میں نے بالکونی پر نگاہ ڈالی- اس کے چھوٹے چھوٹے ستون سنگ مرمر کے تھے- مجھے چاندنی میں ایسے لگا جیسے بالکونی میں کوئی انسان جھک کر نیچے میری جانب دیکھ رہا ہے- میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا- میرے کانوں میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی ہو- مجھے کسی کے سانس کی مہک بھی محسوس ہوئی- میں نے دو تین بار جلدی جلدی آنکھیں جھپک کر ایک بار پھر بالکونی پر نگاہ ڈالی-

یہ کوئی انتہائی نازک اندام حسین خاتون تھی جس نے اپنے گورے ہاتھ کی حنائی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا ہوا تھا- میں جیسے سحرزدہ سا ہو کر اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا- بالکونی کی جانب سے ہوا کا ہلکا سا جھونکا آیا- اس جھونکے میں گلاب اور مہندی کے پھولوں کی خوشبو تھی- میرے دل میں اچانک خیال آگیا کہ کہیں یہ کوئی آسیب نہ ہو- میں ذرا پیچھے ہٹ گیا- اتنے میں حسین نازک اندام عورت کا ہیولا غائب ہو گیا- میں تعجب سے خالی بالکونی کو دیکھنے لگا- چاندنی رات میں سنگ مرمر کی بالکونی صرف نظر آرہی تھی- اب وہ بالکل خالی تھی- سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ طلسم ہے یا وہم ہے یا میرے ماضی کے خواب کا اثر ہے اور میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں یہ سب کچھ خواب میں ہو رہا ہے- میں نے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو زور سے ملا- میرے حواس پوری طرح بیدار تھے- یہ خواب نہیں تھا- میں خواب میں سے گزر کر ماضی کی حقیقت کی دنیا میں آگیا تھا- اب وہ میرے لئے ماضی نہیں تھا- حال تھا- خواب نہیں تھا- حقیقت تھی- پھر یہ بالکونی والی نازک اندام حسین عورت کون تھی؟ اور میرے دل میں آسیب کا خیال آتے ہی کہاں غائب ہو گئی ہے-

میں عمارت کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا اس کے عقب میں آگیا- یہاں نیچے

دریا بہہ رہا تھا- دریا ایک بڑی نہر جتنا کشادہ تھا- اس کے اوپر ایک جانب پتھر کی محرابوں والا پل بنا ہوا تھا- دریا کے دوسرے کنارے پر کھجور اور سرو کے درختوں کی قطار کھڑی تھی- چاندنی رات میں یہ بڑا خوش نما منظر تھا- شاید دریا کے پار یہ کسی اندلسی باغ کے درخت تھے- عربوں کو باغات کا بھی بہت شوق تھا- انہوں نے اندلس میں آنے کے بعد یہاں بے شمار باغات لگائے جن کی تازگی اور حسن آج بھی اسی طرح قائم تھا- میرا دل چاہا کہ دریا کے دوسرے کنارے والے باغ کو چل کر دیکھا جائے- میں ٹیلے سے اتر آیا- سامنے دریا کا پل تھا- پل پر بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زیتون کے فانوس روشن تھے- میں پل کے ذریعے دریا کو عبور کر گیا- دریا کی لہریں فانوس اور چاندنی کی روشنی میں بڑے سکون کے ساتھ بہہ رہی تھیں- پل کی دوسری جانب ایک باغ تھا جس کے داخل ہونے کے کشادہ راستے کی دونوں جانب سربفلک سرو کے درختوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی- ایسی خاموش اور پر سکون چاندنی رات میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا- میں خود اس حسین ترین طلسمی رات کا حصہ بن گیا تھا- فضا میں قسم قسم کے درختوں، سبزے اور پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی- مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں شبنم میں ڈوبی ہوئی خوشبو کے گھونٹ پی رہا ہوں- میرا سارا جسم، میری روح اس خوشبو سے لبریز ہو گئی تھی-

میں اس باغ کی طلسمی فضاؤں میں اس کی خوشبو کی لہروں کے ساتھ بہتا بڑھا چلا جا رہا تھا- باغ میں سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی روشیں تھیں- ان روشوں میں چاندنی ایسے پانی کے فوارے جاری تھے- ہر قطعے میں سرخ اور سفید گلاب کے پھولوں کے جھاڑ تھے- ہر قطعہ باغ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں ایک چوکور سنگ مرمر کی عمارت بنی ہوئی تھی جس کی محرابوں پر پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں- اس عمارت کے اندر محل نما دالان تھے جہاں سنگ سرخ کے ستونوں کے درمیان جگہ جگہ سنگ مرمر کے بینچ رکھے ہوئے تھے- دالان کے وسط میں بھی فوارہ اچھل رہا تھا- میں عمارت کے دالان میں سے گزر کر عمارت کے پیچھے قطعے میں آ گیا- جہاں گلاب کے نیلے اور سیاہ گلابوں کے درمیان سفید گلاب کھلے ہوئے تھے- یہاں باغ کے وسط میں ایک حوض تھا جس کے کنارے پر سنگ سرخ کی ایک محراب بنی ہوئی تھی- محراب کے نیچے ایک سنگ

مرمر کا بنچ بنا ہوا تھا-

میں اس باغ کے طلسم میں اسیر اس بنچ پر جا کر بیٹھ گیا- حوض میں سنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں- میری دائیں جانب سرو کے درختوں کی قطار دور ایک عمارت تک چلی گئی تھی- سرو کے درختوں کے نیچے دونوں جانب بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے تھے جن میں پھول کھل رہے تھے- حوض میں چاند کا عکس نظر آ رہا تھا- حوض کی مچھلیاں اس عکس کے گرد چکر لگا رہی تھیں- فضا پر ایک پر جلال سناٹا طاری تھا- ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے فضا میں سے وہاں پریوں کا تخت اترنے والا ہو- میں بنچ پر ساکت ہو کر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک مجھے اپنی دائیں جانب کسی کے ریشمی ملبوس کی سرسراہٹ سنائی دی- اس کے ساتھ ہی گلاب اور حنا کی خوشبو کا ایک جھونکا میرے قریب سے ہو کر گزر گیا- میں نے دائیں جانب دیکھا- چند قدموں کے فاصلے پر مجھے ایک انسانی ہیولا اپنی طرف آتا دکھائی دیا- میں مبہوت سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا- انسانی ہیولا قریب آ گیا- میں نے اسے پہچان لیا- یہ وہی بالکونی والی نازک اندام حسینہ تھی- اس نے گلابی ریشمی لباس پہن رکھا تھا- اس کے سنہری بال دونوں جانب اس کے کندھوں پر آبشاری کی طرح گر رہے تھے- جیسے جیسے وہ نازک اندام حسین عورت میرے قریب آ رہی تھی گلاب اور حنا کی خوشبو گہری ہو رہی تھی- میں اس کے خیر مقدم کے لئے اٹھ کھڑا ہوا- وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر آ کر رک گئی- اس کا حسن واقعی سحر انگیز تھا- آنکھوں میں خواب ایسی کیفیت تھی- میں یہی سمجھا کہ وہ اس عمارت میں رہنے والی کوئی شہزادی یا کسی سردار کی بیٹی ہے- اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا- میں بیٹھ گیا- وہ بھی بڑے سکون کے ساتھ میرے پاس بنچ پر بیٹھ گئی- اس کے حسن کے جلال کے رعب سے مجھ سے بات نہیں ہو رہی تھی- پھر بھی میں نے جرات سے کام لیتے ہوئے اس سے پوچھا-

"آپ باغ کے محل میں رہتی ہیں؟ میں نے آپ کو بالکونی میں دیکھا تھا"

یہ جملہ میں نے وہاں کی عام زبان میں اس سے پوچھا تھا- اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی- ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا- پھر وہ مترنم اور خواب آلود

آواز میں بولی۔

"میں محل میں اکیلی رہتی ہوں۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔"

میں ڈر گیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ کہیں سچ مچ یہ کوئی آسیبی عورت نہ ہو۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی خواب آلود آواز میں بولی۔

"مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں تمہیں اپنے محل کے باغ کی سیر کرانا چاہتی ہوں۔ میرے باغ میں زمرد کے رنگ کے گلاب کھلتے ہیں۔ ایسے گلاب اندلس کے شاہی محل کے سوا اور کسی جگہ نہیں ملیں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

خدا جانے اس کی زبان میں کیا تاثیر تھی کہ میں بے اختیار ہو کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ وہ سرو کے درختوں کے درمیان بڑے شاہانہ انداز میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرم لہریں مجھے سارے جسم میں سرایت ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے وہ اپنے محل کے باغ میں لے آئی۔ یہ محل وہی چوکور عمارت تھی جس کی بالکونی میں میں نے پہلی بار اس عورت کو دیکھا تھا۔ محل کے عقبی دروازے کے اوپر ایک فانوس روشن تھا۔ باغ میں سبز رنگ کے گلاب کھلے ہوئے تھے۔ اس رنگ کے گلاب میں نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ باغ میں ایک جگہ قد آدم چار دیواری تھی۔ اس میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے اندر روشوں کے درمیان فوارے چل رہے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ چار دیواری کے اندر باغ میں لے آئی۔ یہاں مہندی کی جھاڑیوں کے درمیان ایک تخت تھا جس پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ دو نازک کنیزیں تخت کی دونوں جانب ادب سے کھڑی تھیں۔ وہ عورت تخت پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ کنیزیں ادب سے جھک کر وہاں سے چلی گئیں۔ کچھ دیر میری خاموشی رہی۔ نہ میں نے کوئی بات کی۔ نہ اس نازک اندام حسین خاتون نے کوئی بات کی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میرا نام سلطانہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا نام----"

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"میں تمہارا نام جانتی ہوں۔ میں تمہارے بارے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو اور کیسے آئے ہو اور تمہارے ہاتھ میں جو یہ زمرد کی انگوٹھی ہے۔ یہ تمہیں کس نے دی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔"

میں پہلے تو بڑا حیران ہوا کہ اس عورت کو میرے بارے میں سب کچھ کیسے علم ہو گیا۔ پھر سوچا کہ یہ بھی میری طرح کوئی خواب کی مخلوق ہے۔ وگرنہ اسے کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں۔ اور زمرد کی انگوٹھی مجھے کس نے دی ہے۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا اور نہ مجھے اس سے کوئی خوف ہی محسوس ہوا۔ آدمی خود خواب میں ہو تو اسے وہاں خواب کی مخلوق ہی ملتی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"سلطانہ! اگر تم میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہو تو مجھے اپنے بارے میں بھی بتاؤ کہ تم اصل میں کون ہو اور میرے بارے میں تمہیں سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا ہے۔"

سلطانہ کچھ دیر روش میں اچھلتے فوارے کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

"میں تمہیں خواہش کے باوجود ابھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔

میں نے پوچھا۔ "تم مجھے یہاں کس لئے لائی ہو؟"

سلطانہ میری طرف اپنی پر کشش چمکیلی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ پھر اپنے بالوں کو ایک ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"یہ بھی میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گی۔ ابھی صرف اتنا ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم مجھے اچھے لگے تھے بس۔"

اس کے جملے سے میری انا کو بڑی تسکین ملی اور میں خوش بھی ہوا کہ ایک اتنی حسین عورت جو کوئی شہزادی لگتی ہے مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ میں نے کہا۔ "یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں تمہیں اچھا لگا ہوں۔"

سلطانہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میرا شہر یہاں سے بہت دور ہے۔ کیا تم میرا شہر دیکھنے میرے ساتھ چلو گے؟"

میں خوامخواہ اس کے ساتھ کسی جگہ جانا نہیں چاہتا تھا حقیقت یہ ہے کہ مجھے اندر سے اس عورت سے ایک خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ میرا تعلق تو حقیقت کی ماڈرن دنیا سے تھا جس کو چھوڑ کر میں کسی وجہ سے ماضی کی دنیا میں آگیا تھا۔ جبکہ یہ عورت ماضی کی دنیا کی عورت تھی اور ماضی کچھ بھی ہو لیکن ایک خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

میں نے کہا۔

"ابھی تو میں اندلس کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں۔ جب اس سے فرصت ملی تو تمہارے ساتھ ضرور تمہارے شہر جاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے شہر کا نام کیا ہے اور تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی بھی کیا وہاں رہتے ہیں؟"

سلطانہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ساری باتیں تمہیں میرے شہر میں چل کر اپنے آپ معلوم ہو جائیں گی۔"

میں چپ ہو گیا۔ مہندی کی جھاڑیوں میں سے حنا کی خوشبو کے جھونکے آ رہے تھے۔ مجھے خاموش پا کر سلطانہ نے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے لگی۔

"کیا تم ابھی میرے ساتھ نہیں چل سکتے؟ میں وہاں زیادہ دن نہیں رہوں گی۔ بڑی جلدی تمہیں یہاں واپس لے آؤں گی"۔؟

میں نے کہا۔ "نہیں سلطانہ! ابھی میں قرطبہ چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا۔ تم تو جانتی ہو کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ میرے لئے قرطبہ کو اپنے عروج کے عہد میں دیکھنا ایک حیرت انگیز انوکھا تجربہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جی بھر کر اس کی سیاحت کر لوں۔"

سلطانہ نے اس کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ اس نے بازو اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک کنیز کسی طرف سے نکل کر سامنے آگئی۔ سلطانہ نے کہا۔

"کارمن! میرا رباب لاؤ"

کنیز فوراً چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ رباب لے کر آگئی۔ سلطانہ نے رباب اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"میں تمہیں بچپن میں سنا ہوا ایک گیت سناتی ہوں"

پھر اس کی نازک مخروطی انگلیاں رباب کے تاروں پر آہستہ آہستہ چلنے لگیں۔ رباب کے تاروں میں سے جیسے سویا ہوا نغمہ بیدار ہوا۔ سلطانہ نے اپنی شیریں آواز میں ایک گیت چھیڑ دیا۔

اس گیت کی لے اور اس کے الفاظ لاطینی تھے۔ اس کا مفہوم یہ تھا۔

"وینس کے آسمان پر ستارے اس
طرح چمکتے ہیں جیسے آسمان کی نیلی
جھیل میں سفید کنول کھلے ہوں
میں اپنے باغ کے صحن میں تمہارے ساتھ کھیلا کرتی تھی
پھر تم مجھ سے جدا ہو گئے
میں تمہاری تلاش میں صدیوں سے ماری ماری
پھر رہی ہوں
تم مجھے کب ملو گے؟ کہاں ملو گے؟

گیت ختم ہوا تو سلطانہ نے رباب ایک طرف رکھ دیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔

"بڑا دردناک گیت تھا۔ مگر تم تو اندلسی عرب ہو۔ لیکن تم نے لاطینی گیت گایا ہے۔ کیا تمہارا بچپن بحیرہ روم کے کسی شہر میں گزرا ہے"؟

مجھے معلوم تھا کہ ازمنہ وسطیٰ میں بحیرہ روم کے سارے شہروں میں لاطینی زبان عام بولی جاتی تھی۔ سلطانہ اپنی نرگسی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ جیسے نرگس کے پھولوں پر شبنم کے موتی

ہوں- وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مجھ سے کچھ پوچھ رہی ہو- کوئی سوال کر رہی ہو- میں اس کی آنکھوں کے سوال کو نہ سمجھ سکا-

اس نے ایک سرد آہ بھر کر مجھ سے پوچھا-

کیا تم لاطینی زبان سمجھتے ہو؟

اس حسین ترین نازک اندام خوابوں کی شہزادی ایسی عورت کے پاس بیٹھ کر اور اس کا درد بھرا لاطینی گیت سننے کے بعد میرے دل میں اس کے لئے ایک محبت کی لہریں سی ابھرنے لگی تھیں- میں نے جواب دیا-

"ہاں میں لاطینی زبان سمجھ لیتا ہوں- میں نے یہ زبان یہیں سیکھ لی ہے-"

سلطانہ نے کہا- "تمہیں قرطبہ میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے اتنی جلدی یہاں کوئی بھی لاطینی زبان نہیں سمجھ سکتا-"

میں نے یونہی کہہ دیا- مجھے تو ایسے شبہ ہوتا ہے کہ لاطینی زبان میں جب پیدا ہوا تھا تب بھی جانتا تھا-

سلطانہ نے میرا ہاتھ تھام لیا- بڑے جذباتی لہجے میں بولی-

"یہی میں تمہیں کہنا چاہتی ہوں کہ لاطینی تمہاری مادری زبان ہے- تم----"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی- پھر اس نے ایک سرد آہ بھری اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی-

"کیا مجھ سے ملنے کل یہاں آؤ گے؟ میں اسی وقت اسی باغ میں تمہارا انتظار کروں گی-"

نہ جانے کیوں میں نے کہہ دیا-

"ہاں میں تم سے ملنے کل رات پھر آؤں گا-"

ایسا میں نے شاید اس لئے کہہ دیا تھا کہ میرے دل سے اس کا آسیبی خوف دور ہو گیا تھا- یا شاید اس لئے کہ وہ میری نوجوان عمر کے جذبات کا تقاضا تھا- اس نے مجھے بے اختیار اپنے ساتھ لگا لیا- اس کے نیم گرم جسم سے حنا اور گلاب کے پھولوں کی

خوشبو آ رہی تھی- مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے مجھے گلاب کے پھولوں نے اپنے ساتھ لگا لیا ہو- وہ اٹھی تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا- اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم آہستہ آہستہ سنگ مرمر کی روش پر چلنے لگے- اپنے محل کے محرابی دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی- کہنے لگی-

میں کل اس وقت گلاب کے پھولوں کے پاس تمہارا انتظار کروں گی-"

اس نے میرا ہاتھ اپنے نازک اور گرم ہونٹوں سے چوما اور خاموشی سے اپنے محل کے دروازے میں سے گزر کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی- مجھ پر ایک سحر سا طاری تھا- میں چند لمحے وہاں بت سا بنا کھڑا رہا- جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تب بھی میں وہیں کھڑا رہا- شاید وہ مجھے اب بھی اپنے محل کی طرف جاتی نظر آ رہی تھی- پھر جیسے میرا خواب ٹوٹ گیا- میں باغ میں سے نکل کر ٹیلے کی پگ ڈنڈی پر سے اتر کر اپنی سرائے میں واپس آ گیا-

وہاں میرے لئے سب اجنبی تھے- وہاں میرا ایسا کوئی دوست نہیں تھا جس سے میں سلطانہ کے بارے میں بات کرتا- جس کو میں بتاتا کہ میں نے چاندنی رات میں جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھا ہے- اور اس خواب میں میں نے حنا اور گلاب کے پھولوں کی شہزادی سے ملاقات کی ہے اور میں اس سے ملنے کل رات پھر جا رہا ہوں- میں سرائے کے حجرے میں آ کر قالین پر لیٹ گیا- میں نے آنکھیں بند کر لیں- مگر نیند کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا- آنکھیں سلطانہ کے حسین خواب سے لبریز تھیں اور میں اسی باغ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا اس کی باتیں سن رہا تھا- اس سے باتیں کر رہا تھا-

سارا دن قرطبہ کے قدیم بازاروں میں پھرتا- رات ہونے کا انتظار کرتا رہا- رات آ گئی- جب چاندنی نے پورے قرطبہ شہر کو اپنی دودھیا چادر میں لپیٹ لیا تو میں سرائے سے نکل کر پرانے محل کی طرف چل پڑا- ٹیلے پر آیا تو سامنے سلطانہ کا محل چاندنی میں نہا رہا تھا- میں اس کے عقب میں آ کر نیلے اور سیاہ گلابوں کے باغ میں داخل ہو گیا- باغ چاندنی کے نور میں ڈوبا ہوا تھا- میں محراب والے تالاب کے قریب

سے ہو کر پھولوں والے قلعے میں آ کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں سلطانہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ کہیں سچ مچ میں نے کل رات کوئی خواب تو نہیں دیکھا تھا۔ کہیں وہ خوابوں کی شہزادی مجھے واقعی خواب میں تو نہیں ملی تھی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے حنا اور گلابوں کی مہک محسوس ہوئی خوشبو کا یہ جھونکا میرے قریب سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ریشمی ملبوس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ چاندنی میں سنگ مرمر کی روش پر سلطانہ نازک قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ وہ ایسے چل رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ جیسے کوئی منزل سے بے خبر چل رہا ہو۔ وہ میرے پاس آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر خواب آلود آواز میں کہا۔

وہاں تخت پر چل کر بیٹھتے ہیں۔

ہم دوسرے قطعے میں کل رات والے تخت پر جا کر بیٹھ گئے۔ تخت پر اسی طرح قالین بچھا ہوا تھا۔ مگر کنیزیں موجود نہیں تھیں۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

"سلطانہ! تمہاری کنیزیں آج موجود نہیں ہیں۔"

اس نے کہا۔ "میں نے انہیں آنے سے منع کر دیا تھا۔

کیوں؟ میں نے اس سے سوال کیا۔

وہ اپنا چہرہ میرے قریب لاتے ہوئے بولی۔

"اس لئے کہ میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتی تھی۔ کیا تمہیں مجھ سے تنہائی میں ملنا پسند نہیں"

میں نے کہا۔ اگر تمہیں تنہائی میں ملنا پسند نہ ہوتا تو میں یہاں تمہارے پاس کیوں آتا؟

وہ چہرہ اٹھا کر چاند کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"تم میرے پاس میرے محل میں کیوں نہیں آ جاتے؟"

میں نے کہا۔ نہیں سلطانہ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ تکلیف؟ تکلیف کیسی؟ کیا اپنے محبوب کو اپنے پاس رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے؟ میرے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو گی کہ جس

سے میں محبت کرتی ہوں وہ میرے پاس آ جائے گا۔

سلطانہ کے اس بے باکانہ اظہار محبت سے جہاں مجھے حیرت ہوئی وہاں مجھے خوشی بھی محسوس ہوئی۔ اس نے کہا۔

"تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو ناں؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔

"بولو تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو ناں؟"

اس کے طلسمی اثر سے یا اس ماحول کے اثر سے میرے منہ سے ہاں نکل گئی۔ میں نے کہا۔

ہاں میں بھی تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔

اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔

"تم ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہے ہو۔ تمہیں ہمیشہ مجھ سے محبت رہی ہے۔ ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے محبت کرتے رہے ہیں۔ کیا تمہیں کچھ یاد نہیں؟"

میں نے پوچھا۔ "تم مجھے کیا یاد کرانا چاہتی ہو سلطانہ؟"

اس نے کہا۔ "میں تمہیں بہت کچھ یاد کرانا چاہتی ہوں۔ مگر تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے جب ہم پہلی بار وینس کے ایک محل میں ایک دوسرے سے ملے تھے مجھے وہ دن یاد ہے۔ پھر جب تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے ہو گئے تھے۔ مجھے وہ خوبصورت دن بھی یاد ہے اور مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب میں تم سے جدا ہو گئی تھی۔ پھر مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب میں تمہاری تلاش میں زمان و مکان کے خلا میں پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔

سلطانہ ایسی باتیں کرنے لگی تھی جس کا ایک جملہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہم کب وینس کے محل میں ایک دوسرے سے ملے تھے اور تم کب مجھ سے جدا ہو گئی تھیں اور ہم کب ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو گئے تھے"۔

سلطانہ نے کہا۔ "تم سچ کہتے ہو۔ میں نے بے معنی باتیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ تمہاری محبت نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ان باتوں کو بھول جاؤ۔ جس طرح تم پہلی باتوں کو بھول چکے ہو۔ انہیں بھی بھول جاؤ۔ اب میں تم سے ایسی باتیں نہیں کروں گی۔ آؤ محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کرتے ہیں"۔

"یہ چاندنی رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی ہے۔ ہمیں اس کے نورانی دامن سے محبت کے کھلے ہوئے سارے پھول چن کر اپنی روح میں سجا لینے چاہئیں۔ مجھے ایک بار پھر کہو کہ تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو۔ میرے کان محبت کا یہ سرمدی نغمہ سننے کو ترس رہے ہیں"؟

میں سمجھ گیا کہ سلطانہ بہت جذباتی عورت ہے اور اس سے آج تک کسی نے محبت نہیں کی۔ میں حیران تھا کہ ایسی خوبصورت عورت سے کسی آدمی کو محبت نہیں ہوئی؟ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ سلطانہ ایک آسیبی عورت ہے۔ اس کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا ذہن یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ اور میری زبان یہ الفاظ ادا کر رہی تھی۔

"ہاں سلطانہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں"

"آہ" سلطانہ نے آہ بھر کر کہا۔ "یہ جملہ بار بار کہو۔ میں سینکڑوں برسوں سے تمہارے منہ سے یہ جملہ سننے کو ترس گئی ہوں۔ سینکڑوں سال تک میں نے یہ محبت بھرا جملہ سننے کا انتظار کیا ہے۔"

سلطانہ ویسے بالکل نارمل باتیں کرتی تھیں۔ اس کی باتیں سن کر ایک لمحے کے لئے بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی ماورائی مخلوق ہے۔ لیکن جب وہ اس قسم کی باتیں شروع کر دیتی تھی تو قدرتی طور پر مجھے خیال آنے لگتا تھا کہ سلطانہ کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ کوئی آسیبی یا پھر خواب کی دنیا کی مخلوق ہے جو چاندنی رات میں صرف مجھ سے ملنے زمین پر اتر آئی ہے۔ لیکن ایک بات ضرور تھی۔ اب میرا یہ احساس ختم ہو رہا تھا کہ سلطانہ کوئی آسیبی یا آسیب زدہ مخلوق ہے۔ اگر اس کا تعلق کسی ماورائی مخلوق یا خواب کی دنیا کی مخلوق سے تھا تب بھی وہ بے ضرر عورت

تھی اور اس کا دل سرمدی محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔ اس خیال کو یہ احساس بھی تقویت دے رہا تھا کہ میں خود حقیقت کی دنیا سے نکل کر ماضی کی دنیا میں آگیا ہوں جو خواب کی دنیا ہے۔ چنانچہ خواب کی دنیا میں کسی خواب کی دنیا کی حسین لڑکی کا مل جانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں تھی۔

لیکن سلطانہ کی ایک بات میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اٹلی کے شہر وینس کیوں لے جانا چاہتی تھی۔ پھر خیال آیا کہ شاید اس کا گھر اٹلی کے شہر وینس میں ہو اور وہ مجھے وہاں اپنے ماں باپ سے ملانا چاہتی ہو۔ کیا خواب کی دنیا میں بھی لوگوں کے ماں باپ ہوتے ہیں؟ ضرور ہوتے ہوں گے۔ اصل میں، میں حقیقت اور خواب کی دنیا کے درمیان آگیا تھا۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ یہ سب حقیقت ہے۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ نہیں یہ سب کچھ خواب و خیال ہے۔ سلطانہ نے اس رات پھر اپنے آبائی شہر وینس کا ذکر چھیڑ دیا۔ اپنا رخسار میرے بازو کے ساتھ لگا کر بولی۔

"کیا میرے ساتھ وینس نہیں چلو گے؟"

میں نے پوچھا۔

"تم مجھے وہاں کیوں لے جانا چاہتی ہو؟"

کہنے لگی۔ "میں تمہیں وہاں کچھ دکھانا چاہتی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ وہاں گلیوں میں پانی کی نہریں بہتی ہیں۔ اور بادشاہوں اور شہزادے شہزادیوں کے قدیم محلات ہیں۔ مجھے ان کو دیکھنے کی خواہش نہیں ہے"۔

سلطانہ نے نیند بھری آواز میں کہا۔

"نہیں یہ نہیں۔ میں وہاں تمہیں کچھ اور بھی دکھانا چاہتی ہوں؟

میں نے پوچھا۔ "آخر وہاں ایسی کونسی ایسی عجوبہ چیز ہے جس کے لئے تم میرے ساتھ اتنا لمبا تکلیف دہ سفر طے کر کے وینس جانا چاہتی ہو"

اس نے کہا۔ "میں تمہیں وہاں ایسی چیز دکھاؤں گی جس کو دیکھ کر تم بھی حیران رہ جاؤ گے؟"

پھر میں تاریخ کے اس مشہور و معروف شہر وینس کو دیکھنے کو ضرور جاتا مگر مجھے

معلوم تھا کہ وہاں نہ تو کوئی ٹرین ہے نہ کوئی ہوائی جہاز ہے۔ مجھے وہاں تک اونٹوں اور خچروں پر دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں میں سے گزر کر شاید ایک مہینے تک سفر کرتے ہوئے پہنچنا ہو گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"سلطانہ میرا دل وینس دیکھنے کو ضرور چاہتا ہے۔ لیکن میں اونٹوں اور خچروں پر ایک مہینے تک دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر نہیں کرنا چاہتا۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں تخت پر بیٹھا کر وینس لے جاؤں گی۔ تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی زمین پر نہیں چلنا پڑے گا؟

پہلے تو میں حیران ہوا۔ پھر خیال آیا کہ خواب کی دنیا کی مخلوق ہے ہو سکتا ہے یہ تخت کو ہوا میں اڑانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "ہوا میں اڑتے ہوئے ایک تخت پر بیٹھ کر اتنا لمبا سفر طے کرتے ہوئے میں تخت پر سے نیچے گر سکتا ہوں۔ میں جس دنیا سے آیا ہوں۔ اس دنیا میں لاہور سے جو جیٹ ہوائی جہاز وینس کی طرف پرواز کرتا ہے۔ وہ سارے کا سارا جہاز اندر سے ہوا بند ہوتا ہے۔ آدمی باہر انگلی تک نہیں نکال سکتا۔ خالی تخت پر سے تو ہر لحہ نیچے گرنے کا ڈر لگا رہے گا۔ آخر اتنی تیز ہوا کے تھپیڑے نہیں لگیں گے؟ وہ تو تمہیں نہ سہی لیکن مجھے ضرور نیچے گرا دیں گے۔ نہیں نہیں۔ میں تمہارے ساتھ وینس وغیرہ نہیں جاؤں گا۔

سلطانہ نے کہا۔ "میں تمہیں ایسے تخت پر اپنے ساتھ بٹھا کر لے جاؤں گی جس کے چاروں طرف سونے کا جنگلہ لگا ہوا ہو گا اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ جب تخت فضا میں اڑے گا تو تمہیں ذرا سا بھی دھچکا محسوس نہیں ہو گا۔ تخت ہچکولے نہیں کھائے گا۔ وہ بالکل سیدھا ہوا میں اڑے گا اور تمہیں ہوا کے تیز تھپیڑے بھی نہیں لگیں گے۔ کیا اب بھی تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے؟ میں نے دل میں کہا کہ الف لیلیٰ کی کہانیوں اور والٹ ڈزنی کی فلموں میں جادوگروں کے تخت کو ہواؤں میں اڑتے دیکھا تھا۔ چلو ہم بھی یہ تجربہ کر کے دیکھتے ہیں۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ اگر میں تخت پر سے نیچے زمین پر گر بھی پڑا تو مروں گا نہیں۔ کیونکہ مجھے جس بزرگ نے زمرد کی انگوٹھی

دے کر ماضی کی دنیا میں بھیجا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب تک تم ماضی کی دنیا میں ہو گے تم مرو گے نہیں۔ کیونکہ تمہاری موت ماضی کی دنیا میں نہیں لکھی ہوئی۔ تم اپنی حقیقت کی دنیا میں واپس آنے کے بعد اپنے وقت پر انتقال کرو گے۔

میں نے سلطانہ سے کہا۔

"اگر تم اتنا اصرار کرتی ہو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ لیکن میں وہاں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ میں قرطبہ جلدی واپس آنا چاہتا ہوں۔"

سلطانہ نے کہا۔ "ہم دو دن کے بعد وہاں سے واپس آ جائیں گے۔ میں خود تمہیں اپنے ساتھ واپس لاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم کل یہاں سے روانہ ہوں گے"

سلطانہ بولی۔ "کل کیوں؟ ابھی کیوں نہیں"

میں نے کہا۔ "اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے"

وہ بولی۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا"

اس نے میری کمر کے گرد بازو ڈالا اور کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ہم تخت سلیمان کی سیر کریں گے"

وہ اپنے محل کی طرف جا رہی تھی۔ ہم اچھلتے فواروں والی روشوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے سلطانہ کے محل میں داخل ہو گئے۔ وہ مجھے محل کا زینہ طے کر کے محل کی چھت پر لے آئی۔ وہاں چھت کے وسط میں ایک سنہری پایوں والا تخت رکھا ہوا تھا جس کے گرد سنہری جنگلہ لگا تھا۔ تخت پر سرخ قالین بچھا تھا اور تکیے لگے تھے اور گلاب کے سرخ اور سفید پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سلطانہ نے ایک طرف سے تخت کا جنگلہ ہٹایا اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ "آؤ۔"

اس نے کچھ اس انداز سے، اتنی محبت اور پیار بھرے لہجے سے مجھے بلایا کہ میں بے اختیار آگے بڑھا اور جنگلے میں سے گزر کر تخت کے درمیان میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوسرے لمحے سلطانہ نے جنگلے کو بند کیا اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت میرے دل کو ایک بار پھر اس خوف نے گھیر لیا کہ خدا جانے تخت کتنی بلندی پر فضا میں اڑے

گا- اگر یہ ایک طرف کو لپک گیا تو میں تو جنگلے میں سے نکل کر نیچے گر پڑوں گا- کوئی پتہ نہیں کہ میں زمین پر گرتے ہی کہیں مر نہ جاؤں- سو طرح کے وسوسوں اور خدشوں نے مجھے گھیر لیا- شاید سلطانہ کو میرے دل کی کیفیات کا علم ہو گیا تھا- اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی-

"دل میں ڈر خوف کے خیال کیوں لاتے ہو- میں تمہارے پاس ہوں- اور جب تک میں تمہارے پاس ہوں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا- تخت کو کچھ نہیں ہو گا-"

اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا- اس کے ساتھ ہی تخت اپنی جگہ سے ہلا- میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا تخت ہیلی کاپٹر کی طرح اوپر کو بلند ہونے لگا- فرق صرف اتنا تھا کہ ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے اور اس تخت کی کوئی آواز نہیں تھی ہیلی کاپٹر اوپر اٹھتے ہی ڈولنے لگتا ہے مگر تخت اپنی جگہ پر بالکل ساکت تھا- ذرا سا بھی نہیں ڈول رہا تھا-

تخت بلند ہوتے ہوئے جب محل کی چھت سے کافی اونچا ہو گیا تو اس نے محل کے اوپر ایک چکر لگایا اور پھر جنوب کی طرف پرواز شروع کر دی- خواب میں ہی سہی لیکن یہ تجربہ مجھے بالکل حقیقی محسوس ہو رہا تھا- اس تجربے کو میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا- جس وقت یہ ہوائی تخت اطالیہ کے مشہور شہر وینس کے اوپر پہنچا اس وقت آسمان پر چاند چمک رہا تھا جس کی روشنی میں نیچے وینس شہر کی گلیوں کی نہریں شیشے کی گلیوں کی طرح چمک رہی تھیں- تخت ایک محل کی چھت پر جا کر اتر گیا- میں اور سلطانہ تخت سے اترے تو سلطانہ نے میرا ہاتھ تھام لیا- اداس آواز میں بولی-

"یہ کبھی تمہارا گھر بھی تھا- ہم دونوں یہاں رہا کرتے تھے-"

سلطانہ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں- لیکن مجھے اس کا قرب بڑا عزیز تھا- شاید اس لئے کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا- خواب کی محبتیں حقیقت کی محبتوں سے بڑی مختلف ہوتی ہیں- حقیقت کی دنیا میں انسان جس سے محبت کرتا ہے اس سے نفرت بھی کر سکتا ہے لیکن خواب کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا- نفرت نام کی کوئی شے خوابوں کی دنیا میں نہیں پائی جاتی- ایک تنگ زینے سے اتر کر ہم محل کی نچلی منزل میں

آ گئے- یہ محل سارے کا سارا خالی تھا- نچلی منزل کا بڑا کمرہ بھی قالینوں، سرخ ریشمی پردوں دیدہ زیب قیمتی فرنیچر کے ساز و سامان سے سجا ہوا تھا- مگر وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا- میں نے سلطانہ سے پوچھا-

"کیا اس محل میں کوئی نہیں رہتا؟"

سلطانہ نے کہا- "صرف ایک شخص رہتا ہے- میں ابھی تمہیں اس سے ملاتی ہوں-"

ہم ایک اور زینے سے اتر کر محل کے تہ خانے میں آ گئے- یہاں موم بتیوں کی شمع روشن تھی- اس کی زرد اداس روشنی میں کمرے کے وسط میں ایک تابوت رکھا ہوا تھا- مجھے اس تابوت کو دیکھ کر خوف سا محسوس ہوا- سلطانہ نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا-

"ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

میں نے کہا- "بالکل نہیں مگر یہ تابوت کس کا ہے"

سلطانہ مجھے تابوت کے پاس لے گئی- پھر اس نے آگے بڑھ کر تابوت کا ڈھکنا ہٹا دیا- میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا- سلطانہ نے میری طرف دیکھا اور بولی-

"آگے آ کر دیکھو- اس میں کون لیٹا ہے-"

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا- میں نے تابوت میں جھانک کر دیکھا تو میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی- میں اپنی جگہ پر جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا- تابوت میں جو کچھ مجھے نظر آ رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا- تابوت کے اندر میں خود بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا- میرے جسم پر سنہری عبا تھی- میرا چہرہ لاش کے چہرے کی طرح زرد ہو چکا تھا- آنکھیں میت کی آنکھوں کی طرح تھوڑی تھوڑی کھلی تھیں- سلطانہ میری طرف دیکھ رہی تھی- کہنے لگی-

"میں نہ کہتی تھی کہ جو کچھ میں تمہیں دکھانا چاہتی ہوں اسے دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گے-"

خوف کے مارے مجھ سے بولا نہیں جاتا تھا- سلطانہ نے کہا-

"آؤ! تمہیں میں ایک اور چیز دکھاتی ہوں"

اس نے تابوت کا ڈھکن بند کر دیا اور مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گئی- یہ کمرہ ایک ہال کمرے کی شکل کا تھا- دیواروں پر سرخ ریشمی پردے لٹک رہے تھے- چھت کے ساتھ لگے زیتون کے تیل کے فانوس روشن تھے- فرش سرخ اور نیلے رنگ کے قیمتی قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا- کمرے کے وسط میں ایک تخت بچھا تھا- سامنے والی دیواروں پر ہاتھ سے بنائی ہوئی قد آدم رنگین تصویریں لگی تھیں- سلطانہ مجھے تصویریں دکھانے لگی- ہر تصویر میں کوئی نہ کوئی ملکہ بادشاہ کے ساتھ تخت پر بیٹھی دکھائی گئی تھی- سلطانہ بتا رہی تھی کہ یہ اس کے خاندان کا شجرہ نسب ہے- پھر وہ مجھے آخری قد آدم تصویر کے پاس لے گئی- اس تصویر میں خود سلطانہ ملکہ کے لباس میں تخت پر ایک بادشاہ کے ساتھ بڑی شان سے بیٹھی ہوئی تھی-

پہلی نظر میں میں بادشاہ کو نہ پہچان سکا- سلطانہ نے بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا-

"کیا تم نے اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانا-"

اب جو میں نے غور سے دیکھا تو میں خود شاہی لباس پہنے سر پر تاج پہنے سلطانہ کے ساتھ خود بیٹھا ہوا تھا- سلطانہ کہہ رہی تھی-

"ہاں---- تم اس شہر کی سلطنت کے بادشاہ تھے- میں تمہاری ملکہ تھی- پھر شہر پر دوسرے شہر کی فوج نے چڑھائی کر دی- ہماری فوج کو شکست ہو گئی- دشمن ہمیں قتل کرنے محل میں داخل ہو گیا- لیکن ہم دونوں ایک خفیہ دروازے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے- ہم دو سال تک ایک جزیرے میں روپوش رہے- دو سال کے بعد ہماری فوج کے جرنیل نے ایک نئی فوج تیار کر کے وینس پر حملہ کر دیا اور دشمن کو شکست ہو گئی اور وہ وینس چھوڑ کر بھاگ گیا- اس کے بعد ہم دونوں وینس میں واپس آ کر دوبارہ تخت پر بیٹھ گئے-"

اتنا سنا کر سلطانہ خاموش ہو گئی-

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا-

سلطانہ شکستہ سی آواز میں بولی-

"پھر ایسا ہوا کہ تم کچھ روز بیمار رہ کر وفات پا گئے- میں نے تمہیں تابوت میں ڈال کر اپنے محل کے تہہ خانے میں رکھ دیا- میں نے تمہارا چالیس دنوں تک سوگ منایا- اکتالیسویں دن میں نے تمہارے تابوت کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گئی- تمہارا جسم اسی طرح تھا- تمہارا جسم خراب نہیں ہوا تھا- میں نے اس وقت شاہی نجومی کو بلا کر اس سے اس کی وجہ پوچھی تو شاہی نجومی نے تمہارا زائچہ بنا کر بتایا کہ تم مرے نہیں ہو- بلکہ تمہیں سکتہ ہو گیا ہے- اگرچہ تمہارا دل اور سانس بند ہو گیا ہے- مگر تم مرے نہیں ہو اور زندہ ہو- میں نے حیران ہو کر نجومی سے پوچھا کہ کیا تمہاری روح بھی تمہارے جسم میں ہی ہے؟ نجومی نے بتایا کہ نہیں ملکہ سلامت- بادشاہ سلامت کی روح ان کے جسم سے نکل کر کسی اور دنیا میں جا چکی ہے- میں نے اسے کہا کہ وہ حساب لگا کر بتائے کہ تمہاری کسی روح کس ملک میں ہے- اس نے حساب لگایا اور بتایا کہ تمہاری روح کا کوئی سراغ نہیں مل رہا- مگر زائچہ اتنا ضرور بتاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی روح آپ کو ایک ہزار برس کے بعد ملک ہسپانیہ کے شہر قرطبہ کے ایک ویران محل میں ملے گی- میں نے نجومی سے کہا کہ ایک ہزار برس میں تو میری ہڈیاں بھی سلامت نہیں رہیں گی- پھر میں اپنے بادشاہ کی روح سے کیسے ملاقات کر سکوں گی؟ نجومی نے کہا- ملکہ صاحبہ اگر آپ زیوس دیوتا کے معبد کے تہہ خانے میں بیٹھ کر اکتیس دن تک اس کا چلہ کاٹیں تو آپ وہیں بیٹھے بیٹھے سنگ مرمر کے مجسمے میں تبدیل ہو جائیں گی- یہ مجسمہ ایک ہزار برس تک زیوس دیوتا کے معبد کے تہہ خانے میں محفوظ پڑا رہے گا- دیوتا کا معبد کھنڈر بن جائے گا مگر تہہ خانے میں آپ کے مجسمے تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا- ایک ہزار برس کے بعد آپ کے مجسمے میں جان پڑ جائے گی- پھر آپ کو ہسپانیہ کے شہر قرطبہ میں جانا ہو گا- آپ کے بچھڑے ہوئے محبوب بادشاہ کی روح

ان کی شکل میں آپ کو وہیں شاہی محل کے فواروں والے باغ میں ملے گی- اس وقت آپ کے اندر ایک خفیہ طلسمی طاقت پیدا ہو چکی ہو گی- آپ بغیر کچھ کھائے پیئے زندہ رہ سکیں گی آپ جس چیز پر سوار ہو کر اسے حکم دیں گی کہ پرواز کرو- وہ ہوا میں پرواز کرنے لگے گی- اس کے علاوہ آپ کے اندر اور بھی بہت سی طلسمی طاقتیں پیدا ہو چکی ہوں گی جن کا آہستہ آہستہ آپ پر انکشاف ہو گا----- میں نے نجومی کو رخصت کر دیا- میں تمہاری محبت میں دیوانی ہو رہی تھی- میں نے تمہارے تابوت کو اسی طرح شاہی محل میں رہنے دیا اور خود ایک قافلے کے ساتھ سفر کر کے دیوتا زیوس کے معبد میں یونان پہنچ گئی- یہ آج سے سوا دو ہزار برس پہلے کا یونان تھا- یونان کے جس شہر میں میں گئی تھی وہ خانہ جنگی کا شکار تھا اور وہاں شہر کی گلیوں میں لڑائی ہو رہی تھی- ہر طرف آگ لگی تھی- میں کسی طرح چھپ چھپا کر زیوس کے معبد میں پہنچ گئی- زیوس کا معبد بھی خالی اور ویران پڑا تھا- میں پتھر کی سیڑھیاں اتر کر اس کے تہہ خانے میں آ گئی- یہاں میں ایک جگہ فرش پر بیٹھ گئی اور دیوتا زیوس کا چلہ کاٹنا شروع کر دیا- میں رات کو بیٹھتی اور ساری رات دیوتا زیوس کے خفیہ منتر پڑھتی رہتی- اکتیس دن گزر گئے- اکتیسویں رات آ گئی- میں اس رات بھی ساری رات منتر پڑھتی رہی- تہہ خانے کی چھت میں سے دن کی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی کہ مجھے بیٹھے بیٹھے ایک دھچکا سا لگا اور دوسرے لمحے مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں بیٹھی ہوں اور کون ہوں---- میں سنگ مرمر کے بت میں تبدیل ہو چکی تھی- مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں ایک ہزار برس تک کیسے اس تہہ خانے میں مجسمہ بن کر پڑی رہی- ایک ہزار برس گزر جانے کے بعد اچانک مجھے ایک بار پھر دھچکا لگا اور میرے جسم میں جان پڑ گئی اور میں پھر سے گوشت پوست کی عورت بن گئی- میں سمجھ گئی کہ میرا چلہ کامیاب ہو

گیا ہے اور ایک ہزار برس گزر گیا ہے اور اب ہسپانیہ جا کر اپنے محبوب سے یعنی تم سے ملاقات کرنے کا وقت آ گیا ہے- میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا- تہہ خانے کی سیڑھیاں پتھروں اور مٹی میں دب گئی تھیں- تہہ خانے کی چھت کا سوراخ بھی بند ہو گیا تھا- تہہ خانے میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا- مجھے یاد آ گیا- نجومی نے مجھے کہا تھا کہ جب میں ایک ہزار برس کے بعد دوبارہ انسان کی شکل میں آؤں گی تو میرے اندر کئی طلسمی طاقتیں بیدار ہو چکی ہوں گی- ہر چیز میرے حکم کی تعمیل کرے گی- میں نے اپنی طلسمی طاقت کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور اندھیرے میں تہہ خانے کی دیوار کو حکم دیا- میرے لئے کھل جا تا کہ میں یہاں سے باہر نکل سکوں- گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دیوار میں ایک شگاف پیدا ہو گیا- باہر سے چاند کی روشنی کا سیلاب اندر آ گیا- میں شگاف میں سے باہر نکل گئی- باہر آ کر میں نے دیکھا کہ مندر مٹی کا ٹیلہ بن چکا تھا- سارا شہر پتھر بن کر بکھرا ہوا تھا- میں سمجھ گئی کہ میں تاریخ میں سوا دو ہزار برس آگے کے زمانے میں آ گئی ہوں- ہر طرف ویرانی برس رہی تھی- وہاں دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا- مجھے زمین پر پڑا ہوا لکڑی کا ایک تختہ نظر آ گیا- میں اس کے اوپر کھڑی ہو گئی اور اسے حکم دیا- مجھے ہسپانیہ کے شہر قرطبہ کے فواروں والے باغ میں پہنچا دے- میرا حکم پاتے ہی لکڑی کا تختہ فضا میں بلند ہوا اور مجھے ساتھ لے کر چاندنی میں روشن آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگا- راتوں رات اس نے مجھے قرطبہ شہر کے اس پرانے باغ میں پہنچا دیا جہاں تم سے میری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہیں دیکھا تھا- مگر اس باغ میں بھی مجھے تمہارا کئی برس تک انتظار کرنا پڑا- پھر ایک روز چاندنی رات میں ہی میں نے تمہیں باغ کے ویران محل کی طرف آتے دیکھا تو میں فوراً بالکونی میں آ گئی- اور پھر میں نے تمہیں دیکھا تم سے ملی اور

تمہیں پہچان لیا مگر تم نے مجھے نہ پہچانا۔ تمہارے ذہن سے میرا نقش معدوم ہو گیا ہوا تھا۔ تمہاری یادداشت واپس لانے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آخر میں تمہیں ساتھ لے کر وینس کے اپنے پرانے محل میں آ گئی جہاں تمہیں تمہاری تصویر اور تمہارا تابوت دکھایا۔۔۔۔ بس یہ ہے ہماری داستان محبت۔۔۔۔ کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ تم میرے محبوب شہزادے اور میرے محبوب بادشاہ ہو؟

مجھے سلطانہ کی داستان پر الف لیلیٰ کی کہانی کا گمان ہو رہا تھا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک ہم شکل بادشاہ کی لاش سوا دو ہزار سال پرانے تابوت میں اصلی حالت میں بغیر خراب ہوئے پڑی ہو۔ مجھے یہی خیال آیا کہ یہ بادشاہ اتفاق سے میرا ہم شکل تھا اور اس کی لاش کو قیمتی جڑی بوٹیوں کا عرق مل کر اسے محفوظ کر لیا گیا ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال تو میرے دل میں دماغ میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ میں حقیقت کی دنیا سے نکل کر خواب کی دنیا میں آ گیا ہوں اور خواب کی دنیا میں مجھے کوئی بھی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ خواب کی دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے سلطانہ سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن میری محبت اپنے جدید ترین خلائی شٹل اور کمپیوٹر اور سی ڈی کیسٹ کے زمانے کی محبت تھی جو کسی بھی وقت اپنے مفاد کی خاطر بدل سکتی تھی۔ چنانچہ سلطانہ سے مبحت کے ہوتے ہوئے بھی میں ہر وقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی طریقے سے پھر اپنی ماڈرن دنیا میں واپس چلا جاؤں۔ اگرچہ ابھی تک مجھے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں سلطانہ سے اس کا کوئی طلسمی طریقہ معلوم کروں۔ اگرچہ مجھے میرا شوق ماضی کی خواب آلود دنیا میں لے آیا تھا۔ لیکن اپنی حقیقی دنیا سے جدا ہونے کے بعد مجھے اپنی دنیا کی یاد ستانے لگی تھی اور میں واپس اپنے اکیسویں صدی کے زمانے میں جانے کو بے تاب تھا۔ میں نے دل میں یہی منصوبہ بنایا کہ سلطانہ کے پاس طلسمی طاقت ہے صرف وہی مجھے میری دنیا میں واپس لے جانے کا کوئی طریقہ بتا سکتی ہے۔ اور یہ راز یہ طریقہ میں صرف سلطانہ سے اپنی محبت جتانے کے بعد ہی معلوم کر سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے

فوراً اس ڈپلومیسی پر عمل شروع کر دیا۔ میں نے سلطانہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"سلطانہ! مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ اس محل کو دیکھ کر میری یادداشت آہستہ آہستہ واپس آ رہی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ واقعی میں یہاں بادشاہ بن کر تمہارے ساتھ حکومت کیا کرتا تھا۔"

اتنا سن کر سلطانہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ سلطانہ کے پاس بڑی طلسمی طاقتیں تھیں مگر کسی کے دل کا حال معلوم کرنے کی اس کے پاس طاقت نہیں تھی۔ ورنہ وہ کبھی میری جھوٹی محبت کے اظہار پر یقین نہ کرتی۔ اسے اپنی طلسمی طاقت کے ذریعے فوراً پتہ چل جاتا کہ میں فریب سے کام لے رہا ہوں اور اس سے اظہار محبت کر کے اور اپنی یادداشت واپس آ جانے کا ڈرامہ کر کے اس سے اپنی دنیا میں واپس جانے کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

حیرت کی بات ہے کہ مجھے یہ بالکل احساس تک نہیں تھا کہ سلطانہ میرے واپس ماڈرن دنیا میں جانے کے سارے دروازے بند کرنے کی ترکیب پر عمل کرنے والی ہے۔ اس کا علم مجھے بعد میں جا کر ہوا۔ لیکن اس وقت بڑی دیر ہو چکی تھی۔ سلطانہ میرے ساتھ لگ گئی۔ خوشی سے نہال ہو کر بولی۔

میرے کارلوس۔ میرے شہزادے، خداوند کا شکر ہے کہ تمہاری یادداشت واپس آ رہی ہے اور تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ بس میں تمہاری زبان سے یہی سننا چاہتی تھی۔ آؤ اب میں تمہیں ایک اور شے دکھاتی ہوں۔ تمہارے ان جملوں نے جو طلسمی اثر کیا ہے میں تمہیں اس کا اثر دکھاتی ہوں۔ اسے دیکھ کر تمہیں خود یقین ہو جائے گا کہ تم ہی میرے محبوب شہزادے اور میرے بادشاہ ہو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ ایک بار پھر نیچے تہہ خانے میں اس کمرے میں لے گئی جہاں ایک تابوت رکھا تھا اور جس کے اندر میری میت پڑی تھی۔ اس نے اندر جاتے ہی دوڑ کر تابوت کو کھول دیا اور خوشی سے چیخ کر بولی۔

"دیوتا زیوس نے میرا چلہ قبول کر لیا ہے۔ اور تم میرے پاس واپس آ گئے ہو

میرے شہزادے! آؤ- اپنی آنکھوں سے آکر دیکھ لو-"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تابوت کے پاس لے آئی- اب جو میں نے جھانک کر دیکھا تو تابوت میں میری لاش غائب تھی- سلطانہ نے کہا-

"تم اپنے زندہ جسم میں واپس آکر مجھے دوبارہ مل گئے ہو- اگر یہ بات نہ ہوتی تو تمہاری میت کبھی تابوت سے غائب نہ ہوتی-"

میں خود یہ کرامت دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا- مگر وہی بات کہ میں جانتا تھا کہ میں ماضی کے زمانے کا خواب دیکھ رہا ہوں اور خواب میں کچھ بھی ہو سکتا ہے- میں اس خواب کی دنیا سے واپس جانے کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا جس کو مجھے صرف سلطانہ ہی بتا سکتی تھی- میں نے اس سے بھرپور اظہار محبت کرتے ہوئے کہا-

"ہاں سلطانہ! اب مجھے سب کچھ یاد آگیا ہے- میں اس ملک کے شاہی خاندان کا شہزادہ تھا- اور تم سے شادی کر کے میں نے تمہیں اپنی ملکہ بنالیا تھا- میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ سوا دو ہزار برس کے بعد پھر تم مجھے مل گئی ہو- اب ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے- ہم ہمیشہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے-"

سلطانہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا- وہ مجھے لے کر محل کے شاہی تخت والے کمرے میں آگئی اور مجھے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور بولی-

"میرے پیارے شہزادے کارلوس- میں تمہیں سوا دو ہزار سال کے زمانے میں واپس لے جا رہی ہوں- جب ہم دونوں اس ملک پر حکومت کرتے تھے- تم میرے ساتھ رہنا"-

میرے لئے خواب میں ہزار دو ہزار سال کے زمانے میں واپس جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا- میں تو ماضی میں آچکا تھا- اب میرے لئے ہزار سال پرانا زمانہ ہو یا دو ہزار سال پرانا زمانہ ہو- مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا- میں نے کہا-

"ہاں سلطانہ! ہم ضرور اپنے زمانے میں واپس جائیں گے تاکہ اپنے ملک پر پھر سے حکومت کریں میں بادشاہ بن کر تخت پر تمہارے ساتھ بیٹھوں مگر ہم اتنے پرانے زمانے میں کیسے واپس جائیں گے-"

سلطانہ نے کہا- "میرے شہزادے زیوس کا چلہ کاٹنے کی وجہ سے میرے اندر بڑی طلسمی طاقتیں بیدار ہو چکی ہیں- میں ان طلسمی طاقتوں کی مدد سے تمہیں اپنے پرانے زمانے میں لے جاؤں گی- تم میرے ساتھ تخت پر بیٹھے رہو-"

پھر اس نے کوئی عمل پڑھنا شروع کر دیا- کچھ دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے کوئی عمل پڑھتی رہی- اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا-

"کارلوس! آنکھیں بند کر کے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو-"

میں نے ایسا ہی کیا- اس کے بعد مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا اور مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے مجھے اوپر اٹھا لیا ہو- مجھے تازہ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے محسوس ہونے لگے- سلطانہ کی آواز میرے کان میں آئی-

"کارلوس آنکھیں بند رکھنا"

میں نے آنکھیں بند رکھیں- فضا ایک دم نیم گرم سی ہو گئی- یہ کافی دیر تک رہی میرے کانوں میں ایسی گونج سنائی دینے لگی جیسے میں کسی سرنگ میں سے گزر رہا ہوں- اس کے بعد فضا میں ہلکی ہلکی خنکی آگئی- میں جیسے نیچے آنے لگا- ایک جگہ جیسے میں رک گیا- ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا- اس کے ساتھ ہی مجھے لوگوں کے شور وغل کی آوازیں سنائی دیں- پھر میں کسی قالین پر بیٹھ گیا- سلطانہ نے کہا-

"کارلوس! آنکھیں کھول دو-"

میں نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں کسی محل کے بہت وسیع کمرے میں ایک عالی شان تخت پر شاہی لباس پہنے بیٹھا ہوں- سلطانہ ملکہ کے لباس میں سر پر تاج رکھے میرے پہلو میں بیٹھی ہے- میرے سر پر بھی تاج ہے- یہ محل کا شاہی دربار ہے- دربار میں امراء، روساء جمع ہیں اور مجھے دیکھ کر خوشی سے نعرے لگا رہے ہیں- پھر ایک بوڑھا آدمی جس نے لمبی عبا پہن رکھی تھی- شاہی عصا تھامے میرے تخت کے قریب آیا- اس نے تین بار جھک کر میری تعظیم کی اور اس زمانے کی لاطینی زبان میں جسے میں سمجھتا تھا کہا-

"بادشاہ مملکت کی آمد مبارک ہو- رعایا آپ کے واپس آنے پر خوشیاں منا رہی ہے- یہ ہماری اور ہمارے ملک کی خوش قسمتی ہے کہ

آپ ہماری راہنمائی کے لئے واپس تشریف لے آئے۔ آج کے عظیم
جشن مسرت کے موقع پر میں اپنے امرا روسا اور اہل دربار کی جانب
سے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

اس کے بعد وہاں جشن کا سماں پیدا ہو گیا۔ افریقہ، وادی لبنان اور مصر و شا
کی حسین رقاصائیں رقص کرنے لگیں۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خوا
کے اندر خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ جشن آدھی رات تک جاری رہا۔ اس کے بعد م
اپنی ملکہ سلطانہ کے ساتھ اپنی شاہی خواب گاہ میں آگیا۔ سلطانہ بے حد خوش تھی۔ و
میرے پاس بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"کارلوس! دیوتاؤں نے سینکڑوں برس کے بعد مجھے خوشی کی یہ
گھڑیاں عطا کی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اب یہ پرمسرت ایام کبھی ختم
نہ ہوں۔"

میں نے کہا۔ "سلطانہ! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد سو گئے۔ میرے دن رات عیش
و آرام سے شاہی محل میں گزرنے لگے۔ لیکن میں وہاں ہمیشہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں
اگرچہ خواب کی دنیا میں تھا اور اس خواب کو توڑنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ پھر بھی
میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ خواب ٹوٹ جائے اور میں اپنی ماڈرن دنیا میں
واپس چلا جاؤں گا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ بزرگ کی دی ہوئی زمرد کی انگوٹھی کی
جتنی حفاظت کر سکتا ہوں حفاظت کروں۔ کیونکہ بزرگ نے فرمایا تھا۔

"اگر یہ انگوٹھی تم سے گم ہو گئی تو یاد رکھو پھر تم کبھی ماضی کے زمانے
اپنے زمانے میں واپس نہ آسکو گے۔"

یہ انگوٹھی میں نے اپنی انگلی میں پہن رکھی تھی۔ اس بات کا سلطانہ کو بھی علم
تھا کہ جب تک یہ انگوٹھی میرے پاس ہے کوئی بھی طاقت مجھے اس سے جدا کر کے
واپس میری دنیا میں لے جا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ میری انگوٹھی مجھ سے لے کر اپنے پاس
رکھنے کی فکر میں تھی تاکہ نہ یہ انگوٹھی میرے پاس ہو گی اور نہ میں اپنی دنیا میں واپس
جا سکوں گا۔ پہلے تو اس نے میری انگوٹھی کے بارے میں کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی

تھی لیکن جب مجھے بادشاہ کی حیثیت سے اس کے پاس رہتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تو
ایک رات وہ بڑی محبت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

"کارلوس! تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "ایسا کبھی نہ سوچنا سلطانہ میں اپنی زندگی کے حسین ترین لمحات
تمہارے ساتھ بسر کر رہا ہوں۔ مجھے تمہیں چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

حیرانی کی بات تھی کہ اس نے میری انگوٹھی کے بارے میں اس دفعہ بھی کوئی
بات نہ کی۔ وہ بڑی دیر تک مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اپنا سر میری گود
میں رکھ کر سو گئی۔ اتنے میں ایک افریقی کنیز جس کا نام یورکا تھا دبے پاؤں اندر داخل
ہوئی۔ صرف اس کنیز کو سلطانہ نے رات کے وقت بھی اندر آنے کی اجازت دے
رکھی تھی۔ اس افریقی کنیز کی عمر اٹھارہ برس کے قریب تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔
چہرے پر ذہانت کی چمک تھی۔ آنکھیں سیاہ ہیروں کی مانند روشن تھیں۔ اس کنیز کو
سلطانہ نے خود پالا تھا اور اس پر سلطانہ کو بے حد اعتماد تھا۔ اس وقت یورکا خواب گاہ
میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں سونے کا طشت تھا جس میں سرخ شراب کے جام
چھلک رہے تھے۔ اس نے طشت سنگ اسود کی چھوٹی میز پر رکھ دیا اور میری طرف
بڑی پراسرار نظروں سے دیکھا۔ پھر خاموشی سے دروازے کی طرف چل پڑی۔
خواب گاہ کے دروازے کے پاس جا کر وہ رک گئی۔ اس نے گردن پھیر کر ایک بار پھر
میری طرف دیکھا اور ایک دو سیکنڈ تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد خواب گاہ کا بھاری
مخملیں پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کنیز یورکا مجھے کچھ کہنے کی کوشش
کر رہی تھی۔ اس کا میری طرف دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ میرے دل کی حالت جان
گئی ہے۔ اور اس کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں اصل میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا
ہوں۔ اور اب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ شاید وہ مجھے یہی کچھ بتانا چاہتی تھی۔ ملکہ
سلطانہ ایک دم جاگ پڑی۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھ سے پوچھا۔ کون تھا؟ میں نے
کہا۔

"کوئی نہیں تھا"

دوسری رات بھی جب میں خواب گاہ میں ملکہ سلطانہ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

اور یورکا ہمیں پھل اور مشروب پیش کر رہی تھی تو اس نے ایک دو بار میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں موقع نکال کر افریقی کنیز یورکا سے ضرور پوچھوں گا کہ وہ مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھتی ہے۔ کیا وہ مجھے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اگرچہ بادشاہ کے اختیار میں سب کچھ ہوتا ہے لیکن اس کا منصب اور شاہانہ ادب آداب کے تکلفات اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ کسی کنیز سے رازداری کے ساتھ کوئی بات کر سکے۔ لیکن میں کوئی بادشاہ وغیرہ نہیں تھا۔ میں ہر حالت میں یورکا کنیز سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کیا کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ اس کنیز کی مدد سے میرے خواب کے ٹوٹنے کا کوئی سبب پیدا ہو جائے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ افریقی عورتیں اور مرد کالے علم کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔

آخر ایک دن مجھے موقع مل گیا۔ میں ایک شام کو محل کی شاہی نشست گاہ میں اکیلا بیٹھا اپنے آغاز اور انجام پر غور کر رہا تھا۔ ملکہ سلطانہ شاہی چشمے پر اپنی کنیزوں کے ساتھ نہانے گئی ہوئی تھی کہ یورکا میرے لئے مشروب کا گلاس طشت میں رکھ کر نشست گاہ میں آ گئی۔ اس نے میرے قریب پڑی سنگ مرمر کی میز پر طشت رکھا اور واپس جانے لگی تو میں نے اسے کہا۔

"یورکا! ٹھہرو"

وہ رک گئی اور میری طرف مڑتے ہوئے سر کو تعظیم کے انداز میں جھکائے ہوئے کہا۔ "حکم بادشاہ سلامت!"

میں نے کہا۔ "یورکا! پچھلے کچھ دنوں سے میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھے کبھی کبھی اس انداز سے دیکھتی ہو جیسے تم مجھے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم بلا خوف و خطر جو بات کرنا چاہتی ہو کرو۔ میں اگر تمہاری کوئی مدد کر سکا تو ضرور کروں گا؟

یورکا اسی طرح میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"اگر آپ مجھے یقین دلا دیں کہ جو کچھ میں آپ سے کہوں گی آپ اس کا ذکر ملکہ سلطانہ سے نہیں کریں گے تو میں آپ کو بہت کچھ بتا سکتی ہوں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا راز صرف میرے سینے میں ہی رہے گا۔ میں اس کا ذکر ملکہ سلطانہ سے بھی نہیں کروں گا؟

یورکا بولی۔ "تو پھر یہ راز میں آپ کو اس وقت نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ ملکہ صاحبہ کسی بھی وقت یہاں واپس آ سکتی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر یہ راز تم مجھے کہاں بتاؤ گی؟"

یورکا بولی۔ "آج رات چاند غروب ہو جائے تو محل کے پائیں باغ میں انجیر کے درختوں کے پاس آ جائیں۔ میں آپ کو وہاں ملوں گی۔"

میں نے کہا۔ "میں ملکہ کو چھوڑ کر کیسے آ سکتا ہوں۔ اگر اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے مجھے بستر پر نہ دیکھا تو میری تلاش میں نکل کر باغ میں آ سکتی ہے۔"

یورکا نے کہا۔ "میں آپ کو ایک بے ضرر سفید سفوف لا کر دیتی ہوں۔ وہ مشروب میں ملا کر ملکہ کو پلا دیجئے گا۔ ملکہ صبح تک آرام سے سوئی رہیں گی"

میں نے کہا۔ "مجھے ابھی وہ سفوف لا کر دو"

یورکا چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سفوف کی چھوٹی سی پڑیا دے کر کہا۔

"اس میں وہ سفوف ہے۔ یہ بالکل بے ضرر ہے اس کے پینے سے ملکہ کو گہری نیند آ جائے گی اور کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے سفوف لے کر رکھ لیا اور یورکا سے کہا۔

"میں آدھی رات کے وقت جب چاند غروب ہو جائے گا میں انجیر کے جھنڈ میں پہنچ جاؤں گا۔"

یورکا سر جھکا کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سلطانہ کنیزوں کے ساتھ نشست گاہ میں آ گئی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن اس کے حسن سے اب مجھے خوف آنے لگا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سلطانہ میرے خلاف کوئی سازش کر رہی ہے۔ اس رات میں نے اسے مشروب میں سفوف ملا کر پلا دیا۔ اس کے فوراً بعد وہ گہری نیند سو گئی۔ میں جاگتا رہا۔ جب آدھی رات گزر گئی اور چاند آسمان پر غروب ہو گیا تو میں محل کے خفیہ دروازے سے

نکل کر پائیں باغ میں انجیر کے درختوں کے جھنڈ میں آ گیا- یور کا پہلے سے وہاں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی- مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی- میں نے کہا-

"بیٹھی رہو"

اور میں بھی اس کے پاس سنگ مرمر کے بنچ پر بیٹھ گیا- انجیر کے درختوں میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا- اس اندھیرے میں ستاروں کی دھیمی روشنی بڑی مشکل سے داخل ہو رہی تھی- یور کا کی طلسمی آنکھیں بھی ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں- میں نے اس سے پوچھا-

"اب بتاؤ یور کا تم مجھے کیا بتانا چاہتی ہو؟ وہ کونسا ایسا راز ہے جو تم مجھ پر ظاہر کرنا چاہتی ہو؟"

یور کا نے کہا- پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ بادشاہ کارلوس نہیں ہیں"-

میں ٹھٹھک سا گیا- مجھے توقع نہیں تھی کہ ایک عام کنیز مجھ سے ایسی حیرت انگیز اور گہری راز کی بات کہے گی- میں بڑا حیران ہوا کہ آخر اسے یہ کیسے پتہ چل گیا- میں نے اس سے پوچھا-

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں بادشاہ کارلوس نہیں ہوں"

یور کا بولی- "میں افریقہ کی رہنے والی ہوں- میرے پاس کالے علم کی طلسمی طاقت ہے- آپ کو دیکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں-"

میں نے کہا- "لیکن اگر میں بادشاہ کارلوس نہیں ہوں تو پھر تابوت میں سے کارلوس کی لاش کیسے غائب ہو گئی تھی"

یور کا نے کہا- وہ لاش ملکہ سلطانہ کے حکم سے غائب کی گئی تھی-

اب ملکہ سلطانہ کی سازش کی کڑیاں میرے سامنے کھلنا شروع ہو گئیں- میں نے کہا- "تو پھر میری شکل کارلوس جیسی کیوں ہے"

یور کا کہنے لگی- "آپ اتفاق سے اس کے ہم شکل ہیں- ملکہ سلطانہ کو بادشاہ کارلوس سے بے پناہ محبت تھی- چونکہ ملکہ سلطانہ کے پاس ایک خاص جادو کا عمل ہے

جس کو پڑھ کر وہ مرنے کے بعد بھی انسانی شکل میں دنیا میں واپس آ سکتی تھی- اس لئے کارلوس کی موت کے بعد جب ملکہ سلطانہ بھی انتقال کر گئی تو اس کی روح عالم بالا کی طرف جانے کی بجائے اس محل میں بھٹکنے لگی- پھر جادوئی عمل سے ملکہ کی روح نے انسانی شکل اختیار کر لی اور اس نے دیوتا زیوس کا ایک خاص چلہ کاٹا- چلہ کاٹنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا کہ ایک نوجوان اگلے زمانے میں رہتا ہے جس کی شکل ہو بہو کارلوس کی شکل سے ملتی ہے چنانچہ ملکہ سلطانہ نے اپنے عمل کے زور سے تمہیں مستقبل کے زمانے سے ماضی کے زمانے میں بلا لیا اور قرطبہ کے شاہی باغ سے تمہیں تخت پر بٹھا کر ماضی کے زمانے میں لے آئی اور اس محل میں لا کر اس نے تمہیں کارلوس کی میت دکھا کر یقین دلا دیا کہ تم ہی بادشاہ کارلوس ہو- اور تمہارے اس یقین کو اور پختہ کرنے کے لئے کارلوس کی لاش بھی غائب کرا دی- اب اس نے تمہیں بادشاہ کے روپ میں اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جبکہ تمہارا ملکہ سلطانہ اور ماضی کے اس زمانے سے کوئی تعلق نہیں ہے؟"

یور کا بات کرتے کرتے مجھے آپ کہتے کہتے قدرتی طور پر تم کہنے لگی تھی میں نے کہا-

"یور کا! کیا تم مجھے اس عذاب سے نجات دلا سکتی ہو- میں تمہارا یہ احسان ساری عمر یاد رکھوں گا-"

یور کا نے کہا- "میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی- مجھے سوچنے کا موقعہ دو-"

اس کے بعد وہ چلی گئی- میں بھی محل میں آ کر اپنی خواب گاہ میں لیٹ گیا-

دوسرے روز سلطانہ دیر تک سوتی رہی- جب بیدار ہوئی تو کافی دن نکل آیا تھا- میں اس کے پاس خواب گاہ میں ہی تھا- اٹھتے ہی مجھے آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھ کر بولی-

"کارلوس! میں اتنی دیر کبھی نہیں سوئی-"

میں نے کہا- "کبھی کبھی انسان کو بڑی گہری نیند آ جاتی ہے- اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے-"

اس روز سارا دن سلطانہ میرے ساتھ ہی رہی- ہم نے اکٹھے کھانا کھایا- اس کے بعد اکٹھے شاہی باغ میں سیر کرتے رہے- رات کو ایک ساتھ کھانا کھایا اور پھر

مشروب پی کر سو گئے۔ میں بزرگ کی دی ہوئی انگوٹھی ہمیشہ اپنی انگلی میں پہنے رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی نہیں اتارا تھا۔ اس روز صبح جب میں سو کر اٹھا تو میری انگلی میں سے انگوٹھی غائب تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ کیونکہ زمرد کی اس انگوٹھی کے گم ہونے کا مطلب تھا کہ اب میں کبھی اپنی دنیا میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اور میرے واپس جانے کے تمام امکانات ختم ہو گئے تھے۔ مجھے زمرد کی انگوٹھی دیتے ہوئے بزرگ نے واضح الفاظ میں کہا تھا۔

"اس انگوٹھی کو سنبھال کر رکھنا۔ اگر یہ گم ہو گئی تو تم اپنی دنیا میں کبھی واپس نہ آسکو گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماضی کی خواب ایسی دنیا میں گم ہو جاؤ گے۔"

میں نے اسی وقت سلطانہ کو جگایا اور پوچھا۔

"سلطانہ! میری انگوٹھی غائب ہو گئی ہے۔ اسے تم نے تو کہیں نہیں دیکھا"

سلطانہ میری انگوٹھی کے غائب ہونے کا سن کر مجھ سے زیادہ پریشان ہو گئی کہنے لگی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم تو ہمیشہ اسے اپنی انگلی میں پہنے رکھتے ہو۔ پھر یہ کہاں چلی گئی؟"

میں نے کہا۔ "یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "کہیں باغ میں نہ گر گئی ہو۔ چلو شاہی باغ میں چل کر دیکھتے ہیں"۔

وہ اسی وقت اٹھ کر لمبی ریشمی عبا پہن کر میرے ساتھ شاہی باغ میں آ گئی۔ ہم نے باغ کا ایک ایک کونہ چھان مارا، روشوں کو دیکھا، جھاڑیوں میں تلاش کیا مگر انگوٹھی کہیں نہ ملی۔ واپس خواب گاہ میں آ کر بستر الٹ کر دیکھا۔ قالینوں پر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر انگوٹھی تو جیسے غائب ہی ہو گئی تھی۔ اس خیال سے کہ میرے واپس اپنی دنیا میں جانے کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ میں سخت پریشان رہنے لگا۔ سلطانہ میرا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ مجھے تسلی دیتی کہ انگوٹھی گم ہوئی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب تو تمہیں ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ میں اس کے ساتھ ہمیشہ رہنے کے لئے ہر گز تیار نہیں ہوں۔ اس دوران شاہی افریقی کنیز یورکا معمول کے

مطابق مشروبات وغیرہ پیش کرنے آتی اور میری طرف غور سے دیکھ کر واپس چلی جاتی۔

ایک روز وہ نشست گاہ میں آئی تو میں اکیلا پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ وہ چاندی کے گلدان میں تازہ پھول سجا کر لائی تھی۔ گلدان میز پر رکھنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم کئی دن سے پریشان ہو۔ ایسی کونسی بات ہو گئی ہے۔"

میں نے اسے بتا دیا کہ میری سرخ زمرد والی چاندی کی انگوٹھی گم ہو گئی ہے۔ اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں واپس اپنی دنیا میں نہیں جا سکوں گا۔ اس نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

"سنو! وہ انگوٹھی گم نہیں ہوئی۔ اسے گم کر دیا گیا ہے۔"

میں حیران ہو کر اس کی طرف تکنے لگا۔ اس نے کہا۔

"ہاں تمہاری انگوٹھی ملکہ سلطانہ نے اپنے قبضے میں کر رکھی ہے۔"

"وہ کس لئے؟" میں نے پوچھا۔

یورکا نے کہا۔ "وہ اس لئے کہ تم اگر چاہو بھی تو اپنی دنیا میں واپس نہ جا سکو۔ اب تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملکہ سلطانہ کے قبضے میں ہو۔"

میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا تھا۔ مجھے سلطانہ اپنے اصلی روپ میں نظر آنے لگی تھی۔ ایسا اگرچہ اس نے اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا مگر اس طرح اس نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا تھا جو مجھے کسی حالت میں بھی گوارا نہیں تھا۔ میں نے یورکا سے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی سلطانہ سے اپنی انگوٹھی واپس لیتا ہوں۔ اس کو مجھے اپنا غلام بنانے کا اپنا قیدی بنانے کا کوئی حق نہیں ہے"

یورکا نے اپنی انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہر گز ہر گز ایسی بے وقوفی نہ کرنا۔ ورنہ ملکہ سلطانہ تم پر ایسا طلسم پھونک دینے پر مجبور ہو جائے گی کہ جس کے اثر سے تم اپنے ماضی کو

اپنی اس دنیا کو جہاں سے تم آئے ہو بالکل بھول جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "اگر اس کے پاس کوئی ایسا طلسم ہے تو پھر اسے میری انگوٹھی قبضے میں لینے کی کیا ضرورت تھی وہ انگوٹھی کے بغیر ہی مجھ پر طلسم پھونک کر اپنا قیدی بنا سکتی تھی۔"

یورکا بولی۔ "یہ کالے علم کا طلسم ہے۔ اس طلسم کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کچھ شرطیں ہوتی ہیں جو پوری کرنی بڑی ضروری ہوتی ہیں اور جن کے پورا کئے بغیر طلسم کا اثر نہیں ہوتا۔ تمہارے بارے میں طلسم کی یہ شرط ہے کہ تم طلسم کرنے والی پر انگوٹھی کے غائب کرنے کا الزام لگاؤ جب تم اس پر الزام لگاؤ گے تو طلسم کرنے والی کو حق ہو گا کہ وہ اس کے جواب میں تم پر طلسم پھونک سکے اور اس کے بعد جب وہ طلسم پھونکے گی تو وہ پوری طرح سے تم پر اثر کرے گا۔

اس لئے تم ملکہ سلطانہ سے یہی ظاہر کرو کہ تمہیں ملکہ پر ذرا سا بھی شک نہیں ہے۔ اگر وہ تم سے پوچھے بھی کہ کہیں تمہیں مجھ پر شک تو نہیں ہے کہ انگوٹھی میں نے گم کی ہے تو تم یہی کہنا کہ نہیں ملکہ مجھے تم پر ذرا سا بھی شک نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ "لیکن اس سے کیا فرق پڑے گا۔ میری انگوٹھی تو پھر بھی واپس نہیں آئے گی۔"

یورکا نے کہا۔ "انگوٹھی کی تم فکر نہ کرو۔ اس کا پتہ میں اپنے طلسم سے لگا لوں گی۔ اگرچہ ملکہ سلطانہ کے پاس مجھ سے زیادہ طلسمی طاقت ہے۔ لیکن میں نے بھی افریقہ کے ایک بڑے پرانے جادوگر سے کالا علم سیکھا ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح تمہاری انگوٹھی کا کھوج لگا لوں گی۔"

میں خاموش ہو گیا۔ یورکا نے پہلی بار میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اصل میں یہی وہ راز تھا جو میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ ملکہ سلطانہ تمہاری دوست نہیں ہے۔ وہ تمہارے خلاف ایک سازش کر رہی ہے آج وہ سازش پوری ہو گئی ہے اس نے۔ تمہاری انگوٹھی غائب کر

کے تم کو ہمیشہ کے لئے اپنا قیدی بنا لیا ہے۔"

میں نے بے بسی کے عالم میں یورکا سے کہا۔

"یورکا! خدا کے واسطے کچھ کرو اور میری انگوٹھی مجھے واپس لا دو اور مجھے بتاؤ کہ میں اس عذاب سے کیسے نجات حاصل کر سکتا ہوں۔"

یورکا میرے قریب ہو گئی۔ مجھے اس کے جسم کی گرمی محسوس ہونے لگی۔ اس کا سانس چلتا مجھے صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں تمہیں اس عذاب سے نکال سکتی ہوں۔ لیکن پہلے تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"میں ہر وعدہ کرنے، تمہاری ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ بولی۔ "مجھ سے وعدہ کرو کہ مجھ سے جدا ہو کر جب تم اپنی دنیا میں واپس چلے جاؤ گے تو مجھے ہمیشہ محبت کے ساتھ یاد کرو گے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ بھلا یہ کیسی شرط ہے جو یہ لڑکی مجھ سے منوانا چاہتی ہے۔ میں نے فوراً کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی تم مجھے یاد آؤ گی تو میں محبت کے ساتھ تمہیں یاد کروں گا۔"

وہ بولی۔ "یونہی نہیں۔ بلکہ دل سے کہو۔ میرے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو"۔

میں نے یورکا کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ہاتھ نے یورکا کے جسم کی گرمی اور اس کے دل کی دھڑکن محسوس کی ایک عجیب سرور انگیز گرم سی لہر میرے ہاتھ کی انگلیوں سے بھر کر جیسے میرے سارے بدن میں سرائیت کر گئی۔ اس وقت مجھے ایسے لگا جیسے میں واقعی دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتا ہوں تو وہ صرف اور صرف یہی افریقی کنیز یورکا ہے میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں یورکا۔ کہ تم سے جدا ہونے کے بعد میں تمہیں بڑی محبت بھرے دل کے ساتھ یاد کیا کروں گا۔"

یورکا کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بے شمار ستارے چمکنے لگے۔

اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا اور بولی۔

"تمہاری زبان سے یہ محبت بھرے الفاظ سننے کے لئے میں ترس گئی تھی۔"

پھر اس نے اپنا چہرہ میرے سینے سے اٹھایا اور بولی۔

"میں تمہیں دو دن کے بعد بتاؤں گی کہ تمہاری انگوٹھی کہاں پر ہے اور اسے دوبارہ کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ نشست گاہ سے تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس رات جب ملکہ سلطانہ نے بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

"میرے پیارے کارلوس! کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ تمہاری انگوٹھی میں نے غائب کر دی ہے؟"

اس وقت مجھے یورکا کی وہ بات یاد آ گئی جب اس نے کہا تھا کہ ملکہ سلطانہ تم سے ضرور ایسی بات پوچھے گی اور کسی نہ کسی طرح تمہیں مجبور کرنے کی کوشش کرے گی کہ تم اس پر انگوٹھی غائب کرنے کا الزام لگاؤ تاکہ اس کی طلسم کی شرط پوری ہو جائے اور اس کے بعد اس کے طلسم میں اثر آ جائے اور وہ تم پر طلسم پھونک کر جس دنیا سے تم آئے ہو اور جس دنیا میں تم واپس جانا چاہتے ہو اس کا خیال ہمیشہ کے لئے تمہارے دل و دماغ سے نکال دے اور تم اس کے اور صرف اس کے قیدی بن کر ساری زندگی اس کے ساتھ رہ سکو۔ میں نے فوراً کہا۔

"نہیں سلطانہ۔ ایسی بات بالکل نہیں ہے تمہیں یہ خیال ہی کیوں آیا کہ میں تم پر شک کروں گا۔"

سلطانہ بولی۔ "مجھے ایسے محسوس ہوا تھا کہ تمہیں مجھ پر شک ہے اور تم مجھ پر انگوٹھی غائب کرنے کا الزام لگا رہے ہو۔"

سلطانہ بڑی ہوشیاری سے مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر یورکا نے عین وقت پر مجھے خبردار نہ کر دیا ہوتا تو شاید میں اس کے جال میں ضرور

پھنس جاتا۔ میں نے فوراً کہا۔

"ہرگز نہیں۔ میں تم پر کیوں الزام لگاؤں گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں سلطانہ میں بھول کر بھی یہ شبہ نہیں کر سکتا کہ انگوٹھی تم نے غائب کی ہے، الزام لگانا تو بڑی دور کی بات ہے۔"

اس کے بعد سلطانہ نے موضوع بدل دیا۔ شاید وہ کسی دوسرے موقع پر مجھ پر جال پھینکنا چاہتی تھی۔ دو دن گزر گئے۔ اس دوران افریقی کنیز یورکا سے میرا آمنا سامنا ہوتا مگر وہ میری طرف دیکھ کر ہلکے سے تبسم کے ساتھ چلی جاتی۔ تیسرے دن میں اپنی شاہ نشین میں بیٹھا تھا کہ یورکا شمع دان رکھنے کے بہانے وہاں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا شمع دان تھا۔ شمع دان اس نے کونے والی تپائی پر رکھ دیا اور کپڑے سے اسے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"تمہاری انگوٹھی کا سراغ مل گیا ہے۔ لیکن اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔ "کہاں چلنا ہو گا؟"

یورکا بولی۔ "میرے ملک سماریہ چلنا ہو گا۔"

میں نے پوچھا کہ یہ سماریہ کون سا ملک ہے اور کس جگہ پر واقع ہے۔ کیونکہ کچھ ملکوں کے نام اب کچھ اور ہیں اور ماضی میں کچھ اور ہوا کرتے تھے۔ یورکا نے بتایا کہ سماریا نام کا ایک چھوٹا سا ملک بحیرہ روم کے کنارے صحرا کے جنوب کی طرف آباد ہے۔ میں نے کہا۔

"میری انگوٹھی ملکہ نے اتنی دور کیسے پہنچا دی۔ وہاں کون ہے جس کے پاس میری انگوٹھی ہے۔"

یورکا کہنے لگی۔

"یہ مجھے ابھی خود بھی معلوم نہیں ہے۔ یہاں میرا طلسم کوئی کام نہیں کرتا۔ میں تمہیں وہاں اپنی ایک رشتے دار عورت کے پاس لے جا رہی ہوں۔ میرے طلسمی زائچے نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری انگوٹھی صرف وہی عورت بتا سکتی ہے کہ وہ کہاں ملے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا وہ عورت کوئی جادوگرنی ہے؟"

"ہاں" یورکا نے کہا۔ "وہ افریقہ کی بہت بڑی جادوگرنی ہے اس کا نام تنالی ہے۔ اس وقت اس کی عمر اسی سال ہو گئی ہے۔ مگر وہ بڑی صحت مند ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم سماریہ کیسے جائیں گے؟"

وہ بولی۔ "رات کے دوسرے پہر یہاں سے سماریہ کے قافلے چلتے ہیں۔ ہم

اس قافلے کے ساتھ سفر کریں گے اور ایک ہفتے میں سماریہ پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "تم ملکہ کو کیا کہہ کر جاؤ گی؟"

اس نے کہا۔ "میں اسے کہہ دوں گی کہ میری ماں بیمار ہے۔ میں اس کی خبرگیری کے واسطے جا رہی ہوں۔ مگر تم ملکہ سے کیا کہو گے؟ کیا تم ملکہ سے جدا ہو سکو گے"

میں نے کہا۔ "کیوں نہیں وہ میری دشمن ہے۔ مجھے اس سے جدا ہونے کا کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ بلکہ میں تو خود اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

یورکا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"پھر تم کل رات کے دوسرے پہر کے شروع ہوتے ہی کارواں سرائے میں پہنچ جانا میں پہلے سے وہاں موجود ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "کہیں ملکہ کو اپنے طلسم کے ذریعے میرے فرار کا پتہ تو نہیں چل جائے گا؟"

یورکا بولی۔ "اگر ملکہ کو طلسم آتا ہے تو میں بھی کالے علم جانتی ہوں۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو گے۔ ملکہ کا کوئی طلسم تم پر نہیں چل سکے گا۔"

جب وہاں سے میرے فرار کا منصوبہ طے پا گیا تو مجھے بڑا اطمینان ہو گیا کہ اب مجھے میری انگوٹھی واپس مل جائے گی اور میں اپنی دنیا میں واپس جا سکوں گا۔ دوسری رات میں کوئی دس بجے کے قریب اندازے سے ملکہ کی خواب گاہ سے دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ محل کی ایک خفیہ سرنگ تھی جو شاہی محل کے نیچے سے کارواں سرائے کے بڑے میدان تک جاتی تھی۔ یہ سرنگ اس لئے بنائی گئی تھی کہ اگر دشمن کی فوج محل پر قبضہ کرے تو شاہی خاندان محل سے فرار ہو سکے۔ مجھے اس سرنگ کے بارے میں ملکہ سلطانہ نے بتایا ہوا تھا اور سرنگ کا دروازہ بھی دکھایا تھا جو محل کے ایک باغ میں تھا۔ میں اس سرنگ میں سے گزر کر کارواں سرائے میں پہنچ گیا۔ یورکا میرا انتظار کر رہی تھی۔ ایک قافلہ چلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہم اس قافلے میں شامل ہو گئے اور سماریہ کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ ایک ہفتے کے سفر کے بعد ہم سماریہ پہنچ گئے۔

یورکا مجھے لے کر ایک پہاڑی پر آ گئی۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک قدرتی غار تھا

جس کے دہانے پر خوفناک شکل والا ایک بت لگا ہوا تھا۔ یورکا کہنے لگی۔

"یہ میری رشتے دار جادوگرنی تنالی کے دیوتا کا بت ہے۔ وہ اس کی پوجا کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تنالی ہمیں کہاں ملے گی؟"

یورکا بولی۔

"وہ اس غار کے اندر رہتی ہے۔ میرے ساتھ آجاؤ۔"

میں افریقی کنیز یورکا کے ساتھ غار میں داخل ہوگیا۔ غار کافی کشادہ تھا۔ اس کی چھت بھی اونچی تھی۔ اندر تازہ ہوا کے جھونکے نہ معلوم کہاں سے آرہے تھے۔ آگے جاکر غار ایک طرف کو گھوم گیا۔ آگے ایک چھوٹا سا دالان تھا جس کے درمیان ایک گڑھے میں آگ جل رہی تھی۔ اس گڑھے سے تھوڑا ہٹ کر ایک سفید بالوں والی دبلی پتلی عورت سر پر کالے کوؤں کے پروں کا تاج پہنے ایک چوکی پر بیٹھی کوئی منتر پڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یورکا نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ اس طرف ہوکر بیٹھ جاؤ اور کوئی بات نہ کرنا۔"

ہم اس عورت کی دائیں جانب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک بوڑھی عورت منتر پڑھتی رہی۔ اس کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے۔ خدا جانے وہ کیا پڑھ رہی تھی کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

"یورکا! تم آگئی ہو؟"

یورکا نے کہا۔ "ہاں تنالی دیوی! میں آگئی ہوں۔ میرے ساتھ وہ نوجوان بھی آیا ہے جس کی انگوٹھی ملکہ سلطانہ نے غائب کردی ہے۔"

بوڑھی عورت نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کی بھنوئیں بھی سفید ہو رہی تھیں۔ مگر آنکھوں میں بڑی چمک تھی اور آواز بھی بڑی صاف تھی کہنے لگی۔

میں جانتی ہوں تم کہاں سے آئے ہو۔ مگر تمہیں نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ قدرت کے راز ہوتے ہیں جن کو فاش کرنے کا تمہیں کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ تم نے ماضی کی دنیا میں آکر قدرت کے قانون کی خلاف

ورزی کی ہے۔ جس کی سزا تمہیں بھگتنی ہی پڑے گی۔"

میں نے کہا۔ "میں اپنے اس فعل پر شرمندہ ہوں اور قدرت کی طاقتوں سے معافی کا طلب گار ہوں۔"

بوڑھی جادوگرنی نے زمین پر سے تھوڑی سی خشک گھاس ہاتھ میں لے کر آگ میں ڈال دی اور بولی۔

"یہ تم جانو اور قدرت کے قانون جانیں۔ تمہیں اپنی انگوٹھی چاہئے۔ وہ میں تمہیں بتادوں گی کہ کہاں ہے۔ صرف اس لئے کہ تم یورکا کے ساتھ آئے ہو اور میں یورکا کے آگے انکار نہیں کرسکتی۔"

اس کے بعد اس نے یورکا سے کہا۔

"یورکا! میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم اس نوجوان کی خاطر اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لے رہی ہو؟ انگوٹھی ملکہ سلطانہ نے ایک ایسی جگہ پہنچا دی ہے کہ جہاں تمہارے لئے بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا ہی بتاؤں گی کہ اس مہم میں تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔ اگر تم زندہ بچ گئیں تو کسی بھاری مصیبت میں گرفتار ہوسکتی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لے رہی ہو؟ کیا تم اس نوجوان سے محبت کرنے لگی ہو؟"

یورکا ایک لمحے کے لئے خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"تنالی دیوی! تم سے میرے دل کا حال چھپا ہوا نہیں ہے۔ پھر تم مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہو؟"

بوڑھی جادوگرنی نے بھنوئیں اٹھا کر غصیلی نظروں سے یورکا کی طرف دیکھا اور ترش لہجے میں بولی۔

"کیا تمہیں اس محبت کے انجام کا خوف نہیں ہے؟ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ سینکڑوں برس آگے کے زمانے سے آئے ہوئے نوجوان سے محبت کرنے کا کیا انجام ہوسکتا ہے؟"

یورکا بولی۔ "تنالی دیوی! چاہے میرا کچھ بھی انجام ہو۔ میں اس نوجوان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے اور میں اس کی محبت میں اپنی

جان بھی دے سکتی ہوں۔"

بوڑھی جادوگرنی نے تو جو حیران ہونا تھا وہ تو ہونا ہی تھا لیکن اس سے زیادہ حیرانی مجھے ہو رہی تھی کہ یورکا کیا کہہ رہی ہے۔ مجھے اس نے ایک بار بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اگر وہ پہلے مجھ سے محبت کا اظہار کرتی تو میں اسے صاف صاف کہہ دیتا کہ میں اس سے بالکل محبت نہیں کرتا۔ میں صرف اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں اور اس کے سوا مجھے دنیا کی کسی عورت، کسی شے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن یورکا نے ایک بار بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی سمجھ سے محبت کا انکشاف اس وقت ہو رہا تھا جب مجھے اس کی اشد ضرورت تھی اور میں اسے یہ کہہ کر ناراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا۔

بوڑھی جادوگرنی تنالی نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کے ہونٹ اپنے آپ ہل رہے تھے۔ ایک دم اس نے آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سے چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ رعب دار آواز میں بولی۔

"اگر تجھے مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میری طرف سے تم بے شک مر جاؤ۔ مجھ پر تم نے جو فرض عائد کیا ہے میں اسے ضرور ادا کروں گی۔ اس کے بعد تمہارے ساتھ جو کچھ ہو گا اس کے بارے میں مجھ سے تمہیں کوئی شکایت نہیں رہنی چاہئے۔"

یورکا نے کہا۔

"تنالی دیوی! میں جو کچھ کر رہی ہوں اپنی محبت کے جذبے سے مجبور ہو کر کر رہی ہوں۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری محبت کا انجام برا نہیں ہو گا۔ کیونکہ میری نیت نیک ہے۔ میں صرف محبت کر رہی ہوں کسی سے انتقام نہیں لے رہی۔ اگر اس کے خوف سے مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو میں کسی سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔"

یورکا جیسے جیسے بول رہی تھی مجھ پر حیرت طاری ہو رہی تھی کہ یہ لڑکی مجھ پر دل و جان سے فدا ہے اور اس نے آج تک میرے آگے اپنی زبان نہیں کھولی۔ مجھے

ایک لمحے کے لئے بھی نہیں کہا کہ وہ مجھ سے اتنی شدت سے محبت کرتی ہے۔ اب مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی وجہ سے میں خود کسی عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ کیونکہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ وہ مجھے اچھی ضرور لگتی تھی لیکن میرے دل میں اس کے لئے محبت کا جذبہ کبھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ میرے دل میں محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ لیکن یہ جذبہ ابھی تک عالم خواب میں تھا۔ ایسی کوئی لڑکی ابھی تک مجھے نہیں ملی تھی جو اس جذبے کو عالم خواب سے عالم بیداری میں لا سکتی۔

ہو سکتا ہے یہ میری تلاش محبت ہی ہو جو مجھے میری دنیا سے اٹھا کر ماضی کی دنیا میں لے آئی ہو جو ایک عالم خواب تھا۔

بوڑھی عورت نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں غیض و غضب کی بجائے مہر و محبت کے جذبات چھلک رہے تھے۔ دھیمے مہربان لہجے میں یورکا سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"تو نادان ہے مگر میں تیرے جذبہ محبت کی استقامت سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ تو نے اس نوجوان کے بارے میں اپنے دل کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اگر واقعی وہ سچے ہیں تو میرے دیوتا تمہاری حفاظت کریں گے۔ تمہارا راستہ بڑا کٹھن اور طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تو ایک نہ ایک دن ضرور محبت کی انتہائی اعلیٰ اور بلند ترین منزل کو پا لے گی۔"

اس وقت مجھے بڑا غصہ آگیا کہ یہ آپس میں ہی میری قسمت کا فیصلہ کرنے والی کون ہوتی ہیں۔ میں بھول گیا کہ اگر یورکا مجھ سے ناراض ہو گئی تو میں بزرگ کی دی ہوئی انگوٹھی سے محروم ہو جاؤں گا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر انگوٹھی حاصل کرنے میں میری مدد سے دستبردار ہو جائے گی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماضی کے صحراؤں میں بھٹکتا رہ جاؤں گا۔ میں بھی جذبات میں آگیا میں نے بوڑھی جادوگرنی سے کہا۔

"تم دونوں عورتیں اپنے آپ ہی میرے بارے میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی ہو۔ لیکن تم میں سے کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں بھی یورکا سے محبت کرتا ہوں یا نہیں؟ ہو سکتا ہے مجھے یورکا سے محبت نہ

ہو- ایسی صورت میں یورکا کا میری محبت کی قسمیں کھانا اور میری محبت میں اپنی جان تک قربان کر دینا بے معنی ہو کر رہ جائے گا-
اس پر یورکا نے میری طرف عجیب محبت بھری طلسمی نظروں سے دیکھا اور بولی-

"میں نے تم سے محبت کی ہے- تم سے کوئی سودا نہیں کیا- محبت تو صرف محبت کرنا جانتی ہے- وہ اس کے عوض کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتی- وہ اس خیال سے بے نیاز ہوتی ہے کہ جس کو وہ چاہتی ہے کیا وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں- میں تم سے محبت کرتی ہوں- میری محبت خام ہو گی، گھٹیا اور خود غرض محبت ہو گی اگر وہ صرف اس لئے میرے دل سے ختم ہو جائے گی کہ تم اس کے جواب میں مجھ سے محبت نہیں کرتے- یہی وجہ ہے کہ میں نے تم سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں- میں نے ایک بار بھی تم سے اظہار محبت نہیں کیا- کس لئے؟ صرف اس لئے کہ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں- اس کے جواب میں تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں؟ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے- اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے تمہیں کبھی یہ کیوں نہیں کہا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں- تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو میں تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہوں گی- ہر مشکل گھڑی میں تمہارے اس طرح کام آؤں گی جس طرح اس وقت کام آ رہی ہوں کہ خود تمہارے ساتھ تمہاری انگوٹھی کی تلاش میں شاہی محل کو چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئی ہوں- حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ انگوٹھی حاصل کرنے کے بعد تم ایک نہ ایک دن ضرور مجھ سے جدا ہو جاؤ گے میں یورکا ہوں- ملکہ سلطانہ نہیں ہوں کہ محض اپنی خود غرضی، اپنی محبت کو تسکین دینے کے لئے تمہیں تمہاری اپنی دنیا سے محروم کر کے ہمیشہ کے لئے اپنا قیدی بنا کر رکھوں- نہیں- میری محبت صرف تمہاری

خوشی اور سکون چاہتی ہے اور تمہارے واسطے تمہاری خوشیاں حاصل کرنے کے لئے جان تو کوئی چیز نہیں اگر مجھے اپنی محبت کی بھی قربانی دینی پڑے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی-"

یورکا کے ان خیالات کو سن کر مجھے شرمندگی کا احساس بھی ہوا اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ دبلی پتلی گہرے سانولی رنگ کی افریقی کنیز محبت کے کس اعلیٰ مقام پر پہنچ چکی ہے- میں نے تو ابھی محبت کی تلاش بھی شروع نہیں کی تھی اور اس افریقی کنیز نے محبت کی منزل کو پا لیا تھا- میرے دل میں یورکا کی قدر و منزلت بڑھ گئی- میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا-

"یورکا! میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے- ہو سکتا ہے کہ میں اپنے مطلب کے لئے ایسا کہہ بھی دیتا- لیکن تمہارے چہرے پر میں سچائی کے جس سورج کی روشنی دیکھ رہا ہوں اس کے آگے میں چاہوں بھی تو جھوٹ نہیں بول سکتا- میں تم سے محبت نہیں کرتا لیکن تمہاری محبت کی عظمت کو سلام ضرور کروں گا- تم اس سفر میں مجھ سے بہت آگے نکل گئی ہو-"

یورکا کہنے لگی- "محبت یہ نہیں دیکھتی کہ جس سے اسے محبت ہے وہ اس سے آگے نکل گیا ہے یا پیچھے رہ گیا ہے- اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے پیچھے رہ گئے ہو تو یقین کرو- میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلوں گی-"

پھر اس نے بوڑھی افریقی عورت کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تنالی دیوی! حکم کرو کہ مجھے اپنے محبوب کی انگوٹھی حاصل کرنے کے لئے کہاں جانا ہو گا- کیا کرنا ہو گا-"

بوڑھی عورت نے دو تین بار کوئی منتر پڑھ کر سوکھی گھاس آگ کے الاؤ میں ڈالی اور کہا-

"سماریہ کی بندرگاہ سے تم سمندری جہاز میں سوار ہو کر ایک ماہ کے سفر کے بعد سنگدیپ کے جزیرے میں پہنچو گی- سنگدیپ کے جزیرے کے جنوب میں ایک اور جزیرہ ہے جو آدم خور جزیرے کے نام سے

مشہور ہے اور جس کا نام زبان پر لاتے ہوئے بھی لوگ کانپ جاتے ہیں۔ اس جزیرے میں ایک پہاڑی ہے جس کی تین چوٹیاں ہیں۔ اس پہاڑی میں ایک قدرتی غار ہے۔ اس غار میں اسی جزیرے کے آدم خور جنگلیوں کا سردار رہتا ہے۔ سلطانہ نے اس نوجوان کی انگوٹھی اس سردار کے پاس پہنچا دی ہے۔ یہ سردار بہت بڑا جادوگر بھی ہے۔ وہ انگوٹھی کو اپنے غار میں اپنے بستر کے سرہانے کی جانب ایک طاق میں رکھتا ہے۔ یہ انگوٹھی چاندی کی ایک ڈبی میں بند ہوتی ہے۔ سردار نے اس پر ایسا طلسم پھونکا ہوا ہے کہ سوائے سردار کے اگر کوئی دوسرا اسے ہاتھ لگائے گا تو وہیں جل کر بھسم ہو جائے گا۔ میں تمہاری صرف اتنی مدد کر سکتی ہوں کہ تمہیں ایک طلسمی منتر بتائے دیتی ہوں۔ اس طلسمی منتر کو پڑھ کر تم اس چاندی کی ڈبی کو کھولو گی تو تم پر سردار کا طلسم بے اثر ہو جائے گا۔ تم جل کر بھسم نہیں ہو گی۔ لیکن سردار کو اپنے جادو کے ذریعے ضرور علم ہو جائے گا کہ کوئی اس کی انگوٹھی کو چرانے چاندی کی ڈبی کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد وہ کوئی بھی طلسم پھونک کر تمہیں ہلاک کر سکتا ہے۔ اس کا بچاؤ اگر کر سکو تو تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو"۔

یورکا ایک لمحے کے لئے بھی سوچے بغیر بولی۔

"میں تیار ہوں تنالی دیوی میں کل ہی اس جزیرے کی طرف روانہ ہو جاؤں گی۔"

بوڑھی افریقی عورت نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"میں تمہیں اس خطرناک سفر میں یورکا کے ساتھ جانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ تم اگر چاہو تو یورکا کے واپس آنے تک میرے غار میں یا سماریہ شہر کی کسی سرائے میں رہ سکتے ہو۔ یہ سفر جان لیوا خطرات سے بھرا ہوا ہے۔ یورکا تو تھوڑا بہت طلسم جانتی ہے اور وہ اس لئے اپنا بچاؤ کر سکتی ہے لیکن تم کچھ نہیں جانتے۔ تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے سوچا کہ میں یہاں تذبذب کے عالم میں رہ کر کیا کروں گا۔ اور پھر مجھے اس بات کا تو یقین تھا کہ یہ خواب کی دنیا ہے اور خواب کی دنیا میں کوئی مر بھی جائے تو زندہ رہتا ہے۔ مجھے کیا نقصان پہنچے گا میں نے کہا۔

"میں تنالی دیوی! میں بھی یورکا کے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

یورکا خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے اس فیصلے سے واقعی خوش ہوئی تھی۔ اس نے بوڑھی افریقی عورت تنالی دیوی سے کہا۔

"مقدس دیوی! مجھے وہ طلسمی منتر بتاؤ جس کے پڑھنے سے مجھ پر جزیرہ سنگلدیپ کے جادوگر سردار کے طلسم کا اثر بیکار ہو جائے گا۔"

تنالی دیوی نے اس کے جواب میں اپنے سابقہ بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ اس طلسمی منتر کے پڑھنے سے تم پر جادوگر سردار کے جادو کا اثر نہیں ہو گا میں نے یہ کہا تھا کہ اس منتر کے پڑھنے سے تم پر اس طلسم کا اثر نہیں ہو گا جو جادوگر سردار نے چاندی کی ڈبیا پر پھونک رکھا ہے اور تم اپنے محبوب کی انگوٹھی نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ لیکن اس کے بعد اگر وہ تم پر کوئی طلسم پھونکے گا تو اس سے تمہیں خود بچاؤ کرنا ہو گا۔"

یورکا نے کہا۔ "میں اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کروں گی۔ اگر اپنا بچاؤ نہ کر سکی تو انگوٹھی دے کر اپنے محبوب کو اس جزیرے سے فرار کروانے کی کوشش کروں گی۔"

تنالی دیوی نے کہا۔

"اب جو منتر میں تمہیں بتانے والی ہوں اسے غور سے سنو اور خوب یاد کر لو۔"

تنالی دیوی نے ایک چھوٹا سا منتر پڑھا۔ اسے وقفے وقفے سے تین چار مرتبہ پڑھا۔ اس منتر کو یورکا نے تین چار مرتبہ ہی دہرایا۔ اور کہا۔ "مجھے یہ منتر یاد ہو گیا ہے۔ میں اسے نہیں بھولوں گی۔"

تنالی دیوی بولی۔

"اب تم اپنے خطرناک سفر پر روانہ ہو سکتی ہو۔ میں اپنے دیوتاؤں

سے درخواست کروں گی کہ وہ بھی تمہاری حفاظت کریں۔"

افریقی کنیز یورکا نے آگے بڑھ کر بوڑھی افریقی عورت کے پاؤں کو دونوں ہاتھوں سے چھوا اور اجازت لے کر میرے ساتھ غار میں واپس چل پڑی۔ جب ہم غار سے نکل کر دن کی روشنی میں آئے تو یورکا کہنے لگی۔

"میں تمہیں سلطانہ کے محل کی وہ رات یاد نہیں کراؤں گی جب تم نے میرے دل پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے کہا تھا کہ یورکا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو ہمیشہ یاد رکھوں گا اور تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔ اس لئے کہ مجھے اس وقت بھی معلوم تھا کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ حقیقت میں تم مجھ سے محبت نہیں کرتے لیکن اپنے مطلب کے لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ لیکن محبت کے الفاظ عورت کی کمزوری ہوتی ہے۔ میں صرف تمہاری زبان سے محبت بھرے الفاظ سننا چاہتی تھی۔ مجھے تم سے اور کوئی مطلب نہیں تھا۔ اب جبکہ تم نے تنالی دیوی کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے تو مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ بلکہ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے سچ بولا ہے۔ اس وقت بھی میری محبت تمہاری محبت کے اظہار سے بے نیاز تھی اور آج بھی ہے۔ مجھے تم سے پہلی نظر میں ہی محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت پر نہ میرا اس وقت اختیار تھا اور نہ اس وقت کوئی اختیار ہے۔ یہی سچی محبت ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے انسان کی ایک بچھڑی ہوئی روح سے ان گنت صدیوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔"

یورکا اس قسم کی باتیں کرتی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اسی وقت مجھے فائزہ اور سلطانہ کا خیال آ رہا تھا جنہوں نے اطلس وکمخواب کے خوبصورت شاہانہ لباس میں ملبوس ہو کر عالی شان محلات میں مجھ سے اظہار محبت کیا تھا اور اب مجھے ان کی ساری باتیں بری اور بے حقیقت معلوم ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف یہ ایک عام افریقی کنیز تھی جس نے ایک بار بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن جو محبت کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کر چکی تھی۔

میں نے یورکا سے پوچھا۔

"سمندری جہاز پر سفر کرنے کے لئے ہمارے پاس کرائے کی رقم نہیں ہے۔ ہم کیسے جہاز میں سوار ہوں گے؟"

یورکا نے کہا۔ "تم اس کی فکر کیوں کرتے ہو۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔"

ہم اسی طرح سماریہ کی گلیوں اور بازاروں میں چلتے چلتے کارواں سرائے میں آ گئے۔ معلوم ہوا کہ ایک جہاز صبح صبح سنگلدیپ کے جزائر کی طرف روانہ ہو گا۔ ہم نے رات کارواں سرائے میں ہی بسر کی۔ دوسرے روز یورکا نے مجھے صبح صبح جگا کر کہا۔

"اٹھو جہاز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے تمہارا اور اپنا کرایہ ادا کر دیا ہے۔"

کاروان سرائے بندرگاہ کے پاس ہی واقع تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم بندرگاہ پر آ گئے۔ ایک بادبانی جہاز بندرگاہ پر تیار کھڑا تھا۔ اس میں سامان لادا جا رہا تھا اور مسافر بھی سوار ہو رہے تھے۔ جہاز کے بادبان ابھی کھلے نہیں تھے۔ جہاز کا افریقی کپتان لمبی عبا اور پگڑی باندھے ایک ہنٹر ہاتھ میں لئے اسے چیخ چیخ کر لوگوں کو ایک طرف جانے کی ہدایت کر رہا تھا۔ جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مگر چھوٹا بھی نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی عرشہ تھا جس پر مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے۔ یورکا اور میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ہم جہاز کے سامنے کی رخ پر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کافی دیر بعد جب سورج نکل چکا تھا جہاز کا لنگر اٹھانے کے ساتھ ہی اس بادبان کھول دیئے گئے۔ بادبانوں میں ہوا بھری تو جہاز ایک طرف کو چل پڑا۔ یہ آج سے سینکڑوں برس پہلے کے جہاز تھے جو بادبانوں کے ذریعے چلتے تھے۔

جزائر سنگلدیپ کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

جہاز پر کھانے پینے کو سب کچھ مل جاتا تھا۔ یورکا نیچے جا کر کچن سے کھانا وغیرہ لے آئی۔ ہوا موافق چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے جہاز بڑی آسانی کے ساتھ سفر طے کر رہا تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ شروع ہوا تو ایک دن آسمان پر بادل چھا

گئے- تیز ہوا چلنے لگی- بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی- اس کے ساتھ ہی سمندر میں طوفان آگیا- غضبناک موجیں دور دور سے آکر جہاز سے ٹکرانے لگیں- جہاز بری طرح ڈولنے لگا- میں اور یورکا اور دوسرے مسافر جہاز کی دوسری منزل میں آ گئے- ساری رات اور اگلا سارا دن طوفان جاری رہا- پھر کہیں جاکر طوفان تھما اور جہاز اپنی معمول کی رفتار پر آ گیا- اور ہفتے کے بعد پھر ایک طوفان نے جہاز کو گھیر لیا- لیکن یہ طوفان بھی خیریت سے گزر گیا- خدا خدا کر کے سمندر کا یہ سفر ختم ہوا اور جہاز سنگلدیپ کی بندرگاہ پر آکر ٹھہر گیا-

سنگلدیپ کے جزیرے میں صرف بندرگاہ کے اردگرد مزدوروں اور بندرگاہ پہ تجارت کرنے والوں کے پتھر کے مکان نظر آتے تھے- اس کے علاوہ جزیرے میں صرف جنگلی لوگ ہی کہیں کہیں اپنے جھونپڑوں میں آباد تھے- یورکا نے کہا-

"تالی دیوی نے بتایا تھا کہ اس جزیرے سے آگے ایک جزیرہ ہے جو آدم خوروں کے جزیرے کے نام سے مشہور ہے- ہمیں وہاں جانا ہو گا-"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا-

"کیا وہاں آدم خور جنگلی رہتے ہیں؟"

یورکا نے کہا- "سنا یہی ہے- مگر تم فکر نہ کرو- جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں- تمہیں کچھ نہیں ہو گا-

میں نے کہا- "لیکن تمہیں بھی کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے"

میرے اس جملے پر یورکا نے میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا- کہنے لگی-

"کیا واقعی تمہیں میرا اتنا خیال ہے یا تم اس لئے میری سلامتی چاہتے ہو کہ میرے بغیر تم انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے؟"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے یورکا سے مطلب ضرور تھا- لیکن اس وقت میں نے اس خیال سے کہا تھا کہ مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی تھی- اس کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ وہ بغیر کسی غرض سے صرف محبت کی خاطر میرے ساتھ اتنے پر اسرار سفر پر نکل آئی تھی- اور صرف میری خاطر اس نے ملکہ سلطانہ کے محل کے عیش

و آرام کو چھوڑ دیا تھا- میں نے کہا-

"یورکا! تم جو چاہے سمجھو- مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا-"

یورکا نے مسکراتے ہوئے کہا-

"فکر نہ کرو- مجھے بھی کچھ نہیں ہو گا-"

اور ہم چلتے چلتے جزیرے کے جنوبی ساحل پر پہنچ گئے- یہاں ماہی گیروں کی دو چار جھونپڑیاں تھیں- کچھ کشتیاں بھی ساحل پر کھڑی تھیں- یورکا ان لوگوں کی زبان جانتی تھی- مجھ سے بولی-

"تم یہاں ٹھہرو- میں کسی ماہی گیر سے بات کر کے آتی ہوں- کیونکہ ہمیں آدم خوروں کے جزیرے تک جانے کے لئے کشتی کی ضرورت ہو گی-"

میں ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھ گیا- یورکا ماہی گیروں کے جھونپڑوں کی طرف چلی گئی- میں نے دیکھا کہ وہ ایک جھونپڑی کے باہر ایک ماہی گیر سے باتیں کر رہی ہے- بلکہ اسے آدم خوروں کے جزیرے پر چلنے کے لئے قائل کر رہی تھی- ماہی گیر تھوڑی تھوڑی دیر بعد نفی میں سر ہلا دیتا تھا- پھر نہ جانے یورکا نے اسے کیا کہا کہ وہ راضی ہو گیا اور یورکا کو اشارہ کر کے اپنی کشتی کی طرف بڑھا- یورکا میرے پاس آ گئی کہنے لگی-

"میں نے اسے بڑی مشکل سے راضی کیا ہے- کوئی ماہی گیر آدم خوروں کے جزیرے پر جانے کے لئے تیار نہیں- بہرحال میں نے کسی طرح اسے راضی کر لیا ہے- لیکن وہ ہمیں رات کی تاریکی میں جزیرے کے مشرقی ساحل پر چھوڑ کر فوراً واپس آ جائے گا-"

میں نے کہا- "اس کا مطلب ہے ہمیں رات ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا-"

"ہاں" یورکا بولی- "چلو وہاں ساحل پر چل کر بیٹھتے ہیں-"

اس وقت سورج غروب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی- ہم سمندر کے کنارے سنگلاخ چٹانوں کے پاس بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے- یورکا کہنے لگی- "جادوگر سردار

کے غار میں اکیلی جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ میں تو پھر بھی جادوگر سردار کے طلسم کا کسی نہ کسی طرح مقابلہ کر سکوں گی۔ تم ایسا نہیں کر سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "اگر جادوگر سردار جاگ پڑا۔ یا اسے خبر ہو گئی کہ کوئی چاندی کی ڈبیا کھول کر انگوٹھی لے جا رہا ہے اور اس نے تم پر کوئی ایسا طلسم پھونک دیا جس کا تمہارے پاس توڑ نہ ہوا تو تم کیا کرو گی؟ مجھے تو علم ہی نہیں ہو سکے گا کہ تمہارے ساتھ کیا گزر رہی ہے یا گزر چکی ہے۔"

یورکا نے کہا۔ "میری سلامتی کے بارے میں تمہیں فکرمند دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اپنا بچاؤ کر لوں گی۔"

یورکا اس دنیا کی باتیں مجھ سے پوچھنے لگی جس دنیا سے میں نکل کر آ گیا تھا کہنے لگی۔

"میرے جادو نے مجھے اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ تم کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو لیکن وہ دنیا کیسی ہے اس بارے میں میرا جادو خاموش ہے۔ مجھے بتاؤ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں یورکا۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

یورکا خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے ملکہ سلطانہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگی۔

"سلطانہ تم سے محبت کرتی تھی۔ اس نے اپنی محبت کے ہاتھوں ہی مجبور ہو کر تمہاری انگوٹھی غائب کر دی تھی تاکہ تم واپس اپنی دنیا میں نہ جا سکو اور ہمیشہ اس کے پاس ہی رہو۔"

میں نے کہا۔ "لیکن میں ہمیشہ اس کے پاس نہیں رہ سکتا تھا۔ میں یہاں کسی کے پاس بھی ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتا۔ مجھے ہر حالت میں اپنی دنیا میں واپس جانا ہے۔"

میں نے سوچا کہ یورکا بھی طلسم جانتی ہے۔ اس سے پوچھنا چاہئے شاید یہ مجھے میری دنیا میں واپس پہنچا سکے۔ جب میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ مجھے میری دنیا میں واپس پہنچا سکتی ہے؟ تو اس نے کہا۔

"یہ میری طاقت سے باہر ہے۔ اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ

سکتی۔ پہلے تمہاری انگوٹھی تمہارے پاس آ جائے۔ اس کے بعد سوچوں گی کہ تم اپنے زمانے میں اپنی دنیا میں کس طرح واپس جا سکتے ہو۔"

اس لڑکی یورکا کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی اگر کوشش کرے تو مجھے ماڈرن دنیا میں واپس پہنچانے میں میری مدد کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ انگوٹھی کے مل جانے کے بعد بھی اس کے پاس رہنا چاہتا تھا۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے رات ہو گئی۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ سمندر پر اندھیرا چھا گیا۔ یورکا نے کہا۔

"تم یہیں رہو۔ میں ماہی گیر کو جا کر بلاتی ہوں اس نے کہا تھا رات کا اندھیرا ہوتے ہی میرے پاس آ جانا۔"

میں اندھیرے میں سمندر کے کنارے چٹانوں کے پاس بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ہلکے ہلکے اندھیرے میں ایک کشتی سمندر کی لہروں پر دکھائی دی۔ وہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر آگے چلا گیا۔ سمندر کی لہریں میری پنڈلیوں کو چھو کر گزری تھیں۔ کشتی مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ اس میں ماہی گیر کے ساتھ یورکا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آواز دے کر کہا۔

"آ جاؤ"

میں پانی میں سے گزرتا کشتی میں جا کر بیٹھ گیا۔ کشتی چھوٹی سی ڈونگا نما تھی۔ اس نے جزیرے کی زبان میں ماہی گیر سے کچھ کہا۔ اس کے جواب میں ماہی گیر نے بھی کچھ کہا۔ پھر کشتی سمندر میں مشرق کی طرف چل پڑی۔ کشتی سمندر کی موجوں پر کافی دیر تک چلتی رہی۔ اس کے بعد دور سمندر میں ایک سیاہ دیوار سی ابھرنے لگی۔ یورکا نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جزیرے کے جنگل نظر آ رہے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود اس آدم خور جزیرے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن میری مجبوری مجھے یورکا کے ساتھ اس خطرناک جزیرے کی طرف لئے جا رہی

تھی- آہستہ آہستہ ستاروں کی دھیمی روشنی میں جزیرے کے ساحل کے درختوں کے خاکے ابھرنے لگے- ماہی گیرنے کشتی جزیرے کے ویران ساحل پر ایک پل کے لئے روکی- یورکا اور میں جیسے ہی کشتی سے اترے ماہی گیرنے جلدی سے چپو چلاتے ہوئے کشتی کا رخ سمندر کی طرف کیا اور اسے تیزی سے سمندر میں واپس لے جانے لگا-

یورکا نے کہا-

"میں نے اسے بڑی مشکل سے یہاں تک آنے پر راضی کیا تھا- وہ ڈرتا تھا کہ کہیں جزیرے کے آدم خور وحشی اسے پکڑ نہ لیں-"

ہم سمندر کی موجوں میں گھٹنوں گھٹنوں تک پانی میں چلتے ساحل پر آ گئے یورکا رک کر جزیرے کے درختوں کی طرف دیکھنے لگی جو جزیرے کے مغرب اور جنوب کی طرف چلے گئے تھے- کہنے لگی-

"تالی دیوی نے کہا تھا کہ جادوگر سردار جس پہاڑی کے اندر غار میں رات کو سوتا ہے وہ جزیرے کے جنوب میں واقع ہے- ہمیں جزیرے کے جنوب کی طرف چلنا ہوگا-"

اور وہ چل پڑی- میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا- اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا- کہنے لگی-

"تم کو ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

میں نے کہا- "تمہارے آگے میں جھوٹ نہیں بولوں گا- مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے-"

یورکا نے کہا- "ڈر خوف کو دل سے نکال دو- تمہیں میں کچھ نہیں ہونے دوں گی-"

ہم چلتے چلتے ریتلے ساحل سے نکل کر جنوبی درختوں میں آ گئے- یورکا نے دھیمی آواز میں کہا-

"ہم جزیرے کے خطرناک علاقے میں داخل ہو گئے ہیں- یہاں اونچی آواز میں بات نہ کرنا-"

درختوں پر ایسی پراسرار خاموشی اور سکوت چھایا ہوا تھا- جیسے کسی نے ان پر

جادو کر دیا ہو- درخت اتنے گنجان تھے کہ ہمیں چلنے میں دشواری ہو رہی تھی- ہم رک رک کر چل رہے تھے- آخر یہ جنگل ختم ہو گیا- اب ہمیں کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی دکھائی دی- ستاروں سے روشن آسمان کے پس منظر میں ہم نے دیکھا کہ اس پہاڑی کی تین چوٹیاں ابھری ہوئی تھیں یہ مخروطی چوٹیاں ایک دوسری کے ساتھ ساتھ تھیں اور صاف نظر آ رہی تھیں- یورکا بولی-

"یہی وہ پہاڑی ہے جس کے غار میں مجھے جانا ہے اس غار میں جادوگر سردار کے سرہانے کی جانب وہ طاق ہے جس میں چاندی کی ڈبیا میں تمہاری انگوٹھی ہے- میں تمہیں جس جگہ ٹھہرنے کو کہوں گی- تم اس جگہ میرا انتظار کرنا-"

پہاڑی کے قریب آ کر یورکا نے رک کر اپنے طور پر کوئی حساب لگایا- تالی دیوی کا بتایا ہوا منتر پڑھ کر اپنے جسم پر پھونکا اور کہنے لگی- "اس طرف جاؤ-"

دوسری طرف جھاڑیوں کی ایک بڑی گھنی گھاسی تھی- یورکا نے کہا-

"ان جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ جاؤ- جب تک میں نہ آؤں تم باہر مت نکلنا-؟

اور وہ پہاڑی کی طرف چلی گئی- میں جھاڑیوں میں آ کر چھپ گیا- بعد میں یورکا نے مجھے جادوگر سردار کے غار میں پہنچنے کی جو داستان سنائی وہ میں یہاں اپنی زبان میں بیان کرتا ہوں- یورکا نے بتایا کہ وہ سمجھ گئی تھی کہ پہاڑی غار کا دہانہ کس جگہ پر ہے- اس کے طلسم نے اسے غار کے دہانے کی نشان دہی کر دی تھی- اس کا کہنا تھا کہ وہ پہاڑی کے قریب آ کر اتنی احتیاط سے چلنے لگی تھی کہ خود اسے اپنے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی تھی- اس نے دور ہی سے جھاڑیوں میں چھپا ہوا پہاڑی غار کا دہانہ دیکھ لیا تھا- یورکا نے بعد میں بتایا کہ اس کے پاس ایک ایسا خفیہ طلسمی منتر تھا کہ جس کو نہ تو خود اس نے کبھی استعمال کیا تھا اور اس کی بابت کسی دوسرے کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا- وہاں اس منتر سے کام لینے کا موقع آ گیا تھا- چنانچہ اس نے وہ خاص خفیہ منتر پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک ماری تو وہ غائب ہو گئی- غائب اس طرح ہوئی کہ وہ خود تو اپنے آپ کو دیکھ سکتی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ کوئی دوسرا اسے نہیں دیکھ سکتا- وہ

جھاڑیوں کی شاخوں کو ایک ایک کر کے ہٹاتی ہوئی غار کے دہانے کے قریب آ گئی۔ غار کا دہانہ اندھیرے میں اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ جادوگر سردار نے غار کے دہانے پر ایسا طلسمی حصار کھینچ رکھا تھا کہ رات کے وقت سوائے اس کے دوسرا کوئی بھی غار میں اگر داخل ہونے کی کوشش کرتا تو وہ وہیں جل کر بھسم ہو جاتا۔ یورکا غار کے دہانے میں جیسے ہی داخل ہوئی اسے ایک سیکنڈ کے لئے ایسا جھٹکا لگا کہ وہ زمین پر گر پڑی۔ لیکن اسے کچھ نہ ہوا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور غار کی دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ جادوگر سردار نے یہاں طلسم پھونکا ہوا تھا اور یہ اسی طلسم کا اسے جھٹکا لگا تھا۔ اس نے اپنے جسم پر تالی دیوی کا بتایا ہوا جو منتر پڑھ کر پھونکا ہوا تھا اس نے یورکا کو بھسم ہونے سے بچا لیا تھا۔ ورنہ وہ وہیں جل کر بھسم ہو جاتی۔ لیکن ایک پہرے دار جنگلی جو وہیں ایک طرف بیٹھا اونگھ رہا تھا وہ ضرور چونک کر اٹھ بیٹھا تھا۔ خدا جانے اسے کیسے خبر ہو گئی تھی کہ غار میں کوئی اجنبی داخل ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ وہ نیزہ لے کر غار کے دہانے کی طرف بڑھا۔ یورکا نے بتایا کہ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس وقت یورکا کو معلوم ہو گیا کہ جادوگر سردار کے غار میں آ کر اس کے طلسمی منتر کا اثر زائل نہیں ہوا۔ وہ پہرے دار جنگلی کے بالکل سامنے تھی مگر اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ دوسروں کی نظروں سے غائب ہو چکی ہے تو یورکا پہرے دار کے بالکل قریب سے ہو کر اپنے سانس کو روک کر گزر گئی آگے غار خالی پڑا تھا۔ جادوگر سردار نے آگے اس لئے پہرے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ اسے اپنے طلسم پر بڑا بھروسہ تھا اسے یقین تھا کہ اس نے غار کے دہانے پر جو طلسمی حصار کھینچ رکھا ہے اس میں سے کوئی بھی باہر کا اجنبی داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن یورکا غار میں داخل ہو چکی تھی اس کے باوجود یورکا بے حد احتیاط کے ساتھ غار کی دیوار سے لگی پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی چلتے چلتے وہ غار میں اس جگہ آ گئی جہاں اس نے دیکھا کہ ایک کھلا دالان سا ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک تخت بچھا ہوا ہے جس پر جادوگر سردار گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کے خراٹوں کی آواز صاف

سنائی دے رہی تھی ایک طاق میں دیا جل رہا تھا۔

اس کی روشنی میں یورکا نے وہ طاق دیکھا جو جادوگر سردار کے سرہانے سے ذرا اوپر دیوار میں بنا ہوا تھا۔ طاق میں چاندی کی ڈبیا پڑی تھی۔ یہی وہ ڈبیا تھی جس کے اندر انگوٹھی تھی جس کی تلاش میں یورکا وہاں آئی تھی وہ جانتی تھی کہ اس ڈبیا پر جادوگر سردار نے کوئی بڑا زبردست طلسم کیا ہوا ہو گا۔ لیکن اسے وہ ڈبیا وہاں سے اٹھا کر لے جانی تھی۔ بجائے ڈبیا کھول کر اس میں سے انگوٹھی نکال کر لے جانے کے وہ ڈبیا ہی اٹھا کر لے جانا چاہتی تھی کیونکہ ڈبیا کھولنے اور انگوٹھی نکالنے میں وقت لگ جاتا اور اس دوران ذرا سی آہٹ پر جادوگر سردار کی نیند کھل سکتی تھی۔ یورکا نے کالے علم کا ایک اور منتر پڑھ کر اپنے اوپر پھونکا۔ یہ بڑا زبردست منتر تھا اور بڑے سے بڑے طلسم کو بے اثر کر سکتا تھا۔

وہ دبے پاؤں طاق کی طرف بڑھی اس نے ایک نظر جادوگر سردار پر ڈالی۔ وہ گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ یورکا نے ہاتھ طاق کی طرف بڑھایا جیسے ہی اس نے چاندی کی ڈبیا کو چھوا اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ بے اختیار ہو کر نیچے گر پڑی۔ لیکن گرتے گرتے اس نے ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ اس کے گرنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ پھر بھی اس کے گرنے سے جو تھوڑی آواز پیدا ہوئی اس نے جادوگر سردار کو جگا دیا۔ یورکا نے جادوگر سردار کو بیدار ہوتے دیکھا تو وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی۔ جادوگر سردار نے نیند بھری آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اٹھا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ طاق میں جلتے دیئے کی روشنی غار کے دالان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگر یورکا نے اپنا خاص منتر اپنے اوپر نہ پھونکا ہوتا تو وہ اسے صاف نظر آ سکتی تھی۔ وہ اس کے بالکل سامنے دیوار کے ساتھ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن یہ منتر کا اثر تھا کہ وہ جادوگر سردار کو بھی دکھائی نہ دی۔

اس نے سر نیچے سرہانے کے ساتھ لگا دیا آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا جب تک اس کے خراٹوں کی دوبارہ آواز نہیں آنے لگی یورکا اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلی۔ اگر جادوگر سردار کی جگہ وہاں کوئی عام انسان ہوتا تو یورکا کو ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ وہ بڑے آرام سے ڈبیا اٹھا کر باہر نکل سکتی تھی لیکن سردار خود ایک زبردست

جادوگر تھا کسی بھی وقت اسے اپنے طلسم کے زور سے کچھ بھی معلوم ہو سکتا تھا چنانچہ یورکا بے حد احتیاط سے کام لے رہی تھی- اس لحاظ سے وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ سردار نے چاندی کی ڈبیا پر جو طلسم پھونک رکھا تھا اس کی وجہ سے یورکا کو صرف جھٹکا ہی لگا تھا- اسے خود کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا- اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یورکا خود ایک جادوگرنی تھی اور اس نے بھی اپنے اوپر تین چار طلسمی منتر پھونک رکھے تھے- یہ منتر اسے بچا رہے تھے ورنہ چاندی کی ڈبیا کو ہاتھ لگاتے ہی وہ وہیں جل کر بھسم ہو سکتی تھی-

سردار دوبارہ گہری نیند سو گیا تھا- اس کے خراٹوں کی آواز برابر آ رہی تھی یورکا اس الجھن میں تھی کہ وہ کیا کرے- اگر وہ دوبارہ چاندی کی ڈبیا کو ہاتھ لگاتی ہے تو اسے ضرور جھٹکا لگے گا اور وہ ایک بار پھر نیچے گر پڑے گی- اس کے پاس ایسا کوئی منتر نہیں تھا جو اس کو ڈبیا کے جھٹکے سے بچا سکتا- مگر وہ زیادہ انتظار بھی نہیں کر سکتی تھی- وقت گزر رہا تھا کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اس بار اگر اسے جھٹکا لگا تو وہ اسے برداشت کرنے کی بھرپور کوشش کرے گی لیکن چاندی کی ڈبیا کو اپنی گرفت میں لے لے گی- یورکا نے اپنے جسم اور اپنی روح کی پوری طاقت کو جمع کرتے ہوئے اپنے دانتوں کو بھینچ لیا اور انتہائی سخت ارادے کے ساتھ ساتھ طاق کی طرف ہاتھ بڑھایا اور چاندی کی ڈبیا کو پکڑ لیا- یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ اس بار اسے ذرا سا دھچکا بھی نہیں لگا تھا- یورکا کا کہنا ہے کہ اس کی اسے سمجھ نہیں آ سکی کہ آخر ایسا کیوں ہوا- کیونکہ وہ کتنی ہی قوت ارادی سے کیوں نہ کام لیتی طلسم کا اثر ضائع نہیں ہو سکتا تھا اور اسے ضرور جھٹکا لگنا تھا- یورکا نے بتایا کہ شاید قدرت اس کی مدد کر رہی تھی-

اس کے بعد یوزکا نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ڈبیا کو اپنے قبضے میں کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتی غار کے دہانے کی طرف چل پڑی- غار کے دہانے کے پاس آئی تو جنگلی پہرے دار گہری نیند سو رہا تھا- یورکا غار سے نکل کر اس طرف چلنے لگی جہاں وہ مجھے جھاڑیوں کے اندر چھپا گئی تھی- اب آگے کی کہانی میں خود بیان کرتا ہوں- میں جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا دعائیں مانگ رہا تھا کہ یورکا اپنے مشن میں کامیاب ہو اور

زندہ حالت میں میری انگوٹھی لے کر واپس آ جائے- میں سخت بے چینی کی حالت میں جھاڑیوں کے اندر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی- میں نے جھاڑیوں کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا- ستاروں کی روشنی میں درختوں کے تنے مجھے نظر آ رہے تھے مگر وہاں کوئی انسان نہیں تھا- میں نے اسے اپنا وہم خیال کیا اور جھاڑیوں میں اس طرح اپنے آپ کو چھپا لیا-

اچانک جھاڑیاں ایک طرف ہٹ گئیں- میں ڈر گیا خوف کے مارے میری چیخ نکلنے والی تھی کہ مجھے یورکا کی دھیمی آواز آئی-

"یہ میں ہوں یورکا"

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا-

"تم کہاں ہو"

یورکا نے جواب دیا- "میں تمہارے سامنے کھڑی ہوں- مگر میں نے اپنے جسم پر ایک ایسا طلسمی منتر پھونک رکھا ہے کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے- یہ ضروری تھا-"

"کیا- انگوٹھی مل گئی ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا-

یورکا کی آواز آئی- "ہاں میں چاندی کی ڈبیا ہی اٹھا کر لے آئی ہوں- یہاں سے باہر نکلو- ہمیں اب اس جزیرے پر نہیں ٹھہرنا چاہئے-"

میں نے کہا- "لیکن میں چاندی کی ڈبیا دیکھنا چاہتا ہوں-"

یورکا نے کہا- "تم ڈبیا صرف اس صورت میں دیکھ سکتے ہو جب میں اسے اپنے غیبی جسم سے الگ کر کے زمین پر رکھ دوں گی- مگر ابھی میں اسے اپنے جسم سے اپنی گرفت سے الگ نہیں کرنا چاہتی- مجھے ڈر ہے کہ کہیں ڈبیا میری گرفت سے نکلتے ہی غائب نہ ہو جائے- تم اپنا ہاتھ آگے کرو- میں تمہارا ہاتھ ڈبیا پر لگا سکتی ہوں-"

کسی غیبی ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا- یہ میرے لئے عجیب و غریب تجربہ تھا- میرا ہاتھ یورکا نے ہی پکڑا تھا جو مجھے نظر نہیں آ رہی تھی- پھر میرا ہاتھ اپنے آپ اس کی گود میں چلا گیا- مجھے نہ ڈبیا نظر آ رہی تھی- نہ یورکا کی گود دکھائی دے رہی تھی- لیکن میرے ہاتھ کی انگلیوں نے چاندی کی ڈبیا کی سطح سے مس کرتے ہوئے اسے باقاعدہ محسوس کیا-

یورکا بولی۔

"اب تمہاری تسلی ہو گئی ہو گی۔ جلدی سے اٹھو" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یورکا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

"میں نے تمہارا ہاتھ نہ پکڑا تو تم مجھ سے بچھڑ جاؤ گے اور چونکہ میں تمہاری نظروں کے سامنے سے غائب ہوں اس لئے تمہیں کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ میں کس طرف جا رہی ہوں اس لئے ایسا کرو کہ میرا ہاتھ تم پکڑ لو۔ اور اسے مت چھوڑنا۔"

میں نے ایسا ہی کیا اور یورکا کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ بھی ایک عجیب تجربہ اور عجیب منظر تھا۔ ستاروں کی دھیمی روشنی میں کوئی مجھے اپنی مرضی کے راستوں پر چلاتا۔ کھینچے لئے جا رہا تھا۔ یہ یورکا ہی تھی جس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ میں اکیلا ہی جنگل میں رات کے اندھیرے میں چلا جا رہا ہوں لیکن یورکا میرے ساتھ تھی مگر غائب تھی۔ اس وقت مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں یہ سوچتا کہ ایک انسان دوسروں کی نظروں سے غائب کیسے ہو سکتا ہے یا یہ کہ یورکا پر اس کے غیبی منتر کا کب تک اثر رہے گا۔ ہم ایک بار پھر جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں یورکا سے پوچھا۔

"ماہی گیر تو ہمیں جزیرے پر اتار کر اسی وقت کشتی لے کر واپس چلا گیا تھا۔ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟"

یورکا نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"میں جزیرے کے مغربی ساحل کی طرف جا رہی ہوں اس طرف جنگلی لوگوں کی جھونپڑیاں ہیں۔ وہاں سمندر کے کنارے ان لوگوں کی کشتیاں ضرور ہوں گی۔ ہم ان میں سے کوئی ایک کشتی لے کر نکل جائیں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ ہم گھنے جنگل سے نکل کر جزیرے کے مغربی ساحل کی طرف آئے تو دیکھا کہ وہاں سمندر کے کنارے کچھ کشتیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ریت پر چلتے ہوئے یورکا سے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ سنگلدیپ کا جزیرہ کس رخ پر ہے؟"

یورکا کی آواز سنائی دی۔ کیونکہ میں اس کی آواز ہی سن سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ دشمن نے کوئی جوابی حملہ نہ کیا تو میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گی۔"

وہ مجھے لے کر ایک ڈونگا نما کشتی میں سوار ہو گئی۔ اس وقت یورکا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چپو اپنے آپ اٹھ کر چلنے لگا ہے۔ چپو غیبی یورکا نے چلانا شروع کیا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم بھی ایک چپو پکڑ لو اور کشتی کی دوسری جانب بیٹھ کر جس رخ پر میں چپو چلا رہی ہوں اس رخ پر تم بھی چپو چلانا شروع کر دو۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ کشتی ساحل سے دور ہونے لگی۔ اندھیری رات میں سمندر ستاروں کی دھیمی دھیمی چمک میں بڑا ڈراونا اور ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ جب میں دیکھتا کہ میں کشتی میں اکیلا ہی بیٹھا چپو چلا رہا ہوں۔ تو مجھے سمندر سے اور زیادہ خوف محسوس ہونے لگتا۔ اگرچہ یورکا میرے ساتھ کشتی میں سوار تھی مگر وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی جس کی وجہ سے مجھے اکیلے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ میں یورکا کا چپو اپنے آپ چلتے دیکھ رہا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ ساحل سے دور ہو رہی تھی۔ میں نے یورکا سے پوچھا۔

"یورکا! کیا تم نے چاندی کی ڈبیا کشتی میں رکھ دی ہے؟ مگر وہ مجھے تو دکھائی نہیں دی"

یورکا نے کہا۔ "میں نے ڈبیا اپنے ایک ہاتھ میں پکڑ رکھی ہے اور صرف ایک ہاتھ سے اور کچھ اپنی طلسمی طاقت سے چپو چلا رہی ہوں۔ میں جب تک اس طلسمی جزیرے سے نکل کر سنگلدیپ نہیں پہنچ جاتی میں ڈبیا کو ہاتھ سے الگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔"

ساحل سے دور ہونے کے بعد سمندر کی موجوں نے ہماری کشتی کو اپنے اوپر سوار کر لیا اور وہ کشتی کو تیزی سے ایک طرف لے جانے لگیں۔ ہمیں آدھے سے بھی

کم زور لگانا پڑ رہا تھا۔ مجھے یورکا کی آواز آئی۔

"میں آسمان پر ستاروں کو دیکھ رہی ہوں۔ ستاروں کے حساب سے ہماری کشتی مغرب کی طرف جا رہی ہے اور سنگدیپ کا جزیرہ مغرب کی طرف ہی ہے۔"

مجھے یورکا کے غائب ہونے سے الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا اب تم ہمیشہ غائب رہو گی؟"

یورکا نے جواب دیا۔

"میں نے اپنے منتر کا صرف ایک حصہ پڑھ کر اپنے اوپر پھونکا تھا۔ اس کا اثر کل رات کے پہلے پہر تک رہے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو اس کے بعد ایک بار پھر منتر اپنے اوپر پھونک دوں گی۔ ورنہ کل رات کے پہلے حصے کے بعد ظاہر ہو جاؤں گی۔"

کھلے سمندر میں آکر منہ زور موجوں کی وجہ سے کشتی کی رفتار مزید تیز ہو گئی تھی۔ مشرق میں آسمان پر صبح کا ستارہ چمکنے لگا تھا کہ ہمیں سنگدیپ کے جزیرے کی چند ایک روشنیاں ٹمٹماتی نظر آنے لگیں۔ یورکا نے کہا۔

"ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یورکا! ہم نے ابھی تک چاندی کی ڈبیا کھول کر نہیں دیکھا کہ اس کے اندر انگوٹھی ہے بھی یا نہیں؟"

اس نے کہا۔ "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ڈبیا کے اندر کوئی شے موجود ہے۔ میں ڈبی کو ہاتھ سے ابھی نہیں چھوڑ سکتی۔ کنارے پر پہنچنے کے بعد میں اس پر ایک طلسم پڑھ کر کھولوں گی۔ ابھی مجھے خطرہ ہے کہ اگر میں نے اسے ہاتھ سے چھوڑ دیا تو ہم پر کوئی آفت نہ آ جائے۔ کیونکہ اس ڈبیا پر اس علاقے کے سب سے بڑے جادوگر نے طلسم کیا ہوا ہے۔"

ابھی آسمان پر صبح کے نور کی نیلی نیلی روشنیاں لہروں کی شکل میں پھیل رہی تھیں کہ ہماری کشتی سنگدیپ جزیرے کے ساحل کے ساتھ جا کر لگ گئی۔ یورکا نے میرا بازو پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

"یہ میں اپنے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے پکڑ رہی ہوں کہ کہیں تم مجھ سے الگ ہو کر گم نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ تم مجھے نہیں دیکھ رہے۔"

میں نے اس سے کہا۔ "جلدی سے کسی جگہ بیٹھ کر ڈبیا پر طلسم کرو اور اسے کھولو۔ تاکہ میری تسلی ہو جائے کہ میری انگوٹھی اس میں موجود ہے۔"

یورکا کہنے لگی۔ "صبر سے کام لو۔ جلدی میں کیا ہوا کام ٹھیک نہیں ہوتا۔ میں جزیرے کے شمالی ساحل کی طرف جا رہی ہوں۔ وہاں کسی ویران جگہ پر بیٹھ کر یہ کام کروں گی۔"

جزیرے کے شمالی ساحل پر پہنچتے پہنچتے دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ وہاں ایک جگہ جزیرے کے جنگلی لوگوں کا قبرستان تھا۔ قبروں کی چھوٹی بڑی ڈھیریاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر قبر کے اوپر ایک تکونا پتھر رکھا ہوا تھا۔ یورکا نے کہا۔

"یہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

ایک قبر کے پاس یورکا بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور میرا بازو چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔ میں چاندی کی ڈبیا پر ایک خاص عمل کرنے لگی ہوں۔ اس کے بعد اسے کھولوں گی۔ وہ کسی منتر کا جاپ کرنے لگی۔ ایک دو منٹ تک وہ منتر پڑھتی رہی۔ پھر خاموش ہو گئی۔ ایک دو سیکنڈ کے بعد بولی۔

"میں نے ایک خاص طلسمی منتر پڑھ کر ڈبیا پر پھونک دیا ہے۔ یہ تالی دیوی کا خاص طلسمی عمل تھا۔ اس کے اثر سے ڈبیا کا طلسم ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اب میں اسے اپنے ہاتھ سے نیچے گھاس پر رکھ رہی ہوں۔ گھاس پر رکھنے کے بعد ڈبیا تمہیں نظر آنے لگے گی۔"

میں زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہاں چاندی کی چمکتی ہوئی چھوٹی سی ڈبیا نمودار ہو گئی۔ اس ڈبی پر کسی عجیب و غریب جانور کی سینگوں والی شکل کندہ تھی۔ یورکا نے پوچھا۔

"کیا تم ڈبیا کو دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔"

یورکا نے کہا- "اس کو انگلی لگا کر دیکھو- تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے-"

میں نے کہا- "کہیں مجھے بھی جھٹکا تو نہیں لگے گا؟"

اس نے کہا- "نہیں- اس کے جھٹکے کا اثر میں نے اپنے طلسم سے ختم کر دیا ہے- اس کے اندر سے انگوٹھی نکال کر تمہاری انگلی میں ڈالنے سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ تم ایک بار ڈبیا کو چھو کر دیکھو-"

میں ڈرتے ڈرتے اپنی انگلی ڈبیا کے پاس لے گیا- مجھے ڈبیا کے اندر سے سینک نکلتا محسوس ہوا- میں نے یورکا سے کہا-

"مجھے اس کے اندر سے گرم حرارت نکلتی محسوس ہو رہی ہے-"

"یورکا نے کہا- "یہ مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی- اس کی تم فکر نہ کرو اور ڈبیا کو ہاتھ لگا دو- تم صرف انگلی ہی لگا دو-"

میں نے ڈرتے ڈرتے ڈبیا کے ساتھ انگلی لگا دی- ڈبیا میں سے گرم شعاعیں نکل کر میرے جسم میں سرائیت کر رہی تھیں- میں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور یورکا سے کہا-

"اس میں سے گرم شعاعیں نکل رہی تھیں-"

وہ بولی- "میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم پر ڈبیا نے وہ اثر نہیں کیا جو مجھ پر کیا تھا- تمہیں کوئی جھٹکا تو محسوس نہیں ہوا؟"

میں نے کہا- "بالکل نہیں"

وہ بولی- "ٹھیک ہے- یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے-"

میں نے بے چین ہو کر کہا-

"خدا کے لئے اب اسے کھول کر تو دیکھو کہ اس کے اندر میری انگوٹھی ہے بھی یا نہیں ہے-"

اس نے کہا- "تم ایک دو لمحوں کے لئے بالکل خاموش ہو جاؤ- میں ڈبیا کھولنے سے پہلے بھی ایک عمل پڑھ کر پھونکنا چاہتی ہوں میں ڈبیا کو اپنے ہاتھ میں لے رہی ہوں- اب یہ ایک بار پھر تمہاری نظروں سے غائب ہو جائے گی- تم حیران مت ہونا-"

اس کے ساتھ ہی گھاس پر پڑی ہوئی چاندی کی ڈبیا غائب ہو گئی- یورکا کے کوئی عمل پڑھنے کی دھیمی دھیمی آواز آنے لگی- میں خاموش ہو کر بیٹھا رہا- کچھ دیر تک وہ عمل پڑھتی رہی- پھر چپ ہو گئی- اس کے بعد کہنے لگی- "میں ڈبیا کھولنے لگی ہوں-"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی- ایسی خاموشی چھا گئی کہ مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی- اچانک یورکا نے خوشی سے چیخ کر کہا-

"انگوٹھی مل گئی- تمہاری انگوٹھی مل گئی ہے-"

میں نے کہا- "کہاں ہے؟ مجھے نظر نہیں آ رہی- مجھے بھی دکھاؤ-"

اس نے کہا- "اپنا ہاتھ آگے کرو-"

میں نے ہاتھ آگے کر دیا- اچانک یورکا کے غیبی ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑا اور میری انگلی میں انگوٹھی پہنا دی- میں نے اسے فوراً پہچان لیا- یہ بزرگ کی دی ہوئی وہی سرخ زمرد والی چاندی کی انگوٹھی تھی- انگوٹھی میں سے ہلکی ہلکی حرارت سی نکل رہی تھی- میں نے یورکا سے کہا-

"یورکا! انگوٹھی میری ہی ہے- اس میں سے ہلکی ہلکی حرارت نکلتی محسوس ہو رہی ہے-"

یورکا بولی-

"اس سے کچھ نہیں ہو گا- یہ اس پر جادوگر سردار کے کئے گئے زبردست طلسم کی گرمی ہے- تشویش کی کوئی بات نہیں ہے- مجھے خوشی ہے کہ تمہیں تمہاری انگوٹھی واپس مل گئی اور ہماری مہم کامیاب ہو گئی- اب ہم یہاں سے واپس سماریہ شہر جائیں گے تاکہ تنالی دیوی کو اپنی مہم کی کامیابی کی خبر سنائیں اور اگر اس انگوٹھی میں جادوگر سردار کے طلسم کا کوئی اثر باقی رہ گیا ہو تو اس کی مدد سے اسے بھی ختم کر دیں گے-"

ہم قبرستان میں سے نکل کر جزیرے سنگدیپ کی بندرگاہ پر آ گئے- معلوم ہوا کہ دوپہر کے بعد ایک سمندری جہاز سماریہ کی بندرگاہ کی

طرف جا رہا ہے۔ ہم وہیں بندرگاہ پر ایک الگ تھلگ جگہ پر بیٹھ گئے۔ یورکا میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی مگر وہ کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف میں اکیلا وہاں بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہم آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ جب کوئی شخص ہمارے قریب سے گزرتا تو ہم گفتگو بند کر دیتے۔ تاکہ کوئی مجھے دیکھ کر حیران نہ ہو کہ میں اکیلا کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ یا یورکا کی آواز سن کر حیران نہ ہو کہ یہاں تو صرف ایک نوجوان مرد بیٹھا ہے۔ پھر عورت کے بولنے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ میں نے یورکا سے کہا۔

"میں تمہارے غائب ہونے سے پریشان ہو گیا ہوں۔ چاہتا ہوں تم جلدی نظر آنے لگو۔"

یورکا کی ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔ کہنے لگی۔

"کہیں آہستہ آہستہ تم مجھ سے پیار تو نہیں کرنے لگے؟ اگر ایسی بات ہے تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن مجھے الجھن ضرور ہوتی ہے کہ میں جس عورت سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی۔"

یورکا نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں آج رات کے پہلے پہر کے بعد تمہیں نظر آنے لگوں گی۔"

دوپہر کے بعد ہم سماریہ جانے والے بادبانی جہاز میں سوار ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یورکا نے جہاز کے کپتان سے مل کر کیا بات کی کہ ہمیں جہاز میں سفر کرنے کی اجازت مل گئی۔ حالانکہ ہمارے پاس اس ملک کی کرنسی کے سکے نہیں تھے۔ یورکا نے بھی مجھے نہ بتایا میں نے بھی اس سے نہ پوچھا کہ اس نے کپتان سے کس طرح اجازت لی تھی۔ اور کیا جہاز کا کپتان اسے غیبی حالت میں بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس نے یہی کہا تھا کہ میں جہاز کے کپتان کے پاس جا رہی ہوں۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس میں یورکا کی طلسمی طاقت کا ہاتھ تھا۔ ایک بار پھر سمندر کا تکلیف دہ سفر شروع ہو گیا۔ چھوٹا سا جہاز تھا۔ ذرا موجوں کا زور تیز ہوتا تو وہ کھلونے کی طرح موجوں پر اچھلنے لگتا۔ خدا خدا کر

کے یہ سفر ختم ہوا اور جہاز سماریہ کی بندرگاہ سے جا کر لگ گیا۔

یہ بتانا میں بھول گیا ہوں کہ جس روز ہم جہاز میں سوار ہوئے تھے اس کی رات کو یورکا اچانک نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ یہ ایسے ہوا کہ ہم دونوں رات کے دوسرے پہر جہاز کے عرشے پر ایک طرف جنگلے کے پاس بیٹھے تھے۔ یورکا مجھ سے باتیں کرتے کرتے رک گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں ظاہر ہونے لگی ہوں۔"

میں اس طرف دیکھنے لگا جہاں سے اس کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی پندرہ سیکنڈ کے بعد اچانک یورکا مجھے پوری کی پوری دکھائی دینے لگی۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"تمہیں پھر سے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے یورکا ایسے لگتا ہے جیسے میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

یورکا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مجھے دیکھ کر خوش ہوئے ہو۔"

میں نے یورکا سے پوچھا۔

"ایک سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ جس وقت تم جہاز میں سوار ہونے کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس گئی تھیں اور اس وقت تم کسی کو نظر نہیں آ رہی تھیں۔ پھر تم کپتان کے پاس کیسے باتیں کر رہی تھیں۔ کیا اسے تم نظر آ رہی تھیں؟"

یورکا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا ایک ایسا راز ہے جو میں ابھی تمہیں نہیں بتا سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہ سوال ابھی مجھ سے نہ پوچھو۔ اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہے تو ایک وقت ضرور آئے گا جب میں یہ راز تمہیں بتا دوں گی۔"

ہم سماریہ پہنچ گئے تھے۔ چاندی کی انگوٹھی میری انگلی میں موجود تھی۔ اس میں سے اب حرارت کی شعاعیں نکلتی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ بندرگاہ سے ہم

سیدھے بوڑھی جادوگرنی تنالی کے پاس گئے۔ وہ اپنے غار میں آگ کے الاؤ کے سامنے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ یورکا اور میں خاموشی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد تنالی دیوی نے اپنی سفید بھنووں والی آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا اور کہا۔

"میں خوش ہوں کہ تم دونوں ایک خطرناک مہم سے کامیاب واپس آ گئے ہو۔"

یورکا نے تنالی دیوی کو مختصر لفظوں میں سارے واقعات بیان کئے اور کہا۔

"مقدس دیوی! تمہارے منتر نے مجھے بچا لیا اور مجھ پر جادوگر سردار کے طلسم کا اثر نہیں ہوا۔ ورنہ میرا وہاں سے بچ کر زندہ نکل آنا ناممکن تھا۔"

تنالی دیوی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں۔"

یورکا نے پوچھا۔ "کیا انگوٹھی پر کیا گیا جادوگر سردار کا طلسم ختم ہو گیا ہے یا ابھی اس پر جادو کے اثرات باقی ہیں؟"

بوڑھی جادوگرنی نے کہا۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تم لوگوں کو ہوشیار رہنا ہو گا۔"

یورکا نے دوسرا سوال کیا۔ "مقدس دیوی! اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

بوڑھی جادوگرنی نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

یورکا بولی۔

"میں اپنے دوست اور اپنے محبوب کو واپس اس کی دنیا میں پہنچانا چاہتی ہوں تاکہ یہ اپنی دنیا میں جا کر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکے۔ کیونکہ یہ اس کے ماضی کا زمانہ ہے۔ یہ اس کا زمانہ نہیں ہے۔ وہ اپنے ایک شوق کو پورا کرنے یہاں نکل آیا تھا۔"

بوڑھی جادوگرنی نے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا تم بھی واپس جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں مقدس دیوی! میں بھی اپنے زمانے، اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ ہر آدمی کو اپنے زمانے اور اپنے ماحول میں ہی رہنا چاہئے۔"

بوڑھی جادوگرنی کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے یورکا سے کہا۔

"یورکا! اس نوجوان کو واپس اپنی دنیا میں پہنچانے کے لئے تمہیں یہاں سے ملک بابل جانا ہو گا۔ وہاں مینار بابل کے پیچھے ایک دریا بہتا ہے۔ پورے چاند کی رات کو تم دونوں اس دریا کے کنارے جا کر بیٹھ جاؤ گے اور تم میرا خاص عمل پڑھ کر پھونکو گی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک بڑی بادبانی کشتی دریا میں نمودار ہو گی۔ وہ کشتی کنارے پر آ کر رک جائے گی۔ اپنے محبوب یعنی اس نوجوان کو اس کشتی میں سوار کرا دینا اور خود پیچھے ہٹ جانا۔ کشتی اپنے آپ دریا میں بہنے لگے گی۔ یہ کشتی اس نوجوان کو اس کے اپنے زمانے میں پہنچا دے گی۔"

پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کشتی تمہیں لے کر دریا میں تین روز تک بہتی رہے گی۔ اس دوران ہو سکتا ہے آسیبی طاقتیں مختلف روپ دھار کر تمہیں راستے سے بھٹکانے کی کوشش کریں۔ تم ان کے بہکاوے میں نہ آنا۔ اگر تم تین دن تک ثابت قدم رہے تو چوتھے روز رات کو جب تم سو جاؤ گے اور صبح اٹھو گے تو تم اپنی دنیا اپنے زمانے اور اپنے شہر میں پہنچ چکے ہو گے۔ بس اس سے زیادہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔"

تب بوڑھی جادوگرنی نے یورکا سے کہا۔

"یورکا! اب تم دونوں جا سکتے ہو۔"

یورکا نے بوڑھی جادوگرنی کے قدم چھوئے اور مجھے ساتھ لے کر غار سے باہر نکل آئی۔ کہنے لگی۔

"ہمیں سماریہ کی کارواں سرائے سے ہی بابل جانے والا کوئی نہ کوئی

قافلہ مل جائے گا۔ مجھے معلوم ہے یہاں سے بابل کو قافلے آتے جاتے رہتے ہیں۔"

میں جلد سے جلد بابل پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے چاندنی رات کو طلسمی کشتی میں سوار ہو کر اپنی دنیا میں واپس چلا جاؤں۔ ہم ایک کارواں سرائے میں آ گئے۔ رات کو ایک قافلے میں شامل ہو کر ملک بابل کی طرف روانہ ہو گئے۔ سماریہ سے بابل تک اونٹوں کے قافلوں پر بیٹھ کر یہ سفر ہم نے ایک مہینے میں طے کیا۔ ہم بابل پہنچ گئے اس زمانے میں بابل بڑا ترقی یافتہ شہر تھا۔ فصیل شہر کے کئی دروازے تھے۔ شہر میں سات سات آٹھ آٹھ منزلوں والے مکان تھے۔ یہ لکڑی کے مکان تھے اور ان پر خوب رنگ روغن کیا گیا تھا۔ ہم ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔ ہمیں پورے چاند کی رات کا انتظار تھا۔ دس روز کے بعد پورے چاند کی رات بھی آ گئی۔ یورکا مجھے ساتھ لے کر بابل کے پیچھے جو دریا بہہ رہا تھا اس کے کنارے پر لے آئی۔ رات کا وقت تھا۔ دودھیا چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ دریا کی لہریں خاموشی سے بہہ رہی تھیں۔ میں نے یورکا سے کہا۔

"یورکا! تم نے جس طرح میری مدد کی ہے۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

یورکا نے کہا۔ "میں نے تمہارے لئے جو کچھ بھی کیا محبت کی وجہ سے کیا ہے۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اب تم جا رہے ہو تو مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم اپنی دنیا میں پہنچ جاؤ گے۔ چونکہ تم یہی چاہتے ہو۔ اس لئے میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی محبت میں کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اس کے دل میں کوئی لالچ کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی۔ لیکن ہنسی خوشی مجھ سے جدا ہو رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب شاید کبھی اس سے میری ملاقات نہیں ہو گی لیکن اسے اس کا ذرا سا بھی ملال نہیں تھا۔ وہ اس بات سے ہی خوش تھی کہ وہ یہ سب کچھ میری خوشی کے لئے کر رہی ہے۔ محبت کے میدان میں یورکا مجھ سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ محبت کا یہ وہ مقام تھا کہ جہاں اپنی غرض اپنے لالچ سب کچھ ختم ہو

جاتا ہے اور صرف اپنے محبوب کی خوشی کا خیال ہی باقی رہ جاتا ہے۔

اس کے باوجود میں محسوس کر رہا تھا کہ یورکا کا چہرہ اداس ہو گیا تھا۔ اسے مجھ سے جدا ہوتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنی ذاتی خوشیوں کو اپنے محبوب کی خوشیوں پر قربان کر دیا تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تنالی دیوی کا خاص عمل پڑھنے لگی ہوں۔ یہ عمل اس نے صرف مجھے بتایا ہوا ہے۔ اس لئے کہ اسے مجھ پر اعتماد ہے کہ میں اس کے عمل کو کبھی کسی غلط مقصد کے لئے استعمال نہیں کروں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں خاموش بیٹھا ہوں"

یورکا نے آنکھیں بند کر لیں اور بوڑھی جادوگرنی کا بتایا ہوا خاص عمل پڑھنے لگی۔ دیر تک وہ عمل پڑھتی رہی۔ جب عمل پورا ہو گیا تو اس نے دریا پر ایک نگاہ ڈالی اور مجھ سے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں وہ کشتی آ جائے گی جو تمہیں لے کر تمہاری دنیا میں پہنچا دے گی"

میں نے یونہی یورکا سے پوچھ لیا۔

"یورکا! کیا اس کے بعد تم سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی؟"

یورکا نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"شاید پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔ لیکن جب تمہیں کسی بھی وقت میری مدد کی ضرورت ہو گی میں اپنے آپ تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "لیکن تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے؟"

یورکا نے اداس آواز میں کہا۔

"اگر میری محبت سچی ہے تو مجھے خود بخود پتہ چل جائے گا کہ تمہیں میری ضرورت ہے۔"

اس کے بعد وہ دریا کے کنارے بیٹھ گئی اور اس نے بوڑھی جادوگرنی تنالی کا خاص عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں بند کئے عمل پڑھتی رہی۔ جب پڑھ چکی تو اس نے آنکھیں کھول کر دریا کی طرف دیکھا۔

کہنے لگی۔

"ابھی اس جانب سے وہ کشتی نمودار ہوگی جو تمہیں تمہاری دنیا میں پہنچا دے گی۔ کشتی میں چپو بھی ہوں گے۔ مگر تمہیں ان کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کشتی کے بادبان ہوا کے زور پر اسے اپنے آپ چلاتے رہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اگر کسی مقام پر جا کر ہوا بند ہوگئی تو بادبان سمٹ جائیں گے۔ پھر کشتی کیسے چلے گی؟"۔

یورکا نے کہا۔ "یہ کوئی عام کشتی نہیں ہے۔ یہ طلسمی کشتی ہے۔ ہوا اگر بند بھی ہوگئی تو کشتی چلتی رہے گی۔"

میں بے تاب نظروں سے دریا کے اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چاندنی میں دریا دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی لہریں چمک رہی تھیں۔ اچانک مجھے دور دریا کے وسط میں ایک کشتی کے بادبان دکھائی دیئے۔ یورکا بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"تمہاری کشتی آگئی ہے۔"

اس کے بعد وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی آواز میں اداسی صاف جھلک رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یورکا مجھ سے محبت کرتی ہے اور مجھ سے جدا ہوتے ہوئے اسے دکھ ہو رہا ہے۔ مگر میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس کی محبت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں تو اس کی مدد سے کسی طرح اپنی ماڈرن دنیا میں واپس جانا چاہتا تھا اور میں بہت خوش تھا کہ میرے واپس جانے کا سبب بن گیا تھا۔ بادبانی کشتی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ اب وہ کنارے کی طرف ہوگئی تھی اور دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کشتی پر کوئی تجربے کار ملاح سوار ہے جو اسے بڑی احتیاط کے ساتھ اور بڑی مہارت کے ساتھ کنارے کی طرف لا رہا ہے۔ مگر یورکا نے بتایا تھا کہ کشتی میں کوئی ملاح نہیں ہے۔ وہ خود بخود اپنے طلسم کے زور پر چلی آ رہی ہے۔

کشتی جہاں ہم کھڑے تھے وہاں کنارے کے ساتھ آ کر لگی رہی۔ یہ کافی بڑی لمبوتری کشتی تھی میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ کشتی کے بادبانوں میں ہوا بھری ہوئی تھی جبکہ اس وقت ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی۔ یورکا نے کہا۔

"کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ تمہارے مجھ سے جدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔"

میں تو اس وقت کا ایک عرصے سے انتظار کر رہا تھا۔ بزرگ کی دی ہوئی انگوٹھی میری انگلی میں تھی۔ میں نے اس پر ایک نگاہ ڈال تسلی کر لی اور یورکا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یور کا! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

یور کا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پورے چاند کی چاندنی میں وہ دریا کے کنارے خاموش کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی اداسی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس لڑکی کا کس طرح سے شکریہ ادا کروں جس نے مجھ سے بے پناہ محبت کی تھی اور جو اب خود مجھے اپنے آپ سے جدا کر رہی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو سلطانہ کی طرح مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا قیدی بنا کر رکھ سکتی تھی۔ بلکہ وہ اپنے طلسم کی مدد سے میرے ذہن سے میری یادداشت ختم کر کے مجھے اپنا گرویدہ بنا کر اپنے ساتھ رکھ سکتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اسے صرف میری خوشی منظور تھی۔ اور اس نے میری خوشی کے لئے اپنے جذبات کو قربان کر دیا تھا۔ یور کا واقعی ملکہ سلطانہ سے محبت میں بہت آگے نکل چکی تھی۔

میں خاموشی سے کشتی میں سوار ہو گیا اور ایک بادبان کے پاس رسی پکڑ کر کھڑا رہا اور یور کا کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی لیکن اس سے ہمدردی ضرور تھی۔ اسے اداس دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ اچانک کشتی کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور اپنے آپ کنارے سے ہٹنے لگی۔ کنارے سے ہٹتی ہٹتی کشتی دریا کے وسط میں آ گئی۔ میں وہیں کھڑا یور کا کو دیکھ رہا تھا۔ چاندنی میں وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی مجھے مسلسل تک رہی تھی۔ کشتی دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگی۔ یور کا مجھ سے دور ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کا سراپا دھندلا ہوتا گیا۔ پھر وہ میری نظروں سے اور میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ یور کا کے دل پر اس وقت کیا گزری تھی لیکن میں خوش تھا کہ جس کشتی میں سوار ہوا ہوں وہ تین روز کے بعد مجھے میری دنیا میں پہنچا دے گی۔ میں نے کشتی کا جائزہ لیا۔ یہ کشتی ایک بڑے بیڑے کی طرح تھی جس میں عام طور پر مسافر سوار ہو کر دریا پار کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کشتی میں سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا۔ میں کشتی کے سامنے کے رخ پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ کشتی کا سامنے والا تکونی حصہ

تھا۔ چاندنی میں کشتی دریا کی لہروں کو چیرتی ہوئی خدا جانے کس طرف بھی چلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں وہاں کھڑا دریا کا نظارہ کرتا رہا۔ پھر کشتی کے عرشے کے وسط میں جہاں بیٹھنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی آ کر بیٹھ گیا۔

بادبانی کشتیاں اگرچہ ہوا کے زور پر اپنے آپ چلتی ہیں لیکن انہیں صحیح رخ پر رکھنے اور انہیں گھمانے اور موڑنے کے لئے دو تین ملاح ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر کشتی کنارے کی طرف جا کر کنارے سے ٹکرا سکتی ہے یا اگر دریا میں کوئی چٹان ابھری ہوئی ہو تو اس سے بھی ٹکرا سکتی ہے۔ چنانچہ اسے کنٹرول میں رکھنے کے لئے ملاحوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اس کشتی میں کوئی ملاح نہیں تھا۔ کشتی اپنے آپ کنارے کی طرف آئی تھی اور مجھے لے کر اپنے آپ کنارے سے ہٹ کر دریا کے وسط میں آ گئی تھی۔ کشتی کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے چپو تھے جو اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آ گیا کہ تنالی دیوی نے ہدایت کی تھی کہ میں ان چپوؤں سے کشتی کو چلانے کی کوشش نہ کروں۔ اس نے مجھے خاص طور پر ان چپوؤں سے کشتی چلانے سے منع کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کشتی بڑے آرام سے اپنے آپ چلی جا رہی ہے مجھے چپوؤں سے مدد لینے کی کیا ضرورت ہے۔

ساری رات کشتی دریا میں بہتی رہی۔ دریا کے دونوں جانب کناروں پر کبھی جنگل آ جاتے اور کبھی صحرائی ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دوسرے دن بھی کشتی بہتی چلی گئی۔ خدا جانے یہ کس قسم کا دریا تھا کہ نہ کشتی رکتی تھی نہ دریا ختم ہونے کا نام لیتا تھا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ تین راتیں گزر جانے کے بعد چوتھے روز کشتی جب میں صبح کو بیدار ہوں گا تو اپنی دنیا کے کسی شہر میں پہنچ گیا ہوں گا۔ میں بار بار گن گن کر ایک ایک دن گزار رہا تھا۔ ایک دن گزر گیا دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسرے دن کی رات آ گئی تو میں بڑا خوش ہوا کہ صبح میں اپنے شہر پہنچ جاؤں گا۔ میرے خیال میں اس کشتی کو میرے شہر لاہور کے دریائے راوی میں جا نکلنا تھا۔ یا پھر ہو سکتا ہے میں دریائے سندھ کے کنارے کسی شہر میں پہنچ جاؤں۔

تیسری رات کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر رات کے دوسرے پہر زرد زرد چاند طلوع ہو گیا اور دریا پر اس کی زرد اداس چاندنی پھیل گئی۔ میں جاگ رہا تھا

اور بڑے غور سے کناروں کو دیکھ رہا تھا کہ شاید میں اپنی دنیا میں آگیا ہوں اور ممکن ہے یہ میرے وطن عزیز کا کوئی دریا ہو۔ مگر دریا کے دونوں کناروں پر درخت ہی درخت تھے۔ اس کے بعد پہاڑی ٹیلے نظر آنے لگے۔ یہ میرے وطن کے پہاڑ نہیں لگتے تھے۔ آدھی رات کے وقت چاند جس طرف سے طلوع ہوا تھا اس طرف غروب ہو گیا۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے مجھے اس خوشی سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ میں صبح کو اپنے وطن، اپنے زمانے میں اپنی دنیا میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ رہا ہوں۔

گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ وقت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی باقی رہ گئی ہے۔ کافی وقت گزر گیا۔ مگر صبح ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے رات اپنی جگہ پر ٹھہر گئی ہے۔ وقت رک گیا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ستاروں کی روشنی میں اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ میری انگوٹھی جس نے مجھے واپس اپنی دنیا میں پہنچانا تھا میری انگلی میں موجود تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کشتی کی رفتار ہلکی ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس کے بادبانوں میں ویسے ہی ہوا بھری ہوئی تھی مگر کشتی کی رفتار ہلکی ہوتے جا رہی تھی۔ قدرتی طور پر میں پریشان ہو گیا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ پھر خیال آیا کہ شاید میں اپنی دنیا میں پہنچنے والا ہوں۔ کشتی کی رفتار اس وجہ سے کم ہو رہی ہے۔ میں نے بڑے غور سے دریا کے کناروں کو دیکھا۔ دونوں جانب اب پہاڑی ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے اور ایک بار پھر گھنے جنگل شروع ہو گئے تھے۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے جیسے اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے تھے۔ جیسے ان کی گردش بھی رک گئی تھی۔ مشرق کی جانب ستارہ صبح جو رات کے پچھلے پہر نکلتا تھا اس کا بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میری نظر کشتی کے بادبانوں پر پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ بادبانوں میں بھری ہوئی ہوا کم ہو رہی ہے اور وہ آہستہ آہستہ سکڑ رہے ہیں۔ حالانکہ اس وقت ہوا چل رہی تھی پھر ایسا ہوا کہ بادبانوں میں سے ہوا خارج ہو گئی اور وہ چیتھڑوں کی طرح کشتی کے مستول سے لٹکنے لگے۔ اب تو میں گھبرا گیا۔ خدا جانے ایسا کیوں ہو رہا تھا اس کے ساتھ ہی کشتی چلتے چلتے بیچ دریا میں ایک دم رک گئی۔ وہ ایسے رک گئی تھی جیسے کسی نے اسے نیچے سے جکڑ لیا ہو۔ وہ دریا کی سطح پر ذرا سا بھی نہیں ہل رہی تھی۔ میں واقعی پریشان ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پھر سوچا کہ شاید یہ بھی کشتی کے طلسمی عمل کا کوئی ضروری پہلو ہو اور کچھ دیر کے بعد کشتی پھر چل پڑے گی۔ میں دل پر پتھر رکھ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبھی سکڑے ہوئے بادبانوں کو دیکھ لیا۔ کبھی کشتی پر جھک کر دریا کو دیکھا کہ کشتی نے چلنا شروع تو نہیں کر دیا۔ لیکن بادبان بھی ساکت تھے اور کشتی بھی اپنی جگہ پتھر بن گئی تھی۔

پہلے میں گھبرایا ہوا تھا۔ پریشان تھا۔ پھر اس خیال سے مجھ پر مایوسی چھا گئی کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رات کو آسمان پر ستارے سفر کرتے رہتے ہیں سات ستاروں کی جو ٹولی جس کو دب اکبر کے ستارے یا سات سہیلیوں کی ٹولی یعنی بنات النعش کہتے ہیں وہ آدھی رات کو آسمان کے وسط میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے رات گزرتی جاتی ہے وہ مشرق کی طرف جھکتے چلے جاتے ہیں لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ یہ سات ستاروں کی ٹولی کافی دیر سے اپنی جگہ پر قائم تھی۔ اپنے مقام سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔ جب میرے اپنے حساب سے دو تین گھنٹے گزر گئے اور رات ویسی کی ویسی ساکت رہی اور کشتی نے بھی ذرا سی حرکت نہیں کی تو کیوں نہ ایک طرف سے چپو چلانے کی کوشش کروں۔ ہو سکتا ہے کشتی کو ذرا سا دھکا لگے تو وہ آگے کو چل پڑے۔ آخر چپو چلانے سے کیا ہو جائے گا۔ آدمی پر جب کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ گھبرا کر ادھر ادھر ضرور ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور تنکے کو بھی سہارا سمجھ لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میں نے بغیر اس کا خیال کئے کہ مجھے چپو چلانے سے منع کیا گیا ہے ایک چپو کو پکڑ کر نیچے کیا اور اسے دریا میں ڈال کر دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ چپو کافی وزنی تھا۔ چپو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ میں نے اور زور لگایا تو اچانک میری انگلی سے بزرگ کی دی ہوئی نایاب انگوٹھی پھسل کر دریا میں گر پڑی۔

میں حواس باختہ سا ہو کر دریا کو تکنے لگا۔

میں گھبرا کر دریا میں چھلانگ لگانے لگا تو ایک دم رک گیا۔ دریا میں سے دو مگرمچھوں نے اچانک اپنے تیز نوکیلے دانتوں والا منہ کھولا اور کشتی کی طرف بڑھے۔ میں وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ مگرمچھ کشتی کے گرد چکر لگانے لگے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں

نے چپوؤں کو چلانے کی کوشش کر کے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ تنالی دیوی نے مجھے خبردار کیا تھا کہ چپوؤں کو کسی حالت میں بھی چلانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اور جو انگوٹھی میں نے یورکا کی مدد سے اتنے خطرات مول لے کر موت کے منہ میں ہاتھ ڈال کر واپس لی تھی وہ ایک بار پھر مجھ سے کھو گئی تھی۔ میرے اپنی دنیا میں جانے کی آخری امید بھی دریا میں غرق ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اچانک ہوا چلنے لگی۔ مگر بادبان اس طرح چیتھڑوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ وہ ہوا میں بالکل نہیں پھولے تھے۔ کشتی ہوا کی وجہ سے اپنی جگہ پر ڈولنے لگی تھی لیکن دریا میں ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

ہوا نے تیزی اختیار کر لی۔ پھر اچانک آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ ستارے غائب ہو گئے۔ آسمان کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ بجلی کڑکنے لگی بادل گرجنے لگے اور بارش شروع ہو گئی۔ ہوا نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ دریا میں سیلاب آ گیا۔ لہریں سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح اوپر اٹھنے لگیں۔ کشتی ایک دم اوپر کو اٹھتی اور پھر نیچے جیسے دریا کی گہرائیوں میں اتر کر دوبارہ اوپر آ جاتی۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ ایک بار کشتی اوپر کو اچھلی تو میرے حلق سے مارے خوف و دہشت کے چیخ سی نکل گئی۔

کشتی طوفانی بارش اور تیز ہواؤں میں بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ تیز ہواؤں کی چیخوں سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ اچانک ایک زبردست کڑک کے ساتھ آسمانی بجلی کشتی کے مستول پر گری اور مستول بادبانوں سمیت دو ٹکڑے ہو کر کشتی پر گرا اور کشتی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کشتی کا ایک حصہ مستول سمیت دریا میں میری آنکھوں کے سامنے غرق ہو گیا۔ میں کشتی کے دوسرے حصے سے چمٹا ہوا تھا۔ کشتی کا یہ حصہ غرق ہونے سے بچ گیا تھا۔ کشتی کا یہ ٹکڑا تیز ہواؤں کے زور سے دریا کی تند و غضب آلود موجوں پر ادھر ادھر اچھلنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں زندہ نہیں بچوں گا۔ طوفانی ہوائیں سمندر کی طرح بپھرے ہوئے دریا کی بلاخیز موجوں پر مجھے کشتی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پر بہائے لئے جا رہی تھیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی شور ہی شور بارش ہی بارش تھی۔ بادل گرج رہے تھے بجلی کڑک کر چمکتی تو میری آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ جاتیں۔ کشتی کا ٹوٹا ہوا حصہ جس کے ساتھ میں چمٹا ہوا تھا طوفانی رفتار کے ساتھ موجوں

کے ساتھ کبھی اوپر کو اچھلتا کبھی نیچے کو گرتا خدا جانے کس طرف بہا چلا جا رہا تھا۔

میں نے کشتی کے ایک ٹوٹے ہوئے کنارے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ کشتی کا ٹوٹا ہوا حصہ اس طرح اچھل رہا تھا جیسے اسے کوئی جن بھوت اٹھا اٹھا کر دریا کی طوفانی لہروں پر پٹخ رہا ہو۔ پھر ایک بار بجلی اتنے زور سے کڑکی اور اس کا اتنا قیامت خیز دھماکہ ہوا کہ کشتی کے ٹوٹے ہوئے کنارے سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا اور کشتی نے مجھے گیند کی طرح اوپر کو اچھال دیا۔ میں بارش اور ہوا میں اڑتا اڑتا کنارے کی ریت پر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا ہوں گا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرا جسم جگہ جگہ سے دکھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر ماحول کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ دن کا وقت ہے۔ دھوپ نکلی ہوئی ہے اور میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان پڑا ہوں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ ریت کے ٹیلوں کو دیکھ کر مجھے خیال آ گیا کہ شاید میں اپنی دنیا میں پہنچ گیا ہوں کہ یہ رحیم یار خان کے قرب و جوار کے ریت کے ٹیلے ہیں۔ میں بے اختیار اٹھا اور دوڑ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ دوسری طرف دیکھوں شاید ادھر رحیم یار خان کا شہر نظر آ جائے۔

ٹیلے کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دوسری طرف دیکھا تو رحیم یار خان کے شہر کی بجائے مجھے ساتھ ساتھ کھڑے تین اہرام دکھائی دیئے یہ اہرام مصر تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ تقدیر نے مجھے عہد قدیم کے مصر میں لا پھینکا تھا۔ مجھے تقدیر کی اس ستم ظریفی بلکہ بے رحمی پر رونا آ گیا۔ ایک بات میں آپ کے علم میں لانا بھول گیا ہوں کہ جب سے میں اپنی حقیقت کی دنیا سے نکل کر ماضی کی خواب آلود دنیا میں آیا تھا نہ مجھے بھوک لگی تھی۔ نہ پیاس لگتی تھی نہ گرمی لگتی تھی اور نہ سردی کا احساس ہوتا تھا۔ اپنی مرضی سے کچھ کھا پی لوں تو الگ بات ہے ورنہ مجھے کھانے پینے کی بالکل حاجت نہیں تھی۔ میں نیند سے بھی بے نیاز تھا۔ اپنی مرضی سے سونا چاہوں تو نیند آ جاتی تھی۔ جس طرح انسان جب خواب دیکھتا ہے تو اسے بھوک پیاس نیند اور گرمی سردی کا احساس نہیں ہوتا اس طرح میں بھی ان چیزوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

عجیب بات ہے مجھے پہلی بار تھکن اور شکستگی کا احساس ہو رہا تھا- شاید یہ اس طوفان بادوباراں کا اثر تھا جس کے اثر سے دریا میں سمندر کا جوش آگیا تھا اور اس کی غضبناک موجوں نے میری کشتی کے دو ٹکڑے کر کے مجھے ساحل پر اچھال دیا تھا- میں نے پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پیچھے وہ دریا غائب ہو چکا تھا جس میں سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا تھا- اس خیال سے کہ خواب کی دنیا میں منظر اس طرح بدلتے ہی رہتے ہیں میں ٹیلے سے اترا اور اہرام کی طرف چلنے لگا- اہرام کے قریب ہی ایک گاؤں آباد تھا اس گاؤں کے لوگ بڑے غریب حبشی لوگ تھے جن کے رنگ کالے اور بال حبشیوں کی طرح گھنگریالے تھے- اسی گاؤں کے باہر ایک قافلہ رکا ہوا تھا- معلوم ہوا کہ میں ملک حبشہ یعنی ماڈرن زمانے کے سوڈان میں ہوں جو مصر کے جنوب میں واقع ہے اور یہ قافلہ مصر کے قدیم دارالحکومت تھیبس جا رہا ہے- میرے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا- میں مصر جانا چاہتا تھا کہ شاید وہاں جا کر میرے واپس جانے کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے کیونکہ میں مصر کے ایک اہرام سے ہی ایک حادثے کے بعد اپنی ماڈرن دنیا چھوڑ کر ماضی کی دنیا میں داخل ہوا تھا- میں قافلے کے سردار سے جا کر ملا اور کچھ اس طرح اس کی منت سماجت کی کہ وہ مجھے قافلے کے ساتھ لے جانے پر راضی ہو گیا- رات کے پہلے پہر میں یہ قافلہ صحرا میں اپنے سفر پر روانہ ہو گیا- صحرا کی قیامت خیز گرمی سے بچنے کے لئے اس زمانے میں قافلے رات کے وقت سفر کیا کرتے تھے-

چھ راتوں کے سفر کے بعد قافلہ دو ہزار سال پرانے فرعونوں کے مصر کے دارالحکومت تھیبس پہنچ گیا- یہاں بھی فرعونوں کے تین اہرام دور سے دکھائی دے رہے تھے- میں کارواں سرائے سے نکل کر شہر کی سیر کو نکل گیا- یہ بھی پرانے زمانے کی طرز کا ایک قدیم شہر تھا- دو دو تین تین منزلہ مکان تھے جن کی دیواروں پر سفید اور نیلا رنگ کیا گیا تھا- شہر کے ارد گرد باغ تھا جس میں کھجور زیتون اور مہندی کے بے شمار درخت تھے- شہر کے باہر ایک بہت بڑا معبد تھا جس میں بلیوں الووں اور کتوں اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کے بت رکھے ہوئے تھے- اس کے کشادہ برآمدوں میں بڑے اونچے اونچے دیو قامت ستون تھے- وہ بالکل صحیح حالت میں تھے- یہ وہ معبد تھا جو آج

کے زمانے میں کارنک کے کھنڈرات کے طور پر مشہور ہے- شہر کی سڑکیں کچی تھیں مگر ان پر جگہ جگہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا- لوگ گھوڑوں پر اور رتھوں پر آ جا رہے تھے- غریب لوگ گدھوں کو ساتھ لئے چل رہے تھے- میں سورج غروب ہونے تک شہر میں پھرتا رہا- میرا لباس اس زمانے کے عام غریب لوگوں جیسا تھا اس لئے کسی نے میری طرف توجہ نہ کی تھی- قدرتی طور پر میں اس زمانے کی زبان سمجھنے لگا تھا- ایک دریا شہر کے درمیان میں بہہ رہا تھا- اس میں کشتیاں چل رہی تھیں- دریا کی دوسری جانب کنارے کے ساتھ ساتھ امیر لوگوں کے پتھر کے محل تھے جن کے آگے اونچے اونچے کھجوروں کے درخت شام کی ہوا میں لہرا رہے تھے-

میں ایک بازار میں سے گزر رہا تھا- اچانک بازار میں شور مچ گیا- لوگ گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے میں بھی ان کے ساتھ بھاگنے لگا کہ خدا جانے یہاں کونسی مصیبت نازل ہونے والی ہے- میں نے بھاگتے ہوئے ایک مزدور قسم کے آدمی سے پوچھا کہ یہاں کیا ہو گیا ہے- یہ لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں؟ اس نے بتایا کہ فرعون کے سپاہی لوگوں کو پکڑنے کے لئے آ گئے ہیں- بعد میں معلوم ہوا کہ ایک نیا اہرام بن رہا تھا جس کے لئے غریب اور نادار قسم کے لوگوں کو فرعون کے سپاہی زبردستی پکڑ کر لے جاتے تھے- ان کو غلام بنا کر ان سے بیگار لی جاتی تھی- یہ لوگ شہر سے ساٹھ ستر میل دور ایک پہاڑی کے پتھروں کو توڑتے تھے پھر انہیں رسوں کی مدد سے ساٹھ ستر میل تک گھسیٹ کر لاتے تھے تاکہ انہیں تراش کر کاٹ کر اور موڑ کر اہرام تعمیر کیا جائے- ان غلاموں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا- دوڑتے دوڑتے میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ شہر سے باہر نکل گیا- آگے صحرا شروع ہو گیا- کوئی کسی طرف کوئی کسی طرف چلا گیا- میں بھی ایک طرف بھاگتا چلا گیا- مگر ریتلے صحرا میں آدمی کے لئے بھاگنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے- میں جتنی تیز چل سکتا تھا چلتا ہوا ایک ٹیلے کے پیچھے جا کر چھپ گیا-

شہر کی طرف سے آنے والا شور وغل مدھم پڑتے پڑتے خاموش ہو گیا معلوم ہو رہا تھا کہ فرعون کے سپاہیوں نے جتنے آدمیوں کو بیگار میں پکڑنا تھا انہیں پکڑ کر لے گئے تھے- اس وقت سورج صحرائی ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو گیا تھا اور صحرا پر شام کا

اندھیرا چھانے لگا تھا- رات سر پر آگئی تھی- میں سوچنے لگا کہ میں رات کہاں گزاروں گا- کارواں سرائے وہاں سے دور تھی اور اس تک پہنچنے کے لئے شہر میں سے گزرنا پڑتا تھا- میں ابھی شہر میں جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا- میں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر مغرب کی جانب ایک جگہ کھجوروں کے جھنڈوں کو دیکھا- میں اس طرف چل پڑا- وہاں پہنچ کر دیکھا کہ یہ ایک وسیع و عریض نخلستان تھاہاں جگہ جگہ کھجور اور زیتون کے درخت کھڑے تھے- ان کے عقب میں جگہ جگہ ممیوں کے تابوت زمین میں آدھے دفن تھے اور آدھے باہر نکلے ہوئے تھے- یہ کوئی قبرستان معلوم ہو رہا تھا- نخلستان میں ایک چشمہ بہہ رہا تھا- میں چشمے کے کنارے ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھ گیا- مجھے رات کو سونے کی حاجت نہیں تھی- میں بھوک پیاس سے بھی بے نیاز تھا- میں بیٹھے بیٹھے بھی رات بسر کر سکتا تھا-

اگر دل چاہے تو میں سو بھی سکتا تھا- لیکن میں جسمانی آرام اور سکون کے لئے نیند کا محتاج نہیں تھا- میں نے اس پر فضا مقام پر رات بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا- جب تک آسمان پر تاروں نے پوری آب و تاب سے چمکنا شروع نہیں کیا تھا صحرا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی- جیسے ہی آسمان پر ستاروں نے پوری آب و تاب سے چمکنا شروع کیا صحرا میں ایسی ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی جیسے چاندنی پھیلی ہوتی ہے- لیکن باغ میں جہاں کھجوروں کے جھنڈ تھے اور میں بیٹھا ہوا تھا وہاں درختوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا- خاموشی اتنی گہری تھی کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا- یہ آج سے دو ہزار برس پہلے صحراؤں کی رات کی خاموشی تھی جہاں دور سے کسی ٹرک کسی رکشا کے گزرنے کی آواز بھی نہیں آسکتی تھی- نخلستان کے چشمے کی آواز ایسے آ رہی تھی جیسے کوئی قریب بیٹھا سرگوشیاں کر رہا ہو- یہ ہیبت ناک ماحول بن گیا تھا- ایک عجیب طرح کا خوف سا میرے دل پر اثر انداز ہو رہا تھا- معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہے- مجھے نیند تو آ نہیں رہی تھی- مجھے نیند کی حاجت بھی نہیں تھی- میں تو صرف رات گزارنے وہاں آگیا تھا- میں کھجور کے ایک درخت سے ٹیک لگائے اندھیرے اور کچھ کچھ ستاروں کی روشنی میں چشمے کے سرگوشیاں کرتے بہتے پانی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا- پتہ نہیں رات کتنی گزر چکی تھی- ایک عجیب ہولناک سا سناٹا چاروں طرف چھایا

ہوا تھا- آدھے دفن تابوتوں والے قبرستان کی جانب موت ایسی خاموشی طاری تھی-

اچانک مجھے ایسے لگا جیسے کوئی سوکھے پتوں پر چلتا میری طرف بڑھ رہا ہے- میں نے پلٹ کر پیچھے کی جانب دیکھا- وہاں کوئی نہیں تھا- میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر آنکھیں بند کر لیں اور یہی فیصلہ کیا کہ الو کی طرح آنکھیں کھول کر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ- مجھے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے سو ہی جانا چاہئے- چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا- تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے نیند آ جاتی تھی- ابھی مجھ پر ہلکی سی غنودگی طاری ہوئی تھی کہ وہی آواز دوبارہ میرے کانوں میں آئی- ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی خشک پتوں پر آہستہ آہستہ چلتا میرے قریب آکر رک گیا ہو- میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا- مگر وہاں کوئی نہیں تھا- اب میں گھبرا سا گیا- اتنے میں مجھے ایک عورت کی تھکی ہوئی خشک آواز آئی-

"مجھے پیاس لگی ہے- مجھے پانی پلا دو"

میں جلدی سے اٹھ کر دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا- اب جو غور سے دیکھا تو درختوں کے نیچے ستاروں کی دھندلی سی روشنی اور اندھیرے میں مجھے ایک انسانی ہیولا سا دکھائی دیا- یہ ایک عورت کا ہیولا تھا جس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا- بال دونوں طرف کھلے تھے- اور درمیان میں زرد اداس چہرہ دھندلا نظر آ رہا تھا- میں بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا- خوف کے مارے میرا اپنا حلق خشک ہونے لگا تھا-

اس عورت کی آواز آئی-

"مجھ سے ڈرو نہیں- مجھے پیاس لگی ہے- مجھے پانی پلا دو-"

آخر میں نے ہمت کر کے اس سے کہا-

"چشمے کا پانی بہہ رہا ہے- تم خود کیوں نہیں پی لیتی؟"

عورت کے ہیولے نے اسی خشک اور تھکی آواز میں کہا-

"میں چشمے کے پاس گئی تو چشمے میں آگ لگ جائے گی- مجھے تم پانی پلا دو- مجھے بڑی پیاس لگی ہے-"

اس انسانی ہیولے سے جو یقیناً کوئی بھٹکی ہوئی پیاسی روح تھی دو چار باتیں کرنے کے بعد مجھ میں خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی تھی اور میرا ڈر خوف بھی کسی حد تک

دور ہو گیا تھا- میں نے کہا-

"میں تمہیں کیسے پانی پلاؤں- میرے پاس کوئی برتن نہیں ہے-"

بھٹکی ہوئی پیاسی روح نے کہا-

"چشمے کے پاس جاؤ- وہاں تمہیں ایک مٹی کا مٹکا ملے گا- اس میں پانی بھر کر لے آؤ-"

میں چشمے کی طرف گیا- دیکھا کہ واقعی وہاں پتھروں کے اوپر ایک مٹی کا مٹکا پڑا تھا- میں نے اسے پانی سے بھرا اور لے کر بھٹکی ہوئی پیاسی روح کے پاس لے آیا- اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھ سے مٹکا لے کر منہ کے ساتھ لگایا اور مٹکے کا سارا پانی پی گئی- اس نے خالی مٹکا مجھے دیتے ہوئے کہا-

"تم نے میری سینکڑوں برس کی پیاس بجھائی ہے- میں رات کے وقت جب کسی مسافر کو یہاں دیکھتی تھی تو اس کے پاس آکر اسے کہتی تھی کہ مجھے پیاس لگی ہے- مجھے پانی پلا دو تو وہ ڈر کر بھاگ جاتا تھا- اس طرح میں ایک مدت سے پیاسی چلی آرہی تھی- تم پہلے مسافر ہو جس نے میری سینکڑوں برس کی پیاس بجھائی ہے- بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

میں نے فوراً کہا- "میں سینکڑوں برس آگے کے زمانے سے اس دنیا میں آگیا ہوں- کسی طرح مجھے واپس میری دنیا میں پہنچا دو-"

بھٹکی ہوئی روح نے کہا-

"مجھے تمہاری مصیبت کا علم ہے- مگر مجھے افسوس ہے کہ یہ کام میرے اختیار سے باہر ہے- مجھے کوئی اور کام بتاؤ-"

میں نے کہا- "تو پھر کسی طریقے سے میری انگوٹھی مجھے واپس لا دو- جو میرے ہاتھ سے نکل کر دریا میں گر گئی تھی-"

بھٹکی ہوئی روح نے کہا-

"مجھے افسوس ہے کہ یہ بات بھی میرے اختیار سے باہر ہے- میں اگر کسی نیک عورت کی روح ہوتی تو میں تمہارے دونوں کام کر سکتی

تھی- مگر میں ایک گناہ گار عورت کی روح ہوں اور اپنے گناہوں کی سزا کے طور پر پیاسی رہ کر بھٹکتی پھر رہی ہوں- میں تمہارا صرف ایک کام کر سکتی ہوں- مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس وقت کس چیز کی ضرورت ہے- میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ-"

میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا؟ بھٹکتی روح میرے قریب سے ہو کر آگے گزر گئی- جب وہ میرے قریب سے گزری تو مجھے مشک کافور کی تیز خوشبو یا بو محسوس ہوئی- مشک کافور ہمارے ہاں بھی عام طور پر میت کو دفن کرنے سے پہلے لگایا جاتا ہے- میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا- دل میں سوچ رہا تھا کہ اس کو کیسے علم ہو گیا کہ مجھے اس وقت کس چیز کی ضرورت ہے- اس وقت مجھے سب سے زیادہ ضرورت اس ملک کی کرنسی کی تھی یعنی ان سکوں کی تھی جو اس ملک میں رائج تھا- اس کے بغیر میں نہ تو کسی قافلے میں وہاں سے آگے سفر کر سکتا تھا اور نہ کسی کاروان سرائے میں رہ سکتا تھا- اور نہ اپنے بوسیدہ پھٹے ہوئے کپڑوں کی جگہ دوسرے کپڑے خرید سکتا تھا- یہ سوچ کر میں خاموش رہا کہ یہ بھٹکی ہوئی گناہ گار روح ہی سہی مگر آخر روح ہے- اس کو میرے دل کا حال معلوم ہو گیا ہو گا-

بھٹکی روح مجھے ایک کھنڈر کے پاس لے گئی- اس کھنڈر میں ایک سرنگ بنی ہوئی تھی- کہنے لگی-

"اس سرنگ میں چلتے جانا- سرنگ میں اندھیرا ہو گا- اندھیرے سے ہرگز نہ گھبرانا- یہ سرنگ تمہیں ایک خانقاہ میں لے جائے گی- وہاں تمہیں ساتھ ساتھ پڑے ہوئے تین تابوت نظر آئیں گے- تم درمیان والے تابوت کے پاس کھڑے ہو کر کہنا کہ مجھے شفارا نے تمہارے پاس بھیجا ہے- میری مدد کرو- اس کے بعد تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ تمہیں مل جائے گی- جاؤ- میں تمہارے لئے یہی کچھ کر سکتی ہوں-"

اتنا کہہ کر عورت کا ہیولا غائب ہو گیا-

میں سرنگ کے دہانے کے پاس اکیلا کھڑا تھا۔

سوچنے لگا کہ کہیں کسی اور مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ لیکن دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ میں اندھیرا تھا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا مگر میں دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر چلتا رہا۔ ایک جگہ سرنگ میں ایک دم گرمی بڑھ گئی۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد فضا پھر ٹھیک ہو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں سرنگ میں چلتا رہا۔ آخر مجھے سرنگ میں دور ہلکی روشنی دکھائی دی۔ یہ روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ سرنگ یہاں آکر ختم ہو جاتی تھی۔ یہ روشنی جسے میں دن کی روشنی سمجھ رہا تھا شعلوں کی روشنی تھی۔ میں ایک دالان میں نکل آیا جہاں ستونوں کے ساتھ تین مشعلیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گرد آلود فرش پر ساتھ ساتھ تین تابوت پڑے تھے۔ میں شفارا کی ہدایت مطابق درمیان والے تابوت کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور کہا۔

"مجھے شفارا نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ میری مدد کرو۔"

یہ جملہ میں نے ادا کیا ہی تھا کہ تابوت کا ڈھکنا ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ اوپر اٹھنے لگا۔ جب ڈھکنا پورا اوپر کو اٹھ گیا تو اس کے اندر لیٹی ہوئی ایک عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ مردہ عورتوں کے چہرے کی طرح تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کھڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"مجھے تمہاری مصیبت کا حال معلوم ہے۔ مگر میں تمہاری اصل مصیبت دور نہیں کر سکتی۔ جتنا میرے اختیار میں ہے میں اتنی ہی تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ اس خانقاہ سے باہر نکلو گے تو تمہیں ایک

گھوڑا درخت کے نیچے کھڑا ملے گا۔ اس پر زین کسی ہوئی ہو گی تم اس پر سوار ہو جانا۔ وہ صحرا میں ایک رات کے سفر کے بعد دن چڑھے تمہیں دریا کنارے ایک مکان کے پاس لے جائے گا۔ اس مکان میں تمہیں ایک عورت ملے گی۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔ وہی تمہاری مصیبت دور کر سکے گی۔ اس کا نام سمارا ہو گا۔"

یہ کہہ کر عورت دوبارہ تابوت میں لیٹ گئی اور تابوت کا ڈھکنا بند ہو گیا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا۔ میں اس میں سے گزر کر باہر آیا تو دیکھا کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ صحرا میں شام کا اندھیرا پھیل رہا ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا۔ درخت کے نیچے ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا کھڑا تھا جس پر زین وغیرہ کسی ہوئی تھی۔ میں اس پر سوار ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے گھوڑے کی باگیں اپنے ہاتھ میں لیں گھوڑا چل پڑا۔ کچھ دور تک وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پھر اس نے رفتار تیز کر دی۔ پھر اس کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ مجھے ایسے لگا جیسے گھوڑا ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔

میں زین پر جم کر بیٹھا تھا۔ پہلے مجھے دھچکے لگ رہے تھے۔ پھر دھچکے لگنے بند ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ گھوڑا زمین سے ایک دو فٹ بلند ہو کر اڑ رہا ہے۔ میں جس دنیا میں پہنچ چکا تھا اور جس عالم میں تھا وہاں سب کچھ ہو سکتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے صحرا میں رات چھا گئی۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ گھوڑا زمین سے بلند ہو کر برق رفتاری سے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی طاقت اسے فضا میں اڑائے لئے جا رہی تھی۔ مجھے اس گھوڑے پر ساری رات بسر کرنی تھی۔ عجیب بات تھی کہ مجھے کسی قسم کی تھکن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پھر جیسے میں سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو گھوڑا ایک دریا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دریا صحرا میں دور سے صاف نظر آ رہا تھا۔ گھوڑا دریا کے اوپر سے گزر کر دوسرے کنارے پر آ گیا۔

یہاں دن کی روشنی میں مجھے ایک مکان نظر آیا- یہ ایک منزلہ مکان تھا- اس کے صحن میں ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی- صحن خالی تھا گھوڑا مکان کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا- میں گھوڑے سے اتر آیا میرے اترنے کے بعد گھوڑا جس طرف سے آیا تھا اس طرف چل پڑا- میں مکان کے صحن میں اکیلا کھڑا سوچ رہا تھا کہ جس عورت کو مجھے ملنے کے لئے کہا گیا ہے وہ کہاں ہو گی- مکان بالکل خالی خالی لگتا تھا- میں مکان کے برآمدے کی طرف بڑھا جس کے ستونوں پر انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں- میں ایک ستون کے پاس جاکر رک گیا- اتنے میں مکان کے سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان عورت باہر نکلی- اس نے ریشمی لباس پہن رکھا تھا- وہ بڑی خوبصورت تھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی- اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنی زبان میں کہا-

"خوش آمدید! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی- میرے ساتھ آ جاؤ-"

وہ مجھے مکان کے اندر ایک کشادہ کمرے میں لے گئی جہاں فرش پر سرخ اور سبز قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے- دیوار کے پاس ایک تخت بچھا تھا- تخت پر بھی قالین بچھے تھے اور گاؤ تکیئے لگے ہوئے تھے- وہ عورت تخت پر بیٹھ گئی اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا- کہنے لگی-

"میں جانتی ہوں تمہارا ہماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور تم بہت آگے کے زمانے سے آئے ہو اور ہماری زبان سمجھتے ہو-"

میں نے کہا- "اگر تم میری مصیبت سے واقف ہو اور میری مدد بھی کرنا چاہتی ہو تو کسی طرح مجھے میری دنیا میں واپس پہنچادو-"

وہ ہنس پڑی- کہنے لگی-

"میرے ساتھ رہو گے تو ایسا بھی ہو جائے گا- میں سب سے پہلے تمہیں اپنا تعارف کروانا چاہوں گی- میرا نام جیسا کہ تمہیں بتایا گیا ہے

سمارا ہے- میں کوئی جن بھوت یا چڑیل یا بھٹکی ہوئی روح نہیں ہوں- میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں- مجھ میں اور تجھ میں صرف اتنا فرق ہے کہ قدرت نے مجھے کچھ طاقتیں عطا کر رکھی ہیں- میری گزرے ہوئے زمانے پر بھی نظر ہے اور میں آنے والے زمانے کو بھی دیکھ سکتی ہوں-"

میں نے کہا- "اگر تم سب کچھ دیکھ سکتی ہو تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ میری انگوٹھی اس وقت کہاں ہے- کیونکہ انگوٹھی کے بغیر میں اپنے زمانے میں واپس نہیں جا سکتا-"

سمارا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی- کہنے لگی-

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری انگوٹھی اس وقت کس مقام پر ہے- لیکن تمہیں اس کے لئے ایک خاص وقت کا انتظار کرنا پڑے گا-"

میں نے کہا- "میرے لئے وقت کا انتظار بہت کٹھن ہے مجھے بار بار اپنے گھر کا اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا خیال آ رہا ہے جو میری جدائی میں پریشان ہوں گے انہیں کچھ معلوم نہیں کہ اتنی مدت گزر گئی ہے- ان کا بیٹا کہاں ہو گا کس حال میں ہو گا-"

سمارا مسکراتے ہوئے بولی-

"اس کی تم فکر نہ کرو- کیونکہ جس وقت تم اپنی دنیا سے، اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر ماضی کے زمانے میں پہنچے تھے تو اس وقت تمہارے لئے وقت رک گیا تھا- تم چاہے اس دنیا میں ایک سو برس گزار دو- جب تم واپس اپنی دنیا مین جاؤ گے تو وہاں صرف ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے- بلکہ جب تم اپنے گھر والوں سے ملو گے تو وہ حیران ہو کر تم سے پوچھیں گے کہ تم تو فلاں کام کے لئے گئے تھے اتنی جلدی کیسے واپس آگئے-"

مجھے یہ سن کر تسلی ضرور ہوئی لیکن یقین نہیں آتا تھا کہ اس دنیامین جہاں میں موجود تھا میرا ایک سو برس گزر جائے گا اور جس دنیا سے میں آیا تھا وہاں صرف دو منٹ ہی گزرے ہوں گے- لیکن میری انگوٹھی کا واپس ملنا بہت ضروری تھا- کیونکہ یہ میری واپسی کے لئے بہت ضروری تھا- میں نے سمارا سے کہا-

"مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میری انگوٹھی کس جگہ پر ہے۔ میں اپنے طور پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔"

سمارا نے کہا۔ "جب وقت آئے گا تو وہ اپنے آپ تمہیں مل جائے گی۔ تمہاری کوشش سے کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تمہاری تابوت والی سہیلی نے تو مجھے کہا تھا کہ تم میری مدد کرو گی۔ لیکن۔تم نے تو میرے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ نہ تم مجھے واپس میری دنیا میں پہنچا سکتی ہو نہ تم میری انگوٹھی مجھے واپس دلا سکی ہو۔"

سمارا مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بڑی دل آویز تھی۔ کہنے لگی۔ "میں تمہیں وہاں پہنچا رہی ہوں جہاں تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی تمہیں ضرورت ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم مجھے کہاں بھیج رہی ہو؟ میں ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک تاریخی دور سے دوسرے دور میں جاتے جاتے تنگ آ گیا ہوں۔"

وہ بولی۔ "فکر نہ کرو۔ جہاں میں تمہیں پہنچا رہی ہوں اس کے بعد تمہیں اپنے گھر واپس جانے کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

میں اس کے چہرے کی طرف تکنے لگا۔ خدا جانے یہ مجھے کہاں بھیجنے والی تھی۔ شاید اس نے میرے چہرے پر لکھا ہوا سوال پڑھ لیا تھا۔ کہنے لگی۔ میں تمہیں تاریخ کے ایک ایسے زمانے میں بھیج رہی ہوں جس کا شمار انسان تاریخ اور انسانی تہذیب کے سنہری زمانوں میں ہوتا ہے۔"

"وہ کونسا زمانہ تھا؟" میں نے پوچھا۔

سمارا نے کہا۔ "یہ تمہیں وہاں پہنچ کر خود بخود معلوم ہو جائے گا۔"

میں مایوس سا ہو کر خاموش ہو گیا۔ سمارا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"کبھی مایوس نہ ہونا۔ مایوسی گناہ ہے۔ اپنے خدا سے ہمیشہ رحم و کرم کی امید رکھو۔ خداوند کریم اپنے بندوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت اور

رحم دلی کا سلوک کرتا ہے۔ مصیبت کی گھڑیاں انسانی زندگی میں ضرور آ جاتی ہیں لیکن انسان کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ مصیبت کی گھڑیاں بھی ٹل جاتی ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ مجھے مکان کے اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ کمرے میں ایک مشعل روشن تھی۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ سامنے دیوار پر مخمل کا ایک پردہ گرا ہوا تھا۔ اس نے پردہ ہٹایا تو مجھے دیوار میں ایک گول دروازہ نظر آیا۔ دروازہ کھلا تھا اور دوسری طرف روشنی کا ایک غبار سا اڑ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "یہ سب کچھ کیا ہے" کیا یہ کوئی طلسمی کمرہ ہے؟"

وہ بولی۔ "تم یہ سمجھتے ہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔ دنیا میں ہر تبدیلی خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ جو تبدیلی انسان کی سمجھ میں نہ آئے وہ اسے جادو طلسم سمجھ لیتا ہے۔ تم جو کچھ دیکھ رہے ہو یہ بھی ایک حقیقت ہے۔"

اس نے ابھی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ چلاتی ہوئی دیوار کے شگاف تک لے آئی۔ کہنے لگی۔

"تم اس کے اندر جاؤ گے اور تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی تمہیں تلاش ہے اور جس کی تمہیں ضرورت ہے۔"

شگاف کے اندر روشنی اور سفید بادلوں کے غبار کو دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا کہ خدا جانے اس شگاف کے اندر کیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"شگاف کے اندر تو مجھے بادل نظر آ رہے ہیں۔ کیا تم مجھے بادلوں میں پھینک رہی ہو؟"

وہ کہنے لگی۔ "نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ویسے تم اس شگاف کے اندر چھلانگ ہی لگاؤ گے۔ لیکن تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔" اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔

"جاؤ شگاف کے اندر کود جاؤ۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔ یہی وہ مدد ہے جو میں تمہیں پہنچا سکتی تھی اور جس کی خاطر میری تابوت والی سہیلی

نے تمہیں میرے پاس بھیجا تھا۔"

اگرچہ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا مگر میں شگاف کی طرف بڑھتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس نے میرے دل کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ ایک بار پھر پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا پھر تم کیوں گھبرا رہے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ مجھے شگاف کے کنارے تک لے گئی۔ اب میں شگاف کے اندر روشنی میں چمکتے بادلوں ایسے غبار کو بڑے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بادل اوپر نیچے چکر لگا رہے تھے۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے کہا۔ "سمارا اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

اس نے کہا۔ "اچھا تو پھر ایسا کرو کہ آنکھیں بند کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ میں ایک طلسم پڑھوں گی۔ اس کے اثر سے تم شگاف میں چھلانگ لگائے بغیر جہاں میں تمہیں پہنچانا چاہتی ہوں پہنچ جاؤ گے۔" میرا خیال تھا کہ میں آنکھیں بند کر کے شگاف کے قریب کھڑا ہو جاؤں گا اور سمارا مجھ پر کوئی طلسم پھونک کر مجھے غائب کر کے کسی دوسرے زمانے میں پہنچا دے گی۔ چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں سمارا نے مجھے پیچھے سے دھکا دے دیا۔ میں شگاف میں گر پڑا اور سفید بادلوں میں لڑھکتا ہوا نیچے ہی نیچے گرتا چلا گیا۔ میرے کانوں میں عجیب شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے بہت سے پرندے مل کر شور مچا رہے ہوں پھر ان کی آوازیں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک میں تبدیل ہو گئیں۔ بادل قیامت خیز دھماکوں کے ساتھ گرج رہے تھے۔ بجلیاں کڑک رہی تھیں میری آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ تیز ہوا نے میری آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ میں بادلوں میں گرتا چلا جا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ رک گئی اور ایسی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں جیسے دور کوئی جل ترنگ بجا رہا ہو۔ یہ موسیقی کی بڑی روح پرور آواز تھی۔ ہوا کا زور اور شدت بھی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ میں بالکل سیدھا نیچے چلا جا رہا ہوں۔ سفید بادلوں کی جگہ اب میں سبز اور پیلے رنگ کی

دھنک میں سے گزر رہا ہوں۔ ایسا خوبصورت تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ رنگین قوس قزح آہستہ آہستہ مجھ سے جدا ہو گئی اور میں نے دیکھا کہ میرے اوپر آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں۔ میں نے نیچے دیکھا نیچے گہرا اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میری نیچے اترنے کی رفتار بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ میں ایسے نیچے اتر رہا تھا جس طرح آدمی پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اترتا ہے۔ اس کی رفتار پھر بھی تیز ہو جاتی ہے لیکن میں بہت آرام سے اور ہلکی رفتار کے ساتھ نیچے آ رہا تھا۔

اب مجھے نیچے کہیں کہیں روشنی جھلملاتی نظر آنے لگی تھی۔ شاید یہ کوئی شہر تھا میں ایک باغ میں اتر گیا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ موسم سرد تھا۔ باغ میں سرد دھند سی پھیلی ہوئی تھی لیکن مجھے سردی کا بہت کم احساس ہو رہا تھا۔ باغ میں اترنے کے بعد میں نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میں ایک پرانے ٹائپ کے مکان کے باغیچے میں ہوں۔ میں مکان کی طرف بڑھا۔ یہ ڈھلانی چھت والا قلعہ نما مکان تھا جس کی دوسری منزل پر ایک بالکونی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اس بالکونی پر جنگلی گلاب کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ بیل میں سے نظر آنے والے سفید گلاب کے پھول ستاروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ باغ میں ان پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس قلعہ نما دو منزلہ مکان کا دروازہ بند تھا۔ یہ دروازہ پرانی طرز کا تھا اور اس کے اوپر زیتون کے تیل کی ایک شمع روشن تھی جس کی دھیمی دھیمی روشنی اس سرد رات میں ماحول کو اور زیادہ رومانوی بنا رہی تھی۔

بند دروازے کے اندر سے پیانو بجانے کی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ کوئی پیانو پر بڑی آہستہ آہستہ اور رک رک کر انگلیاں چلا رہا تھا۔ دروازے پر پیتل کا ایک چھلا لٹک رہا تھا۔ میں نے اس چھلے کو دروازے کے ساتھ آہستہ سے بجا کر دستک دی۔ میرے دوسری بار دستک دینے پر اندر سے آتی پیانو کی آواز رک گئی۔ تھوڑی دیر بعد کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر ہلکی آواز کے ساتھ دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔

میرے سامنے ایک بوڑھا کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں لمبی موم بتی روشن تھی۔ اس کی داڑھی گھنی تھی اور منہ میں ایک طرف پائپ لگایا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف

غور سے دیکھ کر فرانسیسی زبان میں پوچھا۔

"کون ہو تم نوجوان؟"

اس کا لہجہ شائستہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میں فرانس کے کسی شہر یا قصبے میں اترا ہوں۔ جو خفیہ طاقت مجھے ماضی کے زمانے میں آنے کے ساتھ ہی مل گئی تھی اس کی وجہ سے جو زبان وہ بول رہا تھا وہ میرے ذہن میں روشن ہو گئی۔ میں نے فرانسیسی ہی میں جواب دیا۔ "جناب! میرا نام کرستوف ہے۔ میں اس جگہ اجنبی ہوں۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" بوڑھے نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا۔

"اندر آجاؤ میرے بچے!"

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کی آرائش سولہویں سترھویں صدی کے فرانس کے زمانے کی تھی۔ پرانا بھاری فرنیچر تھا۔ دیواروں پر پرانے زمانے کی ہاتھ سے بنائی ہوئی قدرتی مناظر کی روغنی تصویریں لگی تھیں۔ آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ کارنس پر رکھا ہوا زیتون کے تیل سے جلنے والا بڑا سا لیمپ روشن تھا۔ آتشدان کے قریب ہی دیوار کے ساتھ پیانو لگا تھا۔ پیانو کے سامنے ایک سنہری بالوں اور دلکش چہرے والی نازک اندام جوان لڑکی بیٹھی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اس کی نیلی آنکھوں میں ایک رحملانہ سی چمک تھی۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور کندھوں پر گہرے رنگ کی گرم شال پڑی تھی۔ بوڑھے نے موم بتی کی سلور سٹک کارنس پر لگا دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"یہ میری پوتی روما ہے۔"

پھر لڑکی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"روما بیٹی! اس نوجوان کا نام کرستوف ہے۔ یہ مسافر ہے سرد اندھیری رات میں شاید راستہ بھول گیا ہے۔ اسے کچھ پلاؤ۔"

"اچھا دادا جان!" یہ کہہ کر لڑکی پیانو کے آگے سے اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بوڑھے نے مجھے آتشدان کے قریب پڑے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بیٹھو میرے بچے!"

وہ خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ آتشدان میں لکڑی کا بڑا سا مڈھ آہستہ آہستہ جل رہا تھا۔ اس نے لکڑی کی باریک چھڑی کو آتشدان میں لے جا کر اسے آگ دکھائی اور جلتی ہوئی چھڑی سے اپنا بجھا ہوا پائپ دوبارہ سلگایا اور بولا۔ "تمہارا نام کرستوف فرانسیسی نام ہے۔ کیا تم فرانس کے رہنے والے ہو؟"

میرا خیال تھا کہ جس طرح میرے ساتھ پہلے ہوتا رہا ہے اس طرح یہاں بھی ہو گا۔ یعنی اس گھر میں بھی کوئی نہ کوئی پہلے سے میرا جاننے والا موجود ہو گا جو مجھے دیکھ کر مسکرا کر کہے گا۔ اندر آجاؤ۔ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ تمہیں سمارا نے بھیجا ہے نا؟" مگر یہاں معاملہ بالکل الٹ ہو گیا تھا۔ یہ لوگ میرے لئے اور میں ان کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی نئی کہانی گھڑنی پڑ رہی تھی۔ میں نے ایک کہانی فوراً ذہن میں تیار کر لی اور کہا۔

"موسیو! میں فرانس کے جنوبی صوبے کے شہر مارسلز میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی میں میرے غریب ماں باپ چل بسے۔ میں مارسلیز کی بندرگاہ پر محنت مزدوری کرنے لگا۔ وہاں سے ایک آدمی مجھے اپنے ساتھ جہاز میں بٹھا کر سائپرس لے گیا جہاں وہ اپنے گھر میں مجھ سے غلاموں کی طرح کام لینے لگا۔ جب میں جوان ہوا تو اس کے گھر سے بھاگ گیا اور بحری قزاقوں کے ایک جہاز میں شامل ہو گیا۔ دو تین سال تک میں ان کے ساتھ سمندروں میں ڈاکے ڈالتا رہا۔"

اس دوران نازک اندام حسینہ میرے لئے ہاتھ میں چاندی کا چھوٹا سا طشت لے کر آگئی تھی جس میں شیشے کے گلاس میں مشروب تھا۔ وہ میرے قریب کھڑی میری باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ بوڑھے نے کہا۔

"بیٹے پہلے یہ مشروب پی لو"

میں نے ایک گھونٹ لیا۔ بڑا شریں اور خوشبودار شربت تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی فرضی کہانی سنانی شروع کر دی۔ میں یونہی سمندری مہموں کے فرضی واقعات خوب نمک مرچ لگا کر انہیں سنا رہا تھا۔ بوڑھا اور اس کی پوتی بڑی دلچسپی اور حیرت سے میری کہانی سن رہے تھے۔ نازک اندام لڑکی کے لباس میں سے کسی بڑے

اعلیٰ پرفیوم کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ اپنے دادا کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور بڑے شوق سے میری کہانی سن رہی تھی۔ میں نے اپنی فرضی داستان ختم کی اور کہا۔

"پھر میرا دل سمندری ڈاکوؤں سے اکتا گیا اور میں انہیں چھوڑ کر اپنے آبائی وطن فرانس آ گیا۔ پچھلے دو دن سے اپنے ہی وطن میں اجنبیوں کی طرح پھر رہا ہوں۔ لڑکا سا تھا جب یہاں سے گیا ہوں۔ اب جوان ہو گیا ہوں اور اپنے وطن میں اجنبی ہوں۔"

بوڑھے نے کہا۔ "میرے بچے! تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ایک چھوٹا سا انگوروں اور سیب کا فارم ہے۔ تم میرے فارم پر کام کر سکتے ہو۔ جب تک چاہو یہاں کام کر سکتے ہو۔"

بوڑھے نے پائپ کے دو ایک کش لگانے کے بعد لڑکی سے کہا۔

بیٹی! کرستوف کا کونے والے کمرے میں بستر لگا دو۔"

لڑکی اندر کو چلی گئی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا۔

"کرستوف! تم نے کھانا کھا لیا تھا؟ اگر چاہو تو تمہیں کھانے کو بنی ہوئی بطخ اور روٹی اِس وقت مل سکتی ہے۔ ہماری نوکرانی نے آج یہی کچھ پکایا تھا۔

مجھے بھوک پیاس تو لگتی نہیں تھی۔ پیاس کا بھی میں نے اس مکان میں داخل ہونے اور رات گزارنے کے واسطے بہانہ کیا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں موسیو! اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک دکان پر سے تھوڑا بہت کھا لیا تھا۔"

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ کیا یہاں میری ایک نئی زندگی شروع ہونے والی ہے یا یہاں مجھے کوئی ایسی پراسرار ہستی ملنے والی ہے جو مجھے میری دنیا میں واپس لے جائے گی اور مجھے میری وہ انگوٹھی بھی واپس دلا دے گی جس کے بغیر میں اپنی دنیا میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ سارا نے مجھے جس طلسمی شگاف میں دھکا دیا تھا اس نے مجھے ماضی کے زمانے سے کئی سو برس پیچھے یعنی تاریخ کی سولہویں سترھویں

صدی میں پہنچا دیا تھا۔ میرا اپنا زمانہ مجھ سے دو پونے تین سو سال ہی کے فاصلے پر تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ اسی گھر میں میرے واپس اپنی دنیا میں جانے کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پیدا ہو جائے گا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی میں تو میں سارا کے طلسمی شگاف میں گرنے کے بعد یہاں نہ اترتا کسی دوسرے ملک میں یا صحرا میں اترتا۔

یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس نرم دل بوڑھے کے فارم پر ہی اس وقت تک کام کرتا رہوں گا جب تک کے میری واپسی کا یہاں غیب سے کوئی سبب پیدا نہیں ہو جاتا۔ نازک اندام لڑکی روما واپس آ گئی۔ اس نے کہا۔

"چلیئے موسیو کرستوف! میں آپ کو آپ کا بیڈ روم دکھا دوں۔"

روما مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آئی۔ جس کی لمبی محراب دار کھڑکی بند تھی۔ دیوار کے ساتھ پرانے زمانے کا پیتل کے فریم والا پلنگ لگا ہوا تھا جس پر سفید سرہانے اور ایک لحاف تہہ کیا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پاس چھوٹی گول میز پر شمع دان روشن تھا۔ بستر پر میرے لئے شب خوابی کا اس زمانے کا لباس یعنی دھاریدار پاجامہ کرتہ اور لمبا گاؤن رکھا ہوا تھا۔ پلنگ کے پاس ہی سلیپر پڑے تھے۔ روما نے کہا۔

"موسیو باتھ روم بیڈ روم کے ساتھ ہی ہے۔ صبح کے وقت خادمہ گرم پانی رکھ جائے گی"

میں نے فرانسیسی زبان میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔ میں نے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ اور شب خوابی کا لباس پہن کر کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا اور باہر دیکھنے لگا۔ مجھے سردی گرمی تو لگتی نہیں تھی۔ سردی گرمی کا معمولی سا احساس ضرور ہوتا تھا۔ باہر باغیچے میں سے سرد رات کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میرے چہرے کو چھو کر گزر گیا۔ شبنمی فضا میں جنگلی گلاب کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک رچی ہوئی تھی۔ مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ لیکن میں نے کھڑکی بند کر دی اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اس قسم کے بستر میں نے ان انگریزی فلموں میں دیکھے تھے جن میں سولہویں صدی کے یورپ کا زمانہ دکھایا گیا تھا۔ اس زمانے میں تیر کمان اور تلواریں بھی جنگ میں استعمال ہوتی تھیں مگر توڑے دار بندوقیں اور توپیں بھی ایجاد ہو چکی تھیں۔ نہ ہوائی جہاز تھے۔ نہ ریل گاڑی تھی نہ سکوٹر موٹر گاڑیاں اور نہ ریڈیو ٹیلی ویژن تھا۔ یہ

سب چیزیں آگے چل کر ایجاد ہوئی تھیں- بڑا پرسکون اور فضائی آلودگی سے پاک زمانہ تھا- فضا بے حد صاف اور شفاف تھی- ہر سانس کے ساتھ ایسا محسوس ہوتا تھا- جیسے ہوا شبنم کے قطروں میں سے گزر کر آ رہی ہو- پٹرول، ڈیزل اور گیس کے دھوئیں کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا- نہ بجلی تھی، نہ کمپیوٹرز تھے- ابھی تک ایسی چیزیں سائنس نے ایجاد نہیں کی تھیں جس نے آگے چل کر کرہ ارض پر انسانی زندگی کو فائدہ کم اور ناقابل تلافی نقصان زیادہ پہنچانا تھا-

اگرچہ مجھے نیند کی حاجت نہیں تھی لیکن رات کو سو جایا کرتا تھا- اس رات بھی میں سو گیا- شمع دان کو میں نے سونے سے پہلے بجھا دیا تھا- صبح خادمہ باتھ روم میں گرم پانی کی بالٹی رکھ رہی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی- کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور دن کی روشنی اندر آ رہی تھی- باہر باغیچے میں سے چڑیوں کی چہکار کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی- یہ منظر مجھے بڑا خوشگوار لگا- میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی- آسمان روشن تھا- سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی- میں نے گرم پانی سے نہا کر لباس تبدیل کیا تو خادمہ نے آ کر کہا-

"موسیو! ناشتہ تیار ہے-"

میں بیڈ روم سے نکل کر آتشدان والے بڑے کمرے میں آ گیا- وہاں بڑی میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا- نازک اندام روما گلابی لباس میں ملبوس اپنے دادا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی- میں نے صبح بخیر کہا تو بوڑھا موسیو بولا-

"کرستوف! رات سردی تو نہیں لگی؟ اس دفعہ فرانس میں زیادہ سردی پڑ رہی ہے-"

میں نے کہا- "بالکل نہیں موسیو! میں بڑے سکون سے سویا"

ہم ناشتہ کرنے لگے- روما میرے لئے کافی بنانے لگی تو اس نے اپنی شیریں آواز میں پوچھا-

"چینی کتنی موسیو؟"

میں نے کہا- "صرف ایک چمچ"

اس نے کافی بنا کر مجھے دی- بوڑھا تیتر کے شکار کی باتیں کرنے لگا- مجھے شکار

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن میں پوری دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا- ناشتہ کر کے وہ اٹھا اور پیانو پر جا کر بیٹھ گیا- کمرے میں پیانو کے دل آویز سروں کی آواز نے ماحول کو رومانٹک بنا دیا- روما میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی کافی پی رہی تھی- سامنے دیوار والی اونچی کھڑکی میں سے سنہری دھوپ اندر آ رہی تھی- روما کہنے لگی-

"آج بڑی دیر کے بعد موسم خوشگوار ہوا ہے-"

بوڑھے نے اس کا جملہ سن کر پیانو بجانا بند کر دیا اور بولا-

"بیٹی! آج تم دونوں کو بلیک برن میں پکنک منانے جانا چاہئے-"

روما نے میری طرف دیکھا اور پوچھا-

"کیوں موسیو کرستوف! تم میرے ساتھ پکنک پر چلو گے؟ بلیک برن بڑی پر فضا جگہ ہے میری ایک جھیل بھی ہے- دھوپ میں بڑا لطف رہے گا-"

مجھے اور کوئی کام تو تھا نہیں- میں نے سوچا کہ چلو پکنک ہی مناتے ہیں- میں نے حامی بھر لی- روما بڑی خوش ہوئی اور اس نے اسی وقت تیاری شروع کر دی- ایک ٹوکری میں دوپہر کے کھانے کا سامان رکھا اور مجھے ساتھ لے کر مکان کے عقبی باغیچے میں آ گئی- یہاں اصطبل میں ایک چھوٹی سی بگھی کھڑی تھی- ایک طرف گھوڑا بندھا ہوا گھاس کھا رہا تھا- روما بولی-

"میری مدد کرو- ہم بگھی کو باہر نکالیں گے-"

ہم بگھی کو اصطبل میں سے نکال کر باہر لے آئے- پھر گھوڑے کو اس کے آگے جوت دیا- کھانے پینے کی ٹوکری بگھی میں رکھی اور ہم اس پر سوار ہو کر پکنک منانے چل دیئے- یہ نیم پہاڑی بڑا ہی سرسبز علاقہ تھا اور پیرس سے تیس چالیس میل جنوب کی طرف تھا- ہماری بگھی اونچے اونچے درختوں کے نیچے کچے راستے پر جا رہی تھی- میں اور روما دونوں بگھی کی نشستوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے- یہ دو نشستوں والی بگھی تھی- گھوڑے کی باگیں روما کے ہاتھ میں تھیں- گھوڑا بڑی نپی تلی پر سکون رفتار سے جا رہا تھا- ہم ایک پر فضا وادی میں سے گزر رہے تھے- اور ایک پرانے قلعے کے آثار نظر آ رہے تھے- ہماری بگھی ایک ٹیلے کے قریب سے گزر کر دوسری طرف آئی

تو وہاں کا منظر بڑا خوبصورت تھا۔ ایک جگہ گھاس کا چھوٹا سا میدان تھا۔ ایک چشمہ پتھروں میں بہہ رہا تھا۔ اوپر درخت جھکے ہوئے تھے۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ ہم چشمے کے کنارے چھوٹا سا قالین بچھا کر بیٹھ گئے۔ اور باتیں کرنے لگے۔ چشمے کے پانی کے بہنے کی مترنم آواز آ رہی تھی۔ کسی کسی وقت درخت پر کسی پرندے کے بولنے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ روما نے مجھ سے پوچھا۔

"موسیو! کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔"

"کیوں؟" اس نے معصوم سا چہرہ بنا کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ "نہ مجھے زندگی کی دربدری سے اتنی فرصت ملی ہے کہ شادی کا سوچوں اور نہ کوئی لڑکی ہی مجھے ملی ہے۔"

روما خاموش ہو گئی۔ میں نے اسی سے سوال کر دیا۔

"کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟ یہ تمہاری شادی کی عمر ہے"

اس نے کہا۔ "مجھے اپنے دادا کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے شادی ہوئی تو خدا جانے مجھے کہاں جانا پڑ جائے۔ میں نے شادی کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔"

ہم چائے کی کیتلی اور بسکٹ وغیرہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ روما نے پیالیوں میں چائے ڈالی اور ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں مجھے دو گھوڑ سوار نظر آئے جو ٹیلے کی جانب سے ہماری طرف بڑھے آ رہے تھے۔ میں نے روما سے کہا۔

"یہ لوگ ہماری طرف کیوں آ رہے ہیں؟ کیا ہم یہاں خلاف قانون تو نہیں بیٹھے؟"

روما بھی گھوڑ سواروں کو دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔

"نہیں۔ یہاں سب کو پکنک منانے کی اجازت ہے۔ میرا خیال ہے یہ مسافر ہیں۔ شاید رات بھول گئے ہیں۔ ہم سے راستہ پوچھنے آ رہے ہیں۔"

اس دوران دونوں گھوڑ سوار ہمارے قریب آ گئے تھے۔ ان دونوں نے تلواریں لگا رکھی تھیں اور ان کے کندھوں سے تیر کمان بھی لٹک رہے تھے۔ اس زمانے کے مطابق وہ پوری طرح مسلح تھے۔ وہ گھوڑے سے اتر آئے۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ مجھے ان کے تیور اچھے نہ لگے۔ وہ گھوڑوں پر سے اتر کر ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے چہروں پر بڑی مکارانہ مسکراہٹ تھی۔ ان میں سے ایک گھوڑ سوار نے فرانسیسی زبان میں پوچھا۔

"تم دونوں کے پاس جتنے سونے چاندی کے سکے ہیں۔ خاموشی سے ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہاری بگھی کے ساتھ جتا ہوا گھوڑا بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔"

جو گھوڑ سوار ہم سے مخاطب تھا اس نے تلوار نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ دوسرے نے کمان کندھے سے اتار کر اس پر تیر چڑھا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو ہیں۔ روما کی بری حالت تھی۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ روما بے چاری کا رنگ زرد ہو گیا اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"موسیو! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم اپنی نقدی مکان پر ہی چھوڑ آئے تھے۔"

گھوڑ سواروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ پھر ایک بولا۔

"تو ٹھیک ہے تمہارے پاس اگر ہمیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے تو ہم اس حسین دوشیزہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

روما سہم کر میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم شریف لوگ ہیں۔ ہم کسی کو تنگ کرنا نہیں کرنا چاہتے۔ آپ بھی ہمیں تنگ نہ کریں۔"

میرے اتنا کہنے پر دونوں ایک قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ایک گھوڑ سوار بدمعاش نے اپنی تلوار کی نوک میری گردن سے لگا دی اور غصیلی آواز میں کہا۔

"تمہاری یہ مجال کہ ہمیں حکم دو؟"

پھراس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"اس حسینہ کو اٹھا کر گھوڑے پر ڈال دو۔"

دوسرے گھوڑ سوار بدمعاش نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ لگی روما کو دبوچ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے گھوڑے کی طرف لے جانے لگا۔ روما نے چیخ کر مجھے کہا۔

"موسیو! مجھے ان سے بچالو۔"

اس کے بعد میرے لئے صبر کرنا مشکل تھا۔ میں نے ہاتھ سے تلوار کو جھٹکا اور دوڑ کر اس بدمعاش کو پکڑ لیا جو روما کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ جس بدمعاش کے ہاتھ میں تلوار تھی اس نے پیچھے سے آ کر تلوار کا ایک بھرپور وار میرے کندھے پر کیا۔ یہ وار اس قدر شدید تھا کہ اگر میرے اندر قدرت کی عطا کی ہوئی غیبی طاقت نہ ہوتی تو میرا کندھا بازو سمیت الگ ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی تلوار بازی کی بالکل پروا نہ کی اور دوسرے بدمعاش کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ روما کو گھوڑے پر ڈال کر نہ لے جائے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر طاقت بھی پہلے سے زیادہ آگئی ہوئی تھی۔ اس بدمعاش نے روما کو تو چھوڑ دیا اور مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس دوران دوسرا بدمعاش عقب سے مجھ پر تلوار کے بھرپور وار کرتا رہا۔ وہ ضرور حیران ہو رہا تھا کہ تلوار کے اتنے شدید وار کرنے کے باوجود میرے جسم پر تلوار کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے اس بدمعاش کی کنپٹی پر مکا مارا جو مجھ سے گتھم گتھا تھا۔ وہ میرے مکے کی ضرب لگتے ہی گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ روما ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی یہ ساری لڑائی دیکھ رہی تھی۔ اپنے ساتھی کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر دوسرے بدمعاش نے میری گردن پر بالکل سامنے آ کر زور سے تلوار کا ہاتھ مارا۔ میری جگہ اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس کی گردن کٹ جاتی اور سر نیچے گر پڑتا۔ لیکن میرے ساتھ ایسا بالکل نہ ہوا۔ بلکہ تلوار میری گردن سے ٹکرا کر چٹ گئی جیسے میری گردن پتھر کی ہو۔ یہ منظر دیکھ کر اس بدمعاش کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لیکن اس نے ہار نہ مانی اور تلوار پھینک کر اپنے ساتھی کا گرا ہوا تیر کمان اٹھا کر کمان کے ساتھ تیر جوڑا اور زن کی آواز کے ساتھ میرے سینے پر پہلے ایک تیر چلایا۔ پھر دوسرا'

پھر تیسرا اور پھر چوتھا تیر چلا دیا۔ چاروں کے چاروں تیر میرے جسم سے ٹکرانے کے بعد دہرے ہو کر نیچے گر پڑے۔

تب میں نے اس بدمعاش سے کہا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ مجھے تنگ نہ کرو۔ مگر تم نہیں مانے۔ اب اپنے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے زمین پر پڑی اس کی تلوار اٹھائی اور اس پر وار کرنے ہی والا تھا کہ وہ ایک دم بھاگ اٹھا۔ اتنی تیزی سے وہ ڈر کر بھاگا تھا کہ دیکھتے دیکھتے وہ دور درختوں کی طرف غائب ہو گیا۔ میں نے تلوار پھینک دی اور دوسرے گھوڑ سوار کو دیکھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ روما دوڑ کر میرے ساتھ آ کر لگ گئی۔ وہ خوف سے ابھی تک کپکپا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"موسیو! اسے کچھ نہ کہنا۔ چلو۔ ہم واپس چلتے ہیں۔"

اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے تیز تیز چلاتی بگھی کے پاس آگئی میں نے جلدی سے کھانے کی چیزوں والی ٹوکری میں پیالیاں وغیرہ ڈالیں اور ٹوکری بگھی پر رکھ دی۔ ہم خود بھی بگھی پر بیٹھ گئے روما نے باگیں تھامتے ہی ایک جھٹکا دیا اور گھوڑا تیزی سے دوڑنے لگا۔ روما نے وادی کے کچے راستے پر آتے ہی بگھی کی رفتار اور تیز کر دی۔ ہم نے سارا راستہ آپس میں کوئی بات نہیں کی میں جانتا تھا کہ روما نے دیکھ لیا ہے کہ مجھ پر تلوار کے بھرپور واروں اور میرے سینے پر چلائے گئے تیروں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ دل میں ضرور حیران ہو رہی ہو گی اور سوچ رہی ہو گی کہ میرے اندر اتنی غیر انسانی طاقت کیسے آگئی ہے اور میں کون ہوں۔ کیونکہ جس طرح مجھ پر تلواروں کے وار پڑے تھے اور مجھ پر تیر برسائے گئے تھے ان کی زد سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو نہ صرف بالکل سامنے سے چلائے گئے تیروں سے اس کا سینہ چھلنی ہو جاتا بلکہ تلوار کے وار سے اس کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا ہوتا۔

لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔

پرانے مکان پر آ کر روما نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ بوڑھا دادا آتش دان کے پاس بیٹھا کوئی پرانی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور

روما کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"بیٹی! کیا بات ہے۔ تم بڑی گھبرائی ہوئی ہو۔"

اتنی دیر میں میں بھی وہاں آ گیا تھا۔ بوڑھے نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کرستوف! کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟"

میں نے گلاس میں شربت ڈال کر روما کو پینے کو دیا۔ اور بوڑھے دادا کو سارا واقعہ سنا دیا۔ مگر میں نے یہ نہ بتایا کہ گھوڑ سواروں نے مجھے قتل کرنے کے لئے تلواروں کے زبردست وار کئے تھے اور تیروں کی بوچھاڑ کی تھی اور مجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔ بوڑھے دادا نے روما کو اپنے ساتھ لگا لیا اور سینے پر صلیب کا نشان بنا کر بولا۔

"خداوند کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اور میری بچی کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔"

روما نے شربت کے دو گھونٹ پینے کے بعد گلاس تپائی پر رکھ دیا اور بوڑھے دادا سے کہا۔

"دادا جان! اگر کرستوف میرے ساتھ نہ ہوتا تو اس وقت میں یہاں آپ کے پاس نہ بیٹھی ہوتی خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا۔"

بوڑھے دادا نے میری طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

"کرستوف بیٹے! میں تمہارا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔ خداوند نے تمہاری شکل میں فرشتہ رحمت ہمارے پاس بھیجا ہے۔"

روما نے بھی اپنے دادا سے میری پوشیدہ طاقت کے بارے میں کوئی بات نہ کی اور مجھ سے بھی اس بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ دن گزر گیا۔ رات کو ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا۔ کافی پی اور پھر میں اپنے بیڈ روم میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ روما کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے اسے ڈاکوؤں سے بچا لیا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ روما مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ اور شاید مجھے اس سے پیار بھی ہو گیا ہے۔ پیار اور محبت کا یہ جذبہ اپنے آپ میرے دل میں بیدار ہو گیا تھا۔ شاید قدرت کی طرف سے یہ حادثہ اسی لئے وقوع پذیر ہوا تھا کہ میرے دل میں

روما کی محبت پیدا ہو۔ مجھے بار بار روما کا وہ معصوم سہما ہوا چہرہ یاد آ رہا تھا جب وہ ڈاکوؤں سے ڈر کر میرے ساتھ لگ گئی تھی۔

میرا جی بے اختیار چاہنے لگا کہ روما اسی وقت میرے پاس ہو اور ہم دونوں پیار محبت کی باتیں کر رہے ہوں۔ لیکن روما تو کھانا ختم کرنے کے بعد اپنے دادا کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے شب بخیر کہہ کر مجھے عجیب نظروں سے ضرور دیکھا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ کیونکہ وہ یقینی طور پر مجھے کوئی پراسرار طاقت والا مافوق الفطرت انسان سمجھنے لگی تھی۔ ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب بھی تھی۔ مجھ سے مافوق الفطرت انسانوں والی ہی حرکتیں سرزد ہوئی تھیں۔ ورنہ ایسا کون انسان ہو گا کہ جس کی گردن پر دشمن تیز دھار والی تلوار کا بھرپور وار کرے اور اس کی گردن کٹنے سے صاف بچ جائے۔

میں کھڑکی کے پاس آ کر باہر دیکھنے لگا۔

آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ باغیچے میں شبنمی چاندنی بکھری ہوئی تھی بڑا روح پرور منظر تھا۔ کھڑکی میں سے سرد ہوا آ رہی تھی۔ اگرچہ مجھے سردی تو نہیں لگتی تھی لیکن میں نے کھڑکی بند کر دی اور بستر پر بیٹھ گیا اور روما کے بارے میں ہی شریں خیالوں میں گم ہو گیا۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے آہستہ سے دوبارہ دستک دی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میز پر شمع دان روشن تھا۔ میں نے اسے نہیں بجھایا تھا۔ دوسری بار دستک ہوئی تو میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

دوسری طرف سے روما کی دھیمی آواز آئی۔

"میں ہوں موسیو۔ روما"

میرے دل کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ اس وقت میں روما کے خیالوں میں گم تھا اور روما میرے پاس آ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ روما شب خوابی کے ریشمی لباس میں تھی۔ اس کے سنہری بال کندھوں پر گرے ہوئے تھے۔ نیلی آنکھوں میں ایک عجیب سا تجسس تھا۔ اس تجسس کی نوعیت سے میں بخوبی واقف تھا۔ وہ اندر آ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ میرے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس

کے قریب بیٹھ گیا- وہ بے حد حسین لگ رہی تھی- وہ مجھے مسلسل دیکھ رہی تھی- اس
نے شریں آواز میں وہ سوال پوچھا جس کا میں منتظر تھا- کہنے لگی-

"موسیو! تم کون ہو؟ یہ بات میری آنکھوں کے سامنے ثابت ہو چکی
ہے کہ تم کوئی عام انسان نہیں ہو-"

میں نے کہا- "یہ تمہارا وہم ہے روما- میں عام انسان ہی ہوں- بالکل
تمہاری طرح کا ایک عام انسان-"

روما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا-

"نہیں موسیو- میں نہیں مان سکتی- جو کچھ میں نے دیکھا ہے اسے
دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ تم ایک عام انسان ہو- تم ضرور
یا تو کوئی جن ہو یا تمہارے پاس کوئی زبردست طلسم ہے جس کی وجہ
سے تمہارے جسم پر نہ تلوار کا اثر ہوا نہ تیروں کا اثر ہوا-"

میں نے روما کو اپنے بارے میں اصلیت بتانا مناسب نہ سمجھا اور ایک بار پھر
زور دے کر کہا-

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے روما- میری قسمت ایسی تھی کہ دشمن کے
حملوں سے بچا رہا- ورنہ میں بھی عام آدمیوں کی طرح قتل ہو گیا
ہوتا-"

روما نے بڑی پرسکون آواز میں کہا-

"نہیں کرستوف! اس میں کوئی راز ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو-
میرے سامنے تم پر اتنے ہی وار ہوئے تھے جتنے ایک عام آدمی کو چار
بار قتل کر سکتے تھے- لیکن تم پر کسی ایک وار کا بھی اثر نہیں ہوا-"

روما سے مجھے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ
دینا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اپنے اس غیبی طاقت والے راز کو میں افشا
نہیں کرنا چاہتا تھا- میرا دل اسے افشا کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہو رہا تھا- میں نے
اسے کہا-

"یہ تمہارا خیال ہے روما- ایسی بات نہیں ہے- لیکن یہ بتاؤ کہ کیا تم

مجھ سے صرف یہی پوچھنے رات کے وقت آئی ہو؟"

روما کے لباس سے خاص قسم کی گہری اور خواب انگیز ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی
تھی- وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی- پھر اس نے اپنی نیلی آنکھیں اٹھا کر میری
طرف دیکھا اور بولی-

"میں تم سے کوئی اور بات کرنے آئی ہوں- تمہاری مافوق الفطرت
طاقت کا ذکر میں نے اس لئے کیا تھا کہ اسی طاقت کا خیال مجھے
تمہارے پاس اپنے دل کی بات کہنے کے لئے لے آیا ہے-"

میں سوچنے لگا کہ کہیں روما بھی تو مجھ سے محبت نہیں کرنے لگی- ہو سکتا ہے وہ
مجھ سے اظہار محبت کرنے کے لئے آئی ہو- لیکن ایسا لگتا نہیں تھا- پھر بھی میں دل میں
بڑا خوش ہوا- میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا-

"اپنے دل کی بات مجھے ضرور بتاؤ- اگر وہ تمہاری زندگی کا کوئی راز
ہے تو یقین کرو کہ میرے دل میں تمہارا راز ہمیشہ کے لئے دفن ہو
جائے گا-"

روما نے سانس لیا اور بولی-

"کرستوف! تم سے میں یہ بات اس لئے کرنے آئی ہوں کہ تمہارے
پاس کوئی غیر انسانی طاقت ہے جس کی میں گواہ ہوں- تم مانو چاہے نہ
مانو- اور کوئی غیر انسانی طاقت والا انسان ہی میری مدد کر سکتا ہے-"

محبت کی بات نہیں تھی- روما مجھ سے اپنی زندگی کا کوئی راز یا اپنی زندگی کا
کوئی سنگین مسئلہ بیان کرنے آئی تھی- اس کے باوجود مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس
نے مجھے اس لائق سمجھا میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں روما کی ضرور مدد
کروں گا-

میں نے پوچھا-

"مجھے بتاؤ روما! مسئلہ کیا ہے؟"

ایک لمحے کے لئے وہ خاموش ہو گئی- اس کے بعد دھیمی آواز میں بولی-

"میں ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہوں- مجھ پر ایک بدروح کا سایہ ہے- یہ

بدروح چاند کی تیرھویں تاریخ کو ہر ماہ انسانی شکل میں میرے پاس آتی ہے اور مجھے اٹھا کر ایک پرانے آسیبی قلعے میں لے جاتی ہے۔ میرے کمرے میں آنے سے پہلے وہ میرے دادا جان اور ہماری خادمہ پر کوئی ایسا طلسم پھونک جاتی ہے کہ ان کی نیند بے ہوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور صبح سورج نکلنے کے بعد وہ جاگتے ہیں۔ اگر میں اس رات بدروح سے چھپ کر کسی دوسری جگہ چلی جاؤں تو میری بو پا کر بدروح وہاں سے کھینچ کر مجھے اٹھا لے جاتی ہے۔"

میں نے بڑے غور سے روما کی پراسرار داستان سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"پرانے قلعے میں وہ تمہیں کس لئے لے جاتی ہے؟"

روما کہنے لگی۔ "وہی میں تمہیں بتانے والی ہوں۔ وہ قلعے کے ایک تہہ خانے میں لے جا کر مجھے ایک پلنگ پر لٹا دیتی ہے۔ وہاں ایک سیاہ پوش عورت پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ وہ عورت میرے سارے کپڑے اتار دیتی ہے اور میرے جسم پر ایک شیشی میں سے کوئی عطر نکال کر میرے سارے جسم پر اس کی مالش کرتی ہے۔ وہ عطر مجھ پر ایک نشہ سا طاری کر دیتا ہے اور مجھے اپنے تن بدن کی ہوش نہیں رہتی۔ وہ بدروح ایک تخت پر بیٹھ جاتی ہے اور مجھے رقص کرنے کا حکم دیتی ہے میں اس کے حکم پر رقص کرنا شروع کر دیتی ہوں۔ مجھے خود ہوش نہیں رہتا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ رقص کرتے کرتے جب میں تھک جاتی ہوں تو وہ بدروح اٹھ کر مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتی ہے اور مجھے بستر پر لٹا کر میرے سینے پر اپنا منہ لگا دیتی ہے اور ایسے گھونٹ بھرنے لگتی ہے جیسے میرا خون پی رہی ہو۔ اس وقت مجھے بھی ایک عجیب طرح کی لذت محسوس ہوتی ہے اور خواہش کے باوجود میں اس کا منہ اپنے سینے سے نہیں ہٹاتی۔ یہ دیکھو۔ اس بدروح کے دانتوں کا نشان میرے سینے پر موجود ہے۔"

روما نے اپنا شب خوابی کا ریشمی لباس سینے پر ذرا سا ہٹا کر مجھے دکھایا۔ وہاں جلد درمیان میں سرخ ہو رہی تھی۔ روما نے سینے پر کپڑا کر لیا اور اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"ایک سال سے یہ بدروح میرے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہے۔ جسکی وجہ سے میں اپنے اندر ایک کمزوری اور ناتوانی محسوس کرنے لگی

ہوں۔ میرے آدھے سر میں بھی درد رہنے لگا ہے۔ کل چاند کی تیرھویں تاریخ ہے۔ یہ بدروح آدھی رات کے بعد مجھے اٹھانے ضرور آئے گی۔ تمہارے پاس کوئی آسمانی طاقت ہے۔ کرستوف! پلیز! میری مدد کرو۔ مجھے اس بدروح کے عذاب سے نجات دلا دو۔"

روما کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اس کے آنسو دیکھ کر میرے اندر ایک طوفان سا مچ گیا۔ میں نے بے اختیار ہو کر بغیر کچھ سوچے سمجھے روما کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔

"روما! میں تمہیں اس بدروح سے ضرور نجات دلاؤں گا خواہ اس میں میری اپنی جان کیوں نہ چلی جائے۔"

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اللہ کے فضل و کرم سے میری جان کو بڑی سے بڑی روح بھی کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ روما نے میرے ہونٹوں پر اپنی نازک انگلیاں رکھ دیں۔ اس کی انگلیوں سے گہرے پرفیوم کی خوشبو آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کچھ ہو۔ اگر ایسی بات کا خطرہ ہے تو میں تمہیں مدد کے لئے کبھی نہیں کہوں گی۔"

میں نے اس کی انگلیوں کو چوم کر کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے روما! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ فکر نہ کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ خدا میری حفاظت کر رہا ہے۔ کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ وہ پرانا قلعہ کس جگہ پر ہے جہاں یہ بدروح تمہیں لے جاتی ہے؟"

روما بولی۔ "ہاں! میں نے دن کے وقت بھی وہ قلعہ دیکھا ہے مگر میں اس کے اندر نہیں جا سکتی۔ کیونکہ قلعے کا پرانا دروازہ بند ہوتا ہے اور اس دروازے کے کواڑ زمین میں دھنس چکے ہیں یہ چار سو سال پرانا قلعہ ہے۔ اس کے اندر جانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔"

"پھر یہ بدروح تمہیں کس طرح قلعے کے اندر لے جاتی ہے؟"

میں نے پوچھا۔ روما نے کہا۔

"جب یہ بد روح مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھائے فضا میں پرواز کرتے ہوئے قلعے کے پاس آتی ہے تو اس کی دیوار ایک جگہ سے شق ہو جاتی ہے اور بد روح مجھے لے کر قلعے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کے قلعے میں داخل ہونے کے فوراً بعد دیوار کا شگاف اپنے آپ بند ہو جاتا ہے۔"

میں نے روما سے پوچھا۔

"مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ قلعہ واقع ہے۔" اس نے کہا۔ "میں صبح تمہیں خود وہاں لے جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ تمہیں میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دن کے وقت وہاں اکیلا ہی جاؤں گا۔"

روما نے مجھے اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ یہ صدیوں پرانا منحوس قلعہ کس جگہ پر واقع تھا۔ میں نے روما سے کہا۔

"اب تم جا کر آرام سے سو جاؤ۔ کل میں خود اس قلعے میں جا کر معلوم کروں گا کہ اس بد روح سے کس طرح چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔"

روما بولی۔ "قلعے سے تمہیں کیسے معلوم ہو گا کہ بد روح سے میری جان کس طرح بچائی جا سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اور اب تم جا کر سو جاؤ۔"

نازک اندام خوبصورت روما چونکہ میری غیر انسانی بلکہ ماورائے انسانی طاقت کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی اس لئے آگے سے اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے آگے بڑھ کر بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا۔ روما میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے گلابی پھول کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں کو چوم لیا۔ مجھے بے پناہ روحانی خوشی کا احساس ہوا۔ روما آہستہ سے مجھ سے الگ ہوئی اور بیڈ روم سے نکل گئی۔

میں دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ روما نے جو پر اسرار آسیبی داستان مجھے سنائی تھی اس کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں جیسے کوئی دہرا رہا تھا۔ ابھی

تک مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں اس مہم میں روما کی کیسے اور کیا مدد کر سکوں گا۔ لیکن اس کی محبت نے میرے اندر اتنی توانائی اور اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ میں اس کی خاطر بڑی سے بڑی چٹان کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر پھینک سکتا تھا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ صبح خادمہ نے آ کر جگایا۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا اور لباس بدل کر نیچے ناشتے کی میز پر آ گیا۔ وہاں روما اور دادا جان پہلے سے موجود تھے۔ آتشدان میں آگ روشن تھی۔ کمرہ نیم گرم تھا۔ فضا میں روما کے پرفیوم کی دھیمی دھیمی مہک رچی ہوئی تھی۔ روما نے نیلا لباس پہن رکھا تھا۔ اور اس کے نازک کندھوں پر گہرے رنگ کی شال پڑی تھی۔ سنہری بالوں میں اس نے گلاب کا سفید پھول سجایا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ رات کو میرے اظہار محبت نے اس کے چہرے کو اور زیادہ حسین اور خوش نما بنا دیا تھا۔ میں صبح بخیر کہہ کر ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔ روما مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مجھے اپنی جانب سے محبت کا پیام دے رہی تھیں۔ اس محبت نے میری روح کو ایک حیرت انگیز سرمدی توانائی سے سرشار کر دیا تھا۔ اس قسم کی برتر اور اعلیٰ ترین مدارج کی محبت کا احساس مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں مادی زمین سے بلند ہو گیا ہوں اور ستاروں کے درمیان پرواز کر رہا ہوں۔ مجھے پہلی بار غیر فانی محبت نے اپنی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی تھی۔ شاید مجھے اسی محبت کی تلاش تھی جو مجھے تاریخ اور وقت کے صحراؤں میں لئے لئے پھر رہی تھی۔

میں روما کے لئے سب کچھ کر سکتا تھا۔

بوڑھا دادا پائپ پیتے ہوئے موسم اور اپنے باغیچے کے جنگلی گلابوں کی باتیں کرنے لگا۔ میں اس کی باتوں پر ہوں ہاں کرتا رہا۔ میں بھی بار بار روما کو دیکھ کر مسکرا دیتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے پر اپنے دل کے دروازے کھول دیئے تھے اور ہماری محبت ایک دوسرے پر عیاں ہو گئی تھی۔ ناشتے کے بعد بوڑھا دادا آتش دان کے پاس پائپ منہ میں دبائے کتاب لے کر پرانے صوفے پر بیٹھ گیا۔ خادمہ ناشتے کی میز پر سے برتن اٹھانے لگی۔ روما خادمہ کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ میں نے روما کو ایک طرف بلا کر کہا۔

"میں پرانے قلعے کی طرف جا رہا ہوں۔ بڑی جلدی واپس آ جاؤں گا۔"

اس نے فکرمند نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"خدا کے لئے اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "فکر نہ کرو"

وہ بولی۔ "گھوڑا لے کر جانا۔"

میں خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اصطبل میں آ کر میں نے گھوڑے پر زین کسی اور اس پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ روما نے مجھے جو راستہ بتایا تھا میں اسی راستے پر جا رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو وادی میں آتے ہی پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ گھوڑا خوب دوڑ رہا تھا۔ وادی گزر گئی۔ میں ایک دو ٹیلوں کے قریب سے بھی گزر گیا۔ اس کے بعد ایک اور وادی آئی۔ میں اس میں سے بھی گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے نکل گیا۔ اس کے بعد ایک سنگلاخ میدان شروع ہو گیا اور مجھے ایک دیو قامت قلعے کی عمارت دکھائی دی۔ میں نے گھوڑے کا رخ قلعے کی طرف کر لیا۔ قلعے کے پاس آ کر میں نے قلعے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بہت بڑا پرانا قلعہ تھا جس پر ایک آسیبی سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس خالی قلعے میں جنوں بھوتوں نے اپنا ڈیرا جما لیا ہوا ہے۔ قلعے کا دروازہ بہت بڑا تھا اور اس کی دہلیز زمین کے اندر دھنس چکی تھی۔ جیسے اسے صدیوں سے کسی نے کھولا نہ ہو۔ میں گھوڑے پر بیٹھا قلعے کا چکر لگا کر اس کے اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ قلعے کے صدر دروازے کے اوپر ایک شکستہ سی پتھر کی بالکونی تھی۔ اتنی اونچی تھی کہ میں گھوڑے پر کھڑے ہو کر بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب میں قلعے کے پیچھے آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک جگہ سے قلعے کی دیوار کے کچھ پتھر ٹوٹ کر باہر گرے ہوئے تھے۔ اور دیوار میں اتنی جگہ بن گئی تھی کہ ایک آدمی اندر داخل ہو سکے۔ میں نے گھوڑے کو وہیں گھاس وغیرہ چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور دیوار کے شگاف میں سے گزر کر دوسری طرف چلا گیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ صحن کے درمیان میں ایک گول فوارہ بنا ہوا تھا جو سوکھا پڑا تھا۔ فوارے کے اندر بھی گھاس اگ رہی تھی۔ عجیب وحشت خیز ویرانی کا منظر تھا۔

میں نے کھڑے ہو کر ماحول کا جائزہ لیا۔ قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی جانب ایک ستونوں والا برآمدہ دور تک چلا گیا تھا۔ برآمدے کے فرش پر صدیوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اس وقت آسمان پر ہلکے ہلکے بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور دھوپ غائب ہو گئی تھی۔ قلعے کے صحن پر چھاؤں نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا اور اس کی فضا اور زیادہ پراسرار اور آسیبی ہو گئی تھی۔

روما نے مجھے بتایا تھا کہ بدروح اسے قلعے کے ایک تہہ خانے میں لے جاتی ہے۔ مجھے اس تہہ خانے کی تلاش تھی۔ میں نے قلعے کے کشادہ صحن کا پورا چکر لگایا۔ مگر مجھے کسی جگہ کوئی ایسا سوراخ یا شگاف یا سیڑھیاں نظر نہ آئیں جو نیچے تہہ خانے میں جاتی ہوں۔ ایک نیم تاریک راہ داری قلعے کے اندر جا رہی تھی۔ میں اس راہ داری میں آ گیا۔ ایک عجیب پراسرار سکوت چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ راہ داری کا فرش بھی گرد آلود تھا۔ ایک جانب دیوار کے ساتھ کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے دروازے بند تھے۔ نہ جانے کتنے برسوں سے یہ دروازے بند تھے۔ میں نے ایک دو دروازوں کو کھولنے کی کوشش کی مگر وہ زمین میں جیسے گڑ چکے تھے۔ راہ داری میں ایک جگہ پتھر کی سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو وہاں ایک بڑا کمرہ تھا۔ کمرے میں ایک بہت بڑا لکڑی کا تخت بچھا ہوا تھا جس پر مٹی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دیواریں خالی تھیں۔ اونچی اونچی کھڑکیوں میں سے ابر آلود دن کی مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ فرش پر کمرے کی چھت سے گرا ہوا پلستر بکھرا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا تخت کی دوسری طرف گیا تو وہاں کھڑکی کی روشنی میں فرش پر ایک پرانے قالین کا ٹکڑا بچھا ہوا دکھائی دیا۔ قالین کے کونے میں ایک تختہ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ مجھے کچھ شک ہوا۔ میں نے قالین کو تھوڑا سا ہٹا کر لکڑی کے تختے کو ایک طرف کیا تو مجھے ایک زینہ نظر آیا جو نیچے تہہ خانے کو جاتا تھا۔ میں نے تختے کو اوپر سے اٹھا دیا اور زینہ اترنے لگا۔ میں ایک اور کمرے میں آ گیا۔ یہ تہہ خانے کا کمرہ تھا جہاں دیوار کے ساتھ ایک پرانے زمانے کا پلنگ رکھا تھا جس پر ایک گدیلا بچھا ہوا تھا۔ دیوار کی دوسری جانب ایک چھوٹے سائز کا تخت دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس تخت پر قالین کا ٹکڑا بچھا تھا اور ایک بڑا سا گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ تہہ خانہ

ہے جہاں بدروح روما کو لے کر آتی ہے۔ مجھے وہاں اور کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تہہ خانے میں زینے کی جانب سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ میں تخت پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ دل میں کچھ سوچ کر میں اٹھا اور تہہ خانے کے زینہ پر چڑھنے لگا۔ اس وقت مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں تہہ خانے سے باہر آگیا۔ تہہ خانے کے دہانے پر میں نے تختے کو اوپر کر کے قالین اسی طرح بچھا دیا اور آہستہ آہستہ قلعے کے بڑے کمرے سے باہر کی طرف چل پڑا میں قلعے کے گرد آلود برآمدے میں سے گزر رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ قدموں کی چاپ بھی رک گئی تھی۔ میں چلا تو اس کے بعد پھر پیچھے سے قدموں کی آواز آنے لگی۔ میں رک گیا۔ میں نے آواز دے کر پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

میرے سوال کے جواب میں خاموشی طاری رہی۔ لیکن مجھے کسی کے لمبے لمبے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم کوئی بدروح ہو۔ مگر یاد رکھو تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

گہرے سانس لینے کی آواز رک گئی۔ برآمدے میں دن کی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے فرش کی طرف دیکھا۔ فرش پر میرے پاؤں کے نشان مٹی پر صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کسی اور انسان کے قدموں کے نشان بھی تھے۔ میں نے جھک کر غور سے دیکھا۔ یہ نشان جوتوں کے تھے اور مرد کے سائز سے چھوٹے تھے۔ لگتا تھا کہ کسی عورت کے پاؤں کے نشان ہیں۔ یہ کسی عورت کی بدروح تھی جو میرا پیچھا کر رہی تھی۔ میں قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ میرا گھوڑا کچھ فاصلے پر گھاس چر رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر اس کی باگیں تھامیں اور اس پر سوار ہو کر روما کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ روما اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم خیریت سے واپس آ گئے۔ مجھے تمہاری فکر لگی ہوئی تھی۔"

میں نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ کہنے لگی۔

"وہ ضرور وہی بدروح تھی۔ تمہیں وہاں نہیں جانا چاہئے تھا۔"

میں نے کہا۔ "میں وہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔ مگر تمہیں اس بدروح سے نجات دلا کر رہوں گا۔"

روما کھڑکی سے باہر تکنے لگی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے لگی۔

"آج چاند کی تیرھویں رات ہے آج رات پھر وہی بدروح مجھے لے جانے آ رہی ہے۔ جیسے جیسے رات قریب آ رہی ہے۔ میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آج رات تم اکیلی نہیں ہوگی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بدروح تو مجھے ہوا میں اڑا کر لے جاتی ہے۔ تم کیسے ہوا میں اڑ سکو گے؟"

میں نے کہا۔ "میں چاہے جو کچھ بھی کروں۔ لیکن میں آج کی رات تمہیں اکیلی نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے روما کو بالکل نہ بتایا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور اسے تھوڑا بہت دلاسا دے کر اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ رات کو کھانے کی میز پر روما خاموش خاموش تھی۔ وہ آنے والے لمحات کا تصور کر کے پریشان تھی۔ بوڑھے دادا کو کچھ خبر نہیں تھی کہ آج کی رات اس کی پوتی پر کیا گزرنے والی ہے۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ باہر بجلی چمکنے لگی تھی اور ہلکی ہلکی بادلوں کی گرج بھی سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کھڑکی کھول کر باہر نظر ڈالی۔

باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ ہوا سرد ہو گئی تھی۔ میں کھڑکی بند کر

کے بستر پر آکر لیٹ گیا- تپائی پر شمع روشن تھی- اس کی دھیمی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی- بجلی چمکتی تو کمرے میں ایک دو سیکنڈ کے لئے نیلی روشنی چمک اٹھتی- بجلی کے چمکنے کے بعد بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج ہی کچھ دیر تک سنائی دیتی رہی- میں سوچنے لگا کہ روما نے ٹھیک کہا تھا- میں بدروح کے ساتھ ہوا میں پرواز نہیں کر سکوں گا- مجھے پہلے قلعے میں جا کر چھپ کر بیٹھ جانا چاہئے- میں یہ سوچ کر بستر سے اٹھنے لگا تو بجلی چمکی اور اس کی چمک کے ساتھ ہی مجھے کھڑکی میں کسی کا چہرہ دکھائی دیا- جو بارش میں بھیگ رہا تھا- میں نے غور سے دیکھا تو یہ سمارا کا چہرہ تھا- میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھا-

"سمارا! یہ تم ہو؟"

"ہاں میں ہوں" یہ کہہ کر سمارا کھڑکی میں سے میرے بیڈروم میں آگئی- اس کا لباس بارش میں بھیگا ہوا تھا- میں نے بستر پر سے کمبل اٹھا کر کہا-

"سمارا! یہ کمبل اوڑھ لو- تمہیں سردی لگ جائے گی"-

اس نے مسکرا کر کہا-

"مجھے سردی نہیں لگے گی- تم اس وقت جس الجھن میں ہو مجھے معلوم ہے- میں تمہاری راہنمائی کرنے آئی ہوں-"

اس نے اپنی مٹھی کھول کر میرے آگے کر دی- اس کی مٹھی میں میری وہی انگوٹھی تھی جو مجھے مصر کے بزرگ نے دی تھی-

کہنے لگی- "میں تمہاری انگوٹھی لے آئی ہوں- اسے پہن لو-"

میں نے انگوٹھی لے کر اپنی انگلی میں پہن لی- وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی-

"تم ابھی قلعے میں مت جانا- اس وقت جاؤ گے تو تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے-"

میں نے سمارا سے کہا-

لیکن میں روما کو بدروح سے نجات دلانا چاہتا ہوں- میں روما سے محبت کرتا ہوں- وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے- میں اسے اس عذاب

میں نہیں دیکھ سکتا-

سمارا بولی-

"میں جانتی ہوں- اس لئے تمہاری اور تمہاری محبوبہ کی مدد کے لئے آئی ہوں-"

"پھر میں کیا کروں" میں نے پوچھا- "میں اس کے ساتھ ہی نہیں جا سکتا- بدروح تو روما کو ہوا میں اڑا کر لے جائے گی- میں ہوا میں نہیں اڑ سکتا- اگر اس کے جانے کے بعد قلعے کی طرف گیا تو ہو سکتا ہے دیر ہو جائے- رات تاریک ہے- چاند بادلوں میں چھپا ہوا ہے- بارش بھی ہو رہی ہے- میں گھوڑے پر بھی جاؤں تو اتنی جلدی وہاں نہیں پہنچ سکوں گا-"

سمارا کہنے لگی-

میں تمہیں ایک سفوف دیتی ہوں یہ سفوف تم پانی میں ملا کر ابھی روما کو جا کر پلا دو- اس کے بعد اپنے بیڈروم میں آکر لیٹ جاؤ- بدروح تمہیں بے ہوش کرنے بھی آئے گی وہ تم پر طلسم پھونکے گی مگر تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو گا- اس کے بعد وہ روما کو لے کر قلعے کی طرف پرواز کر جائے گی- جب بدروح چلی جائے تو تم نیچے آکر گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کی طرف روانہ ہو جانا- تمہارا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا بدروح سے پہلے قلعے میں پہنچ جائے گا- تم تہہ خانے میں جا کر ایک کونے میں کھڑے ہو جانا- اس وقت تم غائب ہو گے- تم سب کو دیکھ رہے ہو گے مگر تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا- اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے-"

میں نے پوچھا- "سمارا! مجھے یہ بتاؤ کہ روما کو سفوف پلانے سے کیا ہو گا؟"

اس نے جواب دیا-

"اس سفوف میں ایک ایسا زہرہ ہے جو زندہ انسان کے لئے آب حیات ہے مگر بدروحوں کے واسطے زہر قاتل ہے- جب بدروح روما

کے سینے پر منہ رکھ کر اس کا خون پینے لگے گی تو اس سفوف کا زہر اس
کے اندر فوراً سرائیت کر جائے گا۔ پھر کیا ہو گا؟ یہ تم خود دیکھ لینا۔
اب دیر نہ کرو۔ میں تمہیں پھر ملوں گی۔"

یہ کہہ کر سارا نے میری طرف ایک چھوٹی سی ڈبی اچھالی جسے میں نے پکڑ لیا
اور وہ کھڑکی میں سے دوسری طرف اتر کر بارش میں غائب ہو گئی۔ میں نے ڈبی کو کھول
کر دیکھا۔ اس میں سفید رنگ کا چٹکی بھر سفوف پڑا تھا۔ میں سیدھا روما کے بیڈ روم میں
آ گیا۔ وہ بے چاری خوف کے مارے جاگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"روما! میں تمہارے لئے ایک چیز لایا ہوں جو تمہیں ہمیشہ کے لئے
بد روح کے عذاب سے نجات دلا دے گی۔"

اس کے پلنگ کے پاس تپائی پر پانی کا جگ اور گلاس پڑا تھا۔ میں نے گلاس میں
پانی ڈال کر اس میں ڈبی میں سے سفوف نکال کر ملایا اور روما سے کہا۔

"اسے پی جاؤ"

اس نے گلاس پکڑ لیا اور پوچھا۔

"اس میں کیا ہے کرستوف؟"

میں نے کہا۔ "یہ مت پوچھو۔ یہ پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر تمہیں مجھ پر
بھروسہ ہے تو اسے پی جاؤ۔"

روما نے کہا۔ "تم میری زندگی ہو کرستوف۔ میں تم پر کیسے بھروسہ نہیں
کروں گی۔"

اور وہ سفوف والا پانی پی گئی۔ کہنے لگی۔

"اس کا تو کوئی ذائقہ نہیں تھا"

میں نے کہا۔

"مگر یہ جو کام کرے گا وہ تم تہہ خانے میں پہنچ کر خود اپنی آنکھوں
سے دیکھو گی۔ اب تم لیٹ جاؤ اور فکر بالکل نہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ
آج کے بعد یہ بد روح کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آئے گی۔"

وہ بستر پر لیٹ گئی۔ میں اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ بادلوں کی وجہ سے چاند چھپ

گیا تھا اور کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ میں کھڑکی کے پاس آ
گیا۔ باہر دیکھا۔ بارش رک گئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ درختوں پر سے بارش
کے رکے ہوئے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کی آواز سے گر رہے تھے۔ عجیب پر اسرار
رات تھی۔ بجلی کسی کسی وقت چمک جاتی تھی مگر بادل بالکل خاموش تھے۔ گرج نہیں
رہے تھے۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ شمع دان کو میں نے روشن
ہی رہنے دیا۔ میں شمع کی روشنی میں بد روح کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا
کہ وہ گھر میں خادمہ اور بوڑھے دادا کو صبح تک بے ہوش کرنے کے بعد میرے
بیڈ روم میں بھی آئے گی تاکہ مجھے بھی بے ہوشی کی نیند سلا دے۔

کھڑکی کھلی تھی۔ اس میں سے سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ مگر مجھے سردی نہیں
لگ رہی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ شاید آدھی رات گزر چکی
تھی کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بہت بڑا پرندہ غوطہ لگا کر مکان کے اوپر سے
گزر گیا ہو۔ ہوا میں اس کے پروں کے شور کی آواز آئی تھی۔ میں نے گردن تک
کمبل اوپر کر لیا اور نیم وا آنکھوں سے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے
ایک تاریک سایہ کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا۔ بد روح آ گئی تھی۔

بیڈ روم میں عجیب ناگوار سی بو پھیل گئی۔ یہ بد روح کے برے اعمال کی بدبو
تھی۔ انسان جب گناہ کرتا ہے تو اس کے جسم سے نسواری رنگ کے ناگوار بو والے
بخارات نکلنے لگتے ہیں۔ جب آدمی کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کے جسم سے نورانی
شعاعیں نکلتی ہیں جن کی سرمدی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ یہ بد روح بھی
گناہگار انسان کی بد روح تھی۔ چنانچہ اس کے آتے ہی فضا میں ناگوار بو پھیل گئی تھی۔
میں سمجھ گیا کہ بد روح مجھے بے ہوش کرنے میرے بیڈ روم میں آنے ہی والی ہے۔ میں
نے اپنی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی رکھیں۔ گدھ کے پروں کے زناٹے کی آواز ایک
دو بار فضا میں بلند ہو کر غائب ہو گئی۔ میں خاموش لیٹا بد روح کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی
دیر کے بعد گدھ ایسے بڑے بڑے پروں کے زناٹے کی آواز پھر سنائی دی۔ اس کے
ساتھ ہی ایک بہت بڑا مردار خور گدھ کھڑکی کے راستے میرے بیڈ روم میں داخل ہوا
اور میرے بستر کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بستر کے قریب آتے ہی اس گدھ نے انسان کی

شکل اختیار کرلی- میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا کہ اس بدروح کا انسانی چہرہ انتہائی بدشکل تھا- گول گول آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں- ہونٹوں کے کناروں سے دو دانت باہر نکلے ہوئے تھے- بدروح نے اپنے نوکیلے ناخنوں والے ہاتھ میرے اوپر پھیلا دیئے اور تین بار میرے چہرے پر پھونک ماری- اس نے مجھ پر بے ہوشی کا طلسم پھونکا تھا- مگر میری اپنی غیبی طاقت کی وجہ سے اس کے طلسم کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا اور میں اسی طرح جاگتا رہا-

بدروح نے ایک بار پھر گدھ کی شکل اختیار کرلی اور وہ پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی کھڑکی میں سے باہر نکل گئی- اس کے جانے کے بعد میں بستر پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا- باہر جھانک کر دیکھا- بارش رکی ہوئی تھی- کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ بدروح روما کو لے کر چلی گئی ہے یا نہیں- میں نے جلدی سے کھڑکی بند کی اور دبے پاؤں بیڈ روم سے نکل کر بڑے کمرے میں سے ہوتا ہوا روما کے بیڈ روم کی طرف بڑھا- اس کے بیڈ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا- اندر شمع دان روشن تھا- میں نے دروازے میں سے اندر جھانک کر دیکھا- روما کا بستر خالی تھا- میں بیڈ روم میں داخل ہو گیا- بیڈ روم کی فضا میں بدروح کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی- اس کا مطلب تھا کہ بدروح روما کو لے کر قلعے کی طرف پرواز کر گئی ہے-

سمارا کی ہدایت کے مطابق میں فوراً باہر نکل آیا- اصطبل میں گھوڑا بندھا ہوا تھا- میں نے جلدی جلدی اس پر زین ڈالی اسے باندھا اور اس پر سوار ہو کر گھوڑے کو قلعے کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دیا- باگ ہاتھ میں آتے ہی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے گھوڑا زمین سے بلند ہو کر فضا میں پرواز کر رہا ہے- دیکھتے دیکھتے رات کی تاریکی میں سارا راستہ طے ہو گیا اور مجھے اندھیرے میں دیو قامت قلعے کی آہنی عمارت نظر آنے لگی- میں نے گھوڑے کو قلعے کے پیچھے لے جا کر چھوڑ دیا اور خود قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیوار میں سے قلعے کے اندر داخل ہو گیا- جس راستے پر سے ہوتا ہوا میں دن کے وقت تہہ خانے میں اترا تھا میں اسی راستے سے ہو کر بڑے کمرے میں پہنچ گیا- وہاں اندھیرا تھا- مگر مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ بڑا تخت پوش کس جگہ پڑا ہے- میں بڑے تخت پوش کے پیچھے آیا اور تختے کو ایک طرف تھوڑا ہٹایا اور نیچے تہہ خانے کی

سیڑھیوں میں اتر گیا- میں نے اس خیال سے تختے کو واپس سرکا کر تہہ خانے کا راستہ بند کر دیا کہ شاید بدروح بھی اسی راستے سے تہہ خانے میں اترتی ہو اور تہہ خانے کا تختہ ہٹا ہوا دیکھ کر اسے یہ شک نہ گزرے کہ تہہ خانے میں اس سے پہلے کوئی گیا ہے- میں سیڑھیاں اتر کر تہہ خانے میں آ گیا-

اس وقت تہہ خانے کی دیواروں پر تین مشعلیں جل رہی تھیں- جن کی کافی روشنی ہو رہی تھی- میں سمجھ گیا کہ بدروح نے اپنی مکروہ سرگرمیوں کے واسطے پہلے سے مشعلیں روشن کر رکھی ہیں- میں تہہ خانے کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا- سمارا نے کہا تھا کہ اس وقت میں غیبی حالت میں ہوں گا- میں سب کو دیکھ سکوں گا مگر مجھے کوئی نہیں دیکھ سکے گا- ابھی تک میں شک کی حالت میں تھا- کیونکہ مجھے اپنا آپ صاف نظر آ رہا تھا- اتنے میں تہہ خانے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی- میں دیوار کے اور ساتھ لگ گیا- تہہ خانے کی سامنے والی دیوار میں سے ایک سیاہ پوش عورت نمودار ہوئی- اس کے بال بکھرے ہوئے تھے- آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اس کے ہاتھ میں طشت تھا جس میں دو پیالے رکھے ہوئے تھے- سیاہ پوش عورت نے طشت پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر رکھ دیا اور خود پلنگ کی پائینتی کی جانب دیوار کے ساتھ ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی ہو گئی-

بدروح ابھی تک روما کو لے کر نہیں آئی تھی- سمارا نے ٹھیک کہا تھا کہ تم بدروح سے پہلے تہہ خانے میں پہنچو گے- کچھ ہی دیر بعد فضا میں گدھ کے پروں کے زناٹے کی آواز آئی- پھر سامنے والی دیوار میں سے وہی بہت بڑا گدھ نمودار ہوا جس نے اپنے پنجوں میں روما کو اٹھا رکھا تھا- یہ بدروح تھی- بدروح نے روما کو بستر پر لٹا دیا اور فوراً انسانی شکل اختیار کرلی- یہ وہی بدروح تھی جو میرے بیڈ روم میں مجھ پر بے ہوشی کا طلسم پھونکنے آئی تھی- مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ میں کسی کو دکھائی نہیں دے رہا- کیونکہ مجھے سیاہ پوش عورت نے بھی نہیں دیکھا تھا- اور بدروح کو بھی میں دکھائی نہیں دیا تھا- حالانکہ میں دیوار کے پاس شعلوں کی روشنی میں کھڑا تھا- وہاں مجھے بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا- مگر میں ان دونوں بدروحوں کے لئے غائب تھا-

بدروح نے انسانی شکل اختیار کرتے ہی سیاہ پوش عورت کو اشارہ کیا-

عورت جلدی سے پلنگ کے پاس آئی۔ اس نے روما کو اچھی طرح سے بالکل سیدھا کر کے بستر پر لٹا دیا۔ روما بے ہوش تھی۔ شاید وہ ہوش میں تھی اور سب کچھ دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی مگر اپنا جسم اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی تھی۔ یوں وہ ہوش میں بھی تھی اور بے ہوش بھی تھی۔ یہ روح اپنے سیاہ لبادے کو سمیٹ کر دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئی۔ اس نے سیاہ پوش عورت کی طرف دیکھ کر اپنے حلق سے ایک ڈراونی آواز نکالی۔ اس آواز کو سنتے ہی سیاہ پوش عورت نے روما کے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ جب وہ اس کے سارے کپڑے اتار چکی تو اس نے پیالے میں جو تیل رکھا ہوا تھا روما کے بدن پر اس کی مالش شروع کر دی۔

اس دوران بدروح تخت پر بیٹھا اپنی ابلی ہوئی سرخ آنکھوں سے مسلسل روما کے بدن کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے فضا میں ان بدروحوں کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ روما کے جسم پر تیل کی مالش کے ساتھ ہی فضا میں ایک گہری گہری خوشبو پھیلنے لگی۔ میں کونے میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔ میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ جب روما کا سارا جسم تیل کی مالش سے چمکنے لگا تو سیاہ پوش عورت پلنگ پر سے اتر کر پائنتی کی جانب ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد بدروح تخت سے اٹھی آہستہ آہستہ چلتی روما کے پلنگ کے قریب آ کر روما کے عریاں تیل سے چمکتے ہوئے جسم کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اس کے بعد بدروح پلنگ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس نے اپنا نوکیلے دانتوں والا منہ روما کے سینے کے درمیان لگا دیا اور آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگی۔ میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔ سارا نے زہریلا سفوف دیتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ اس کے بعد جو ہو گا وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔

اب میری نظریں بدروح پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے مکروہ ہونٹ روما کے سینے میں پیوست کر رکھے تھے اور شاید آہستہ آہستہ اس کا خون پی رہا تھا۔ اچانک اس بدروح نے اپنا منہ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے سر کو دو تین بار زور سے جھٹکا اور دونوں بازو پھیلا کر اتنے زور سے چیخ ماری کہ تہہ خانے کی دیواریں لرز اٹھیں۔ سیاہ پوش عورت ڈر کر بھاگنے لگی تو بدروح نے اسے دونوں ہاتھوں سے

دبوچ لیا اور میرے دیکھتے دیکھتے سیاہ پوش عورت کا لبادہ پھاڑ کر اس کے سینے میں اپنے دانت گاڑ دیئے اور اس کے خون کے گھونٹ بھرنے لگا۔ سیاہ پوش عورت کے حلق سے دردانگیز بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ بدروح نے اسے چھوڑ دیا۔ سیاہ پوش عورت کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ اس کے منہ سے بھی سیاہ خون بہنے لگا۔ بدروح کے منہ سے بھی سیاہ خون بہنے لگا تھا۔ سیاہ پوش عورت نے درندوں کی طرح جھپٹ کر بدروح کی گردن پکڑلی۔ بدروح نے اس کی گردن دبوچ لی۔ دونوں فرش پر گردش کرنے لگے۔ گردش بھی کر رہے تھے اور ان کے حلق سے چیخیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ اور فرش پر گول دائرے میں گھوم رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ پھر اچانک بدروح کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ اس آگ نے سیاہ پوش کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب دونوں بدروحیں آگ کے بگولے بن گئے اور تہہ خانے کے وسط میں گردش کرنے لگے۔ ان کی دل ہلا دینے والی دہشت ناک چیخوں سے درودیوار ہل رہے تھے۔ میں بیٹھ گیا تھا اور یہ سارا عبرت ناک منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ آگ کا گردش کرتا بگولا میرے اوپر یا روما کے اوپر نہ آن گرے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ دونوں بدروحیں آگ کے شعلوں میں لپٹی ایک ہی جگہ پر گردش کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کے جسم جلنے لگے۔ فضا میں سڑے ہوئے گوشت کی بدبو آنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد دونوں بدروحوں کے ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آنے لگے۔ پھر ان کی ہڈیاں بھی آگ نے جلا ڈالیں اور وہ زمین پر گر کر بکھر گئیں۔ آگ بجھ گئی۔ چیخوں کی آواز بند ہو گئیں۔ تہہ خانے میں عبرت ناک سناٹا چھا گیا۔

میں دوڑ کر روما کے پاس گیا۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ بعد میں روما نے مجھے بتایا کہ وہ ہوش میں تھی اور سب کچھ دیکھ رہی تھی اور بدروحوں کی چیخ وپکار بھی سن رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روما کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ حرکت کر رہی تھیں۔ مگر اس کے ہونٹ بند تھے۔ میں نے اسے آواز دی تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے جلدی جلدی اسے کپڑے پہنائے اور اسے کندھے پر اٹھا کر قلعے سے باہر لے آیا۔ اس وقت بھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بجلی ان بادلوں میں چمک رہی تھی۔ روما کے پالتو گھوڑے نے شاید اس کی بو پالی تھی یا بجلی کی چمک میں اس نے ہمیں

دیکھ لیا تھا۔ وہ دور سے دوڑتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ میں نے روما کو اس پر ڈالا۔ خود بھی سوار ہوا اور گھوڑے کو بھگاتا ہوا اس منحوس قلعے سے دور نکل گیا۔ گھوڑے نے بھی شاید اس آسیبی قلعے کی نحوست کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ معمول سے زیادہ تیز دوڑ رہا تھا۔ بارش بدستور رکی ہوئی تھی۔ میں روما کو لے کر ان کے مکان پر آ گیا۔ گھوڑے کو اصطبل میں چھوڑا اور روما کو اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں لا کر بستر پر ڈال دیا۔

خادمہ اور بوڑھا دادا بدروح کے طلسم کی وجہ سے اپنے اپنے کمروں میں گہری نیند سو رہے تھے یا بے ہوش پڑے تھے۔ انہیں سورج نکلنے کے بعد ہوش آنی تھی۔ روما کی آنکھیں جاگ رہی تھیں۔ ہوش میں تھیں اور میری طرف دیکھ کر مجھے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے تھوڑا سا دودھ گرم کیا اور روما کو اس کے تین چار چمچ پلائے۔ روما کا جسم جو پہلے برف کی طرح سرد تھا اب گرم ہو گیا تھا۔ قدرت بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے بدن میں جان پڑنے لگی اور اس نے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر روما دیکھ رہی ہے تو وہ سن بھی رہی ہو گی۔ اس نے مجھے بتایا بھی تھا کہ وہ بدروح کا سارا ناپاک کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور سنتی ہے۔ میں اسے تسلی دے رہا تھا۔

"خدا نے تم پر اپنا کرم کیا ہے روما! تمہیں بدروحوں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی ہے تم نے ان بدروحوں کے خوفناک انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔"

ابھی روما بول نہیں سکتی تھی مگر احسان مند نگاہوں سے مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی محبت میں سرشار تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ وہ ایک بھیانک عذاب سے نکل آئی ہے۔ میں نے بے اختیار ہو کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ روما کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ میں نے رومال سے اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"روما! میری محبت روما! آنسو نہ بہاؤ۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا۔ تمہیں اب کبھی کچھ نہیں ہو گا۔"

میری محبت کے جذبے نے بھی برقی توانائی کا کام کیا اور روما کی آواز واپس آ گئی جو دوسرے روز صبح کو واپس آیا کرتی تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے۔ اس نے

فرانسیسی زبان میں پہلا جو جملہ ادا کیا اس کا اردو میں ترجمہ تھا "میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا ایک بار پھر ماتھا چوما اور کہا۔

"میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں روما! تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ بے فکر ہو کر سو جاؤ میں جاگ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کے اوپر لحاف ڈالا اور شب بخیر کہہ کر بیڈ روم سے باہر آ گیا۔ بڑا کمرہ خالی پڑا تھا۔ آتشدان میں رات کو جلنے والی آگ بجھ چکی تھی۔ میں اپنے بیڈ روم میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں روما کا نازک خوش نما چہرہ جیسے نقش ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں سو گیا اور خواب میں بھی اس کے پاس ایک پر فضا باغ میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ صبح اٹھا تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ خادمہ کے باتھ روم میں گرم پانی کی بالٹی رکھنے اور ٹھنڈے پانی کے باتھ ٹب میں گرم پانی ڈالنے کی آواز آ رہی تھی۔ خادمہ پر بدروح کے طلسم کا اثر سورج نکلنے کے ساتھ ہی زائل ہو گیا تھا۔ میں تیار ہو کر بڑے کمرے میں آیا تو بوڑھا دادا بھی آتشدان کے پاس بیٹھا پائپ پی رہا تھا اور ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے صبح بخیر کہا اور کتاب ایک طرف رکھ دی اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ خادمہ میز پر ناشتہ لگا رہی تھی۔ روما ابھی تک شاید سو رہی تھی۔ بوڑھے دادا پر بھی سورج نکلنے کے ساتھ ہی بدروح کا طلسم ختم ہو چکا تھا۔ وہ روز کی طرح ہشاش بشاش تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ رات اس کی پوتی کے ساتھ کیا گزری تھی۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ منحوس بدروح جل کر خاک ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد روما بھی آ گئی۔ اس نے آسمانی رنگ کا فل سویٹر اور ہلکے آسمانی رنگ کا فراک پہن رکھا تھا۔ سنہری بال نیلے رنگ کے ربن میں بندھے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ بوڑھے دادا نے کہا۔

"بیٹی! آج تم دیر سے اٹھی ہو۔ کیا رات کو پوری کتاب ختم کر ڈالی تھی۔"

روما نے ہمارے قریب ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں دادا جان! لیکن رات کو ذرا دیر سے نیند آئی تھی۔"

اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کے بعد ہم ناشتے کی میز پر آ گئے۔ ناشتے کے دوران بھی ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ہماری گفتگو کا موضوع زیادہ تر موسم اور دادا جان کی شکار کی باتیں تھیں۔

روما سے محبت ہو جانے کے بعد میرے اندر ایک زبردست نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ تبدیلی یہ تھی کہ اب میرا وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا پہلے مجھے اپنی جدید زمانے کی دنیا، اپنے گھر والے دوست اور بہن بھائی یاد آتے تھے اور میں ان کے پاس جانے کو ہر وقت بے تاب رہتا تھا مگر اب میرے دل سے ان کا خیال نکل گیا تھا۔ میرے دل میں سوائے روما کے اور اس کی محبت کے اور کچھ نہیں تھا۔ روما بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ مجھے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے دادا بھی مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے اور اس بات پر خوش تھے کہ اس کی پوتی کو ایک ساتھی اور عمدہ دوست مل گیا ہے۔ ہم بڑی ہنسی خوشی دن گزارنے لگے۔

میں اور روما بگھی میں سوار ہو کر وادی اور جنگل کی روزانہ لمبی لمبی سیر کرتے۔ ہر ہفتے پکنک مناتے۔ اس نے مجھے پیانو بجانا بھی سکھا دیا تھا۔ رات کو ہم دیر تک آتشدان کے پاس بیٹھے پیار بھری باتیں کرتے رہتے۔ مجھے کسی قسم کا کوئی فکر نہیں تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ ڈیڑھ برس اسی طرح گزر گیا۔ اس دوران زندگی بڑی خوبصورت اور پر سکون رہی۔ ایک روز بوڑھے دادا جان اچانک بیمار پڑ گئے۔ ہم ان کی تیمارداری میں لگ گئے۔ مگر ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ ایک روز وہ انتقال کر گئے۔ ہم نے انہیں قریبی قبرستان میں دفن کر دیا۔ روما کو اپنے دادا کی موت کا بڑا صدمہ ہوا لیکن میری محبت اور میری دل جوئی نے اس صدمے کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ اب ہم دونوں اتنے بڑے مکان میں اکیلے رہ رہے تھے۔ بوڑھی خادمہ ہماری خدمت کرتی تھی ایک روز روما اور میں باغیچے میں جنگلی گلاب کی جھاڑی کے پاس بیٹھے پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ فضا میں مختلف پھولوں کی خوشبوئیں رچی ہوئی تھیں۔ کہ روما نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کرستوف! ہم کب تک یونہی ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی دور رہیں گے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی تھی جب عورت کو ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے روما کو شادی کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

"روما! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں قبول ہے۔"

یورپ میں یہ رواج ہے کہ لڑکا لڑکی کو شادی کی پیشکش کرتا ہے چاہے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی بے تکلف کیوں نہ ہوں۔ ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا محبوب اس کی شادی کی پیش کش کرے۔ میری اس پیشکش پر روما کا چہرہ سنہری دھوپ میں گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس کے چہرے پر شرم وحیا کی سرخی جھلکنے لگی۔

اس نے کہا۔

"ہاں کرستوف! میں بھی تم سے شادی کر کے ایک خوشگوار زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کے تین دن بعد ہم دونوں نے شادی کر لی۔ شادی کی سادہ سی تقریب میں علاقے کے کچھ خاندان کے لوگ موجود تھے۔ رات کو ہم نے اپنے مکان پر مہمانوں کو پر تکلف دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی میری اور روما کی محبت کا ازدواجی دور شروع ہو گیا۔ عام طور پر شادی کے بعد محبت کرنے والوں میں پہلے سا جوش وخروش نہیں رہتا۔ لیکن ہمارے ساتھ اس کے بالکل الٹ ہوا۔ شاید اس لئے بھی کہ ہم ایک دوسرے سے سچے دل سے پیار کرتے تھے۔ ہماری محبت پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ ہم پہلے سے بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے۔

یورپ میں برفباری کا موسم شروع ہو گیا۔ ایک دن روما اور میں کھڑکی کے پاس بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ باہر بادل گھرے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی برفباری شروع ہو گئی۔ برف کی سفید سفید پنکھڑیاں گرنے لگیں۔ بڑا خوبصورت منظر تھا۔ روما میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی اور دلکش آواز میں کہنے لگی۔

"کرستوف! کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ خواب اچانک ختم نہ ہو جائے۔ سوچتی ہوں یہ حسین خواب ٹوٹ گیا تو میں کیا کروں گی۔"

میں نے روما کے سنہری بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"ایسی باتیں کیوں کرتی ہو روما۔ یہ خواب نہیں ہے۔ ہم حقیقت کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔"

اس وقت مجھے بھی یہ خیال نہیں رہا کہ میں خود ایک خواب دیکھ رہا ہوں جو اپنی دنیا میں میرے واپس آنے کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ ہم برفباری میں گرم کپڑے اور اونی ٹوپیاں پہن کر وادی میں نکل جاتے اور خوب سیر کرتے۔ مکان میں آ کر آتشدان کی آگ کے سامنے بیٹھ کر کافی پیتے اور محبت بھری باتیں کرتے۔ دن واقعی ایک رنگین خواب کی طرح گزر رہے تھے۔ شادی کے بعد روما کچھ اور زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے۔ میرے لئے ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات کے برابر تھی۔ جہاں بیوی میں محبت ہو تو زندگی حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن مقدر میں جو لکھ دیا گیا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ شادی کے بعد ہمارا پہلا برفباری کا موسم تھا۔ اس بار سب یہی کہتے تھے کہ اس دفعہ فرانس میں معمول سے زیادہ برف پڑ رہی ہے۔ روما کو گرتی برف میں سیر کرنے کا بہت شوق تھا۔ ایک شام برف گر رہی تھی کہ روما میرے ساتھ برفباری میں باہر نکل آئی۔ دو روز پہلے بڑی شدید برفباری ہوئی تھی اور کھیتوں اور وادی کے تمام راستوں اور مکانوں کی چھتوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ برفباری کے ساتھ سرد ہوا بھی چل رہی تھی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی شدید سردی میں روما کو باہر نکلنے سے منع کروں لیکن اس کے شوق کو دیکھ کر میں نے اسے منع نہ کیا۔ روما میرے ساتھ دیر تک برفباری میں سیر کرتی رہی۔ مجھے تو سردی لگتی نہیں تھی۔ صرف روما پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں بھی اس کی طرح کا عام انسان ہوں اور مجھے بھی سردی لگتی ہے میں نے

بھی گرم کپڑے اور اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جس وقت ہم مکان پر واپس آئے تو میں نے محسوس کیا کہ روما کچھ تھکی تھکی سی ہے۔ اس کے چہرے کی گلابی رنگت بھی سفیدی مائل ہو رہی تھی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ ہم اپنے لمبے کوٹ اور اونی ٹوپیاں اتار کر آتشدان کے پاس بیٹھ کر گرم گرم کافی پینے لگے۔ روما بظاہر بڑی خوش تھی اور بڑے شگفتہ انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ لیکن کسی کسی وقت وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا دبا دیتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے روما۔ تم بار بار اپنے سینے کو کیوں دباتی ہو"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے ہی ایسا کر رہی ہوں۔ اب نہیں کروں گی۔"

میں بھی چپ ہو گیا۔ خادمہ نے رات کا کھانا لگا دیا تھا۔ ہم کھانا کھانے میز پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران بھی روما بڑی شگفتہ باتیں کرتی رہی۔ وہ میری طرف دیکھ کر بار بار مسکراتی۔ کھانے کے بعد ہم نے کافی پی۔ اس کے بعد وہ آتش دان کے پاس رکھے پیانو پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ روما پیانو پر آہستہ آہستہ انگلیاں چلانے لگیں۔ پیانو میں سے بڑے دردانگیز اداس اداس سر نکل رہے تھے۔ پھر روما نے پیانو کے ساتھ ایک قدیم فرانسیسی گیت گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز بھی بڑی درد بھری تھی اور گیت کے الفاظ بھی سوگوار تھے۔ اس گیت کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔

"وہ برفباری کی رات سردی میں ٹھٹھرتا
ہوا میرے پاس آیا
باہر برف گر رہی تھی
آہ! میرا محبوب مجھ سے جدا ہو گیا
میں نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے
گرم ہاتھ میں لے لیا
آہ! میرا محبوب مجھ سے بچھڑ گیا
ہر موسم میں برف گرتی ہے۔

جنگلی گلاب کھلتے ہیں لیکن
میرے محبوب کی شکل کہیں دکھائی
نہیں دیتی۔"

اس نے گیت ختم کیا تو میں اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"روما! کیا بات ہے آج تم اتنے اداس گیت کیوں گا رہی ہو؟"

اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خلاف معمول اداس تھا۔ مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"کرستوف! جانے کیوں آج میں بہت اداس ہوں۔ لگتا ہے شاید میرا خواب ٹوٹنے والا ہے۔"

میں نے روما کا ہاتھ چوم کر کہا۔

"ایسا نہ کہو میری جان۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے پاس رہیں گے۔"

روما کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جو ہونے والا تھا اس کی شاید اسے خبر ہو گئی تھی۔ لیکن اسے کچھ کہنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں روما سے دل وجان سے پیار کرتا تھا۔ میرا پریشان ہونا قدرتی بات تھی۔ میں نے اسے پیانو کے سٹول سے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا۔

"خبردار اگر اب میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔"

روما نے اپنی نازک گلابی خوشبودار انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔

"خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ تمہارے سوا دنیا میں میرا اور کون ہے۔ تم ایک ہی تو ہو جس سے میں نے پہلی اور آخری بار محبت کی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دبایا۔ میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے روما۔ کیا سینے میں درد محسوس کر رہی ہو؟"

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

میں اسے لے کر بیڈ روم میں آ گیا۔ ہم دونوں کا اب ایک ہی بیڈ روم تھا۔ ہم نے ایک کمرے میں دونوں پلنگ ساتھ ساتھ لگا لئے تھے۔ میں نے اسے بستر پر لٹا کر اس کے اوپر گرم لحاف ڈال دیا اور کہا۔

"میں تمہارے لئے برانڈی لاتا ہوں"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں کرستوف! میرے پاس بیٹھے رہو۔"

مگر مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ روما جو شام کے وقت برفباری میں پھرتی رہی ہے اسے سردی لگ گئی ہے۔ میں نے کہا۔

"نہیں روما! تمہیں برانڈی کی شدید ضرورت ہے۔"

میں جلدی سے بڑے کمرے میں آ گیا۔ کارنس کے پرانے شیلف میں دوسرے مشروبات کے ساتھ برانڈی کی بوتل بھی پڑی تھی۔ میں نے ایک گلاس میں برانڈی ڈالی اور تیز تیز چلتا بیڈ روم میں آ گیا۔ خادمہ نے مجھے برانڈی لے کر تیز تیز جاتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے روما کو سہارا دے کر تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور اسے تھوڑی سی برانڈی پلائی۔ برانڈی پی کر اس نے اپنا سر تکیوں کے ساتھ لگا دیا اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

"کرستوف! تم میرے پاس ہی بیٹھے رہو"

اتنے میں خادمہ دروازے پر دستک دے کر اندر آ گئی۔

"موسیو! خیریت تو ہے ناں"

اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"مادام کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ شاید سردی لگ گئی ہے۔ میں نے برانڈی تھوڑی سی پلا دی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گی"

خادمہ نے روما کے پاس آ کر بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مادام! میں آپ کے لئے گرم کافی بنا کر لاتی ہوں"

رومانے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماما۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جاکر آرام کرو۔"

خادمہ خاموشی سے شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔ میں نے روما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی دل جوئی کرنے کی خاطر کہا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے روما۔ تم بڑی جلدی اچھی ہو جاؤ گی۔"

میں اصل میں روما کو نہیں اپنے آپ کی دل جوئی کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا۔ کیونکہ میں روما سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رومانے دھیمی آواز میں کہا۔

"کرستوف! تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو۔ کاش تم اس طرح ساری زندگی میرے پہلو میں بیٹھے رہو۔"

میں نے کہا۔ "تم ساری زندگی میرے ساتھ رہو گی۔ ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔"

شاید روما کو معلوم ہو گیا تھا۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کی ساری زندگی بس ایک گھنٹے کی باقی رہ گئی ہے۔ روما بستر پر اٹھ کر تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ برانڈی پینے کے بعد اس کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"سینے میں درد تو نہیں ہے نا؟"

اس نے میری طرف بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور بولی۔

"نہیں کرستوف! اب میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں"۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے کہا۔

"میرا کافی پینے کو جی چاہ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں ابھی بنا کر لاتا ہوں"

میں اٹھ کر جانے لگا تو وہ بولی۔

"اپنے لئے بھی بنا کر لانا۔ میں تمہارے ساتھ مل کر کافی پینا چاہتی ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی لاتا ہوں"

میں نے کچن میں جا کر جلدی جلدی کافی کے دو پیالے بنائے اور روما کے بیڈ روم میں آ گیا۔ وہ تکیوں کے سہارے پلنگ پر نیم دراز تھی۔ میں نے کافی کی پیالی اسے دی اور خود بھی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر کافی پینے لگا۔ رومانے کافی کا ایک گھونٹ پیا۔ کہنے لگی۔

"کرستوف! مجھے اپنی ماں بہت یاد آ رہی ہے۔ وہ شاعرہ تھی۔ پیانو پر بیٹھ کر مجھے اپنی نظمیں گا کر سنایا کرتی تھی۔ اس کی آواز بڑی درد بھری تھی۔ میں اس سے بڑی محبت کرتی تھی۔ میں دس برس کی تھی کہ وہ مجھے دادا جان کے پاس چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو گئی۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تین روز پہلے وہ میرے خواب میں آئی تھی۔ وہ ایک باغ میں پھولوں بھرے درختوں کے نیچے بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھی پھولوں کا گلدستہ بنا رہی تھی۔ ماں نے مجھے کہا۔ روما تم دنیا میں اکیلی اداس رہتی ہو۔ میں نے ماں سے کہا ماں تم مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میں تمہارے پاس بڑی خوش رہوں گی۔ ماں نے میرا ماتھا چوم لیا اور آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت سے مجھے اپنی ماں بہت یاد آ رہی ہے۔ جب تم کافی بنانے گئے تھے تو مجھے کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے ماں کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہی تھی۔"

میں نے روما کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خدا کے لئے کوئی اور بات کرو روما۔ میں ایسی باتیں نہیں سن سکتا۔"

وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں اداسی کا تاثر صاف نمایاں تھا۔ کہنے لگی۔

"جو شے ہونے والی ہو اس سے کیا ڈرنا۔"

میں نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔ اس کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔

کچھ نہیں ہونے والا روما۔ سب ٹھیک ہے سب ٹھیک ہے۔ تم سونے کی کوشش کرو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

رومانے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔ اور سر تکیوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اس کی پیشانی کو چوم کر شب بخیر کہا اور اسی پلنگ کی دوسری جانب لیٹ گیا۔ بیڈ روم میں شمع کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر سرد رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ جو نہیں سوچنا چاہتا تھا وہ بھی سوچ رہا تھا۔ طرح طرح کے خیال دل میں آ رہے تھے۔ کہیں روما مجھے چھوڑ کر چلی نہ جائے۔ وہ میری محبت کا محور بن چکی تھی۔ میری ساری خوشیاں اس کے گرد گردش کر رہی تھیں۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد رومانے مجھے آہستہ سے آواز دی۔

"کرستوف!"

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ روما کا چہرہ پہلے سے زیادہ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو"

میں نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر اسے تھوڑا سا اٹھایا اور تکیوں کے سہارے بٹھا دیا۔ وہ بولی۔

"مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ"

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ میرے ہاتھ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا کر کہنے لگی۔

"میں وہی باغ دیکھ رہی ہوں۔

سفید پھولوں سے لدے ہوئے درخت ہیں۔ ان درختوں کے نیچے تخت بچھا ہے۔ تخت پر میری پیاری ماں بیٹھی پھولوں کا گلدستہ بنا رہی ہے میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی ہوں۔

ماں! میری پیاری ماں!-----"

روما کی آواز سرگوشیوں میں بدلتی گئی۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ نیچے گر پڑا۔ میں نے روما کے چہرے کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ میرے حلق سے بے اختیار ایک دردانگیز چیخ سی نکل گئی۔ میں نے روما کو

اپنے سینے سے لگا لیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میری آواز سن کر خادمہ گھبرائی ہوئی بیڈ روم میں آ گئی۔ میں نے اس کی طرف آنسوؤں بھری آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"روما ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

اور روما سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔

دوسرے دن روما کو میری محبوبہ کو قصبے کے چھوٹے سے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ قصبے کے لوگ جنازے میں شریک ہوئے۔ سب نے روما کی روح کی مغفرت کے لئے دعا مانگی اور ایک ایک میرے پاس آ کر مجھے تسلی کے کلمات کہنے لگا۔ پھر سب چلے گئے۔ میں اپنی محبوبہ، اپنی بیوی اور اپنی جیون ساتھی کی قبر پر اکیلا رہ گیا۔ میں اس کی قبر پر سر جھکائے بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ شام کا وقت ہو گیا۔ میں وہیں قبر پر بیٹھا تھا۔ خادمہ آ کر میرے قریب کھڑی ہو گئی۔ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"موسیو! خداوند کو یہی منظور تھا۔ صبر کریں۔ گھر واپس چلیں۔"

میں جیسے غم و اندوہ کی دنیا میں گم تھا۔ خادمہ کے دو تین بار بلانے پر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ قبرستان پر اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور سر جھکائے شکستہ دلی کے ساتھ قدم اٹھاتا اپنے بیڈ روم میں آ کر لیٹ گیا۔ روما کا دلکش چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ میری آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے۔ یہ محبت کا ایک عجیب عالم تھا۔ اس کا پہلے مجھے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ میری محبوبہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی ہے۔ اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ خادمہ میرے لئے کھانا لے کر آئی۔ میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ کھانے کی ویسے بھی مجھے حاجت نہیں تھی اور روما کی موت نے مجھے ہر شے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ خادمہ نے رات کے وقت آ کر کہا۔

"موسیو! تھوڑا سا دودھ ہی پی لیں۔ آپ نے سارا دن کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کو کہا۔ وہ بے چاری چلی گئی۔ میں بستر پر چپ چاپ لیٹا روما کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہا۔ اس گھر کی ایک ایک چیز مجھے

روما کی یاد دلا رہی تھی۔

آدھی رات کو میں بے اختیار اٹھا اور روما کی قبر پر جا کر بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

"روما! تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی ہو؟ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے بھی اپنے پاس بلا لو۔ میں تمہارے بغیر جی کر کیا کروں گا"

قبرستان کے سناٹے میں میں نہ جانے کب تک روما کی قبر پر بیٹھا خیال ہی خیال میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ جب روما کو پکارتے پکارتے تھک گیا تو واپس مکان پر آکر لیٹ گیا۔

اب میرا یہ معمول بن گیا تھا۔ میں نے روما کی قبر کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی میں اس کی قبر پر دیوانوں کی طرح بیٹھا خیال ہی خیال میں اس سے باتیں کرتا رہتا۔ ایک رات بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ رات بڑی تاریک تھی۔ بجلی تھوڑی دیر کے لئے چمکتی تو قبرستان کی قبریں نظر آنے لگتیں۔ میں روما کی قبر کے پاؤں کی طرف بیٹھا تھا اور اور اس کو مخاطب کر کے اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میری آنکھیں بار بار آنسوؤں سے چھلک اٹھتی تھیں۔ مجھ پر کچھ ایسی وحشت طاری ہوئی کہ میں روما کی قبر سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔ پھر ایسا ہوا کہ کسی نے مجھے ایک جھٹکے سے اٹھا کر زبردست دھکا دے کر پرے گرا دیا۔ میں قبر سے پانچ فٹ کے فاصلے پر جا کر گرا۔

میں خوف زدہ ہو کر وہاں سے اٹھا اور اپنے بیڈ روم میں آکر لیٹ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے دھکا کسی نے دیا تھا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کیا روما کی روح نے مجھے دھکا دیا تھا؟ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا خوبصورت باغ ہے۔ باغ میں ایک نہر بہہ رہی ہے۔ روما نہر کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہے۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا ہے۔ سنہری بالوں میں سفید گلاب کے پھول سجے ہوئے ہیں۔ میں نہر کے اس طرف والے کنارے پر کھڑا ہوں۔ روما کے چہرے پر گہری سنجیدگی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے ناراض ہے۔

میں نے بے تاب ہو کر اسے آواز دی اور کہا۔

"روما! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟"

روما نے دھیمی آواز میں مگر سرزنش کے انداز میں کہا۔

"کرستوف! آئندہ میری قبر پر نہ آنا۔"

میں نے کہا۔ "مگر روما میں کیا کروں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اس نے کہا۔ "تمہیں ابھی بہت دیر زندہ رہنا ہے۔ ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ لوگ مرنے والے کے ساتھ نہیں مرتے۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ تمہاری جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔"

روما بولی۔ "تمہیں میری جدائی برداشت کرنی پڑے گی اگر تم نے اب بھی راتوں کو دیوانوں کی طرح میری قبر پر آنا نہ چھوڑا تو نقصان اٹھاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

روما بولی۔ "صبح اٹھ کر پہلا کام یہ کرو کہ جس مکان میں تم رہ رہے ہو اسے چھوڑ دو اور گھوڑے پر سوار ہو کر سمندر کی طرف نکل جاؤ سمندر کے کنارے تمہیں ایک کشتی دکھائی دے گی۔ اس کشتی میں سوار ہو جانا وہ کشتی تمہیں ایک بادبانی جہاز کے پاس لے جائے گی جو بیچ سمندر میں کھڑا ہو گا اس جہاز پر سوار ہو جانا۔ وہ جہاز تمہیں جہاں لے جائے گا وہی تمہاری اگلی منزل ہو گی۔ اب جاؤ۔"

اور روما میری طرف سے منہ پھیر کر چل دی۔ اس کے فوراً بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور روما نے خواب میں مجھ سے جو باتیں کی تھیں ان پر غور کرنے لگا۔ شاید اس نے مجھے درست کہا تھا اور مجھے صحیح راستہ دکھا دیا تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ اس خواب میں روما سے ملاقات کے بعد میرے دل کو قرار مل گیا تھا۔ میرے دل میں روما کی موت کے بعد جو گہرا بادل چھایا ہوا تھا وہ جیسے جھٹ گیا تھا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صبح ہوتے ہی خادمہ کو بتائے بغیر اصطبل میں آیا۔ گھوڑے پر زین ڈالی اور اس پر سوار ہو کر جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ سمندر اسی طرف ہے۔ دو گھنٹوں کی مسافت کے بعد مجھے دور

سے سمندر نظر آنے لگا۔

سمندر کے کنارے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک کشتی لہروں پر کھڑی اوپر نیچے ہو رہی ہے۔ یہ چھوٹی سی کشتی تھی۔ میں گھوڑے سے اتر کر کشتی میں سوار ہو گیا۔ جیسے ہی کشتی میں بیٹھا کشتی اپنے آپ چل پڑی۔ اب مجھے ایک بار پھر اپنے گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔ میں اپنی دنیا میں واپس جانے کے لئے بے چین تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا وسیلہ مل جائے کہ میں ماضی کے زمانے سے چھٹکارا پا کر اپنی دنیا میں واپس چلا جاؤں۔

میں اپنی دنیا سے زیادہ دور نہیں تھا۔ صرف تین سو سال کا ہی فرق رہ گیا تھا۔

کشتی اپنے آپ سمندر میں چلی جا رہی تھی۔ جب کنارا غائب ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ سمندر کے وسط میں ایک بادبانی جہاز کھڑا ہے۔ روما نے اسی بادبانی جہاز کے بارے میں مجھے کہا تھا کہ میں اس پر سوار ہو جاؤں۔ کشتی جہاز کے پاس جا کر رک گئی۔ جہاز کے اوپر سے رسی کی ایک سیڑھی لٹک رہی تھی۔ میں اس پر چڑھتا ہوا جہاز پر آ گیا۔ جہاز کے عرشے پر کوئی انسان نہیں تھا۔ بالکل خالی پڑا تھا۔ میں نے اوپر سے جھک کر نیچے دیکھا۔ جس کشتی پر بیٹھ کر میں وہاں آیا تھا وہ اپنے آپ واپس جا رہی تھی۔ جہاز کے بادبان لکڑی کے بڑے بڑے ستونوں یعنی مستولوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ اس جہاز کے تین مستول تھے۔ بادبانی جہاز ہوا کے ذریعے چلا کرتے تھے۔ جب ہوا بادبانوں میں بھر جاتی تھی تو جدھر کی ہوا ہوتی تھی وہ جہاز لے کر اس طرف روانہ ہو جاتی تھی۔ اگر ہوا رک جائے تو جہاز بھی رک جاتا تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ ہوا کے اچانک رک جانے سے سمندر میں سفر کرتے بادبانی جہاز ایک دم ٹھہر جاتے تھے اور تین تین چار چار دن تک سمندر میں کھڑے رہتے تھے۔

لیکن عجیب بات تھی کہ اس بادبانی جہاز کے بادبان لپٹے ہوئے تھے لیکن میرے سوار ہونے کے ساتھ ہی وہ سمندر میں چل پڑا تھا۔ میں نے جہاز کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مجھے وہاں کوئی انسان نظر نہ آیا۔ سمجھ گیا کہ یہ آسیبی یا طلسمی جہاز ہے اور روما کی روح کے اشارے پر مجھے میری منزل تک لے جانے کے لئے وہاں کھڑا تھا۔ میں مطمئن ہو کر جہاز پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ یہ جہاز دو دن تک سمندر میں سفر کرتا رہا۔ تیسرے دن دور سے زمین نظر آئی۔ جہاز کنارے سے کافی دور سمندر میں رک گیا۔ میں نے

دیکھا کہ کنارے کی جانب سے ایک چھوٹی سی کشتی اپنے آپ جہاز کی طرف چلی آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طلسمی کشتی مجھے لینے آ رہی ہے۔ کشتی جہاز کے ساتھ آ کر لگ گئی۔ میں سیڑھی کی مدد سے اتر کر کشتی میں سوار ہو گیا۔ کشتی کنارے کی طرف تیرنے لگی۔ دن کا وقت تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا میں گرمی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ میں کسی گرم ملک میں آ گیا ہوں۔ سمندر کا کنارہ خالی تھا۔ اور کہیں کہیں ایک دو درخت دکھائی دے رہے تھے۔ کشتی اپنے آپ کنارے کے ساتھ جا کر لگ گئی۔ میں کشتی سے اتر کر کھڑا ہو گیا اور دیکھنے لگا کہ میں کون سی سرزمین میں، کون سے ملک میں آ گیا ہوں۔ ریت کے ٹیلوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں وسطی ایشیا کے کسی ملک میں نکل آیا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ شام یا مصر کا ملک ہو۔

دور درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔

میں اس کی طرف چلنے لگا۔ قریب پہنچ کر دیکھا کہ یہ ایک نخلستان تھا۔ کھجور کے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ ایک شفاف پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ یہاں سے مجھے کس طرف چلنا چاہئے۔ ابھی تک مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ میں تاریخ کی سولہویں سترھویں صدی میں ہوں یا بدقسمتی سے پھر تاریخ کے قدیم زمانے میں پہنچ گیا ہوں۔ سولہویں سترھویں صدی میں وسطی ایشیا کے ممالک مصر اور شام وغیرہ کافی ترقی کر چکے تھے۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کچھ گھوڑ سوار نخلستان کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کے لباس کو دیکھ کر اندازہ ہو جائے گا کہ میں کونسی صدی میں ہوں۔ ان سے پوچھ بھی لوں گا کہ یہ کون سا ملک ہے۔ کون سا شہر ہے۔

گھوڑ سوار دس بارہ تھے۔ ان کے لمبے لمبے لبادے تھے اور سروں پر کپڑے لپیٹ رکھے تھے۔ کسی گھوڑ سوار کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ کسی کے کندھے پر تیر کمان لٹک رہے تھے اور کسی نے ہاتھ میں لمبی نالی والی توڑے دار بندوق پکڑ رکھی تھی۔ اس بندوق سے میں سمجھ گیا کہ میں سولہویں سترھویں صدی کے آس پاس کے زمانے میں ہی ہوں۔ گھوڑ سوار قریب آ کر گھوڑوں سے اتر پڑے۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی شکلیں بڑی وحشی تھیں۔ مجھے وہ ڈاکو لگے۔ انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔

تین گھوڑ سواروں کے ہاتھوں میں توڑے دار بندوقیں تھیں انہوں نے اپنی اپنی بندوق کا رخ میری طرف کر لیا- ایک گھوڑ سوار جو ان کا سردار لگتا تھا- اور جس کی گھنی سیاہ ڈاڑھی تھی- اور آنکھیں سرخ تھیں اپنی زبان میں چیخ کر بولا-

"اسے پکڑ کر لے چلو"

میرے دیکھتے دیکھتے انہوں نے مجھے پکڑ کر میرے ہاتھ رسی سے باندھے اور اٹھا کر ایک گھوڑے پر ڈال دیا- اور خود بھی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور واپس چل پڑے- میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہوا ہے- مجھے خیال آیا کہ کیا روما نے مجھے اس لئے یہاں بھیجا تھا کہ مجھے ڈاکو لوگ اغوا کر کے لے جائیں- مگر روما کی روح ایسا نہیں کر سکتی تھی- میری اس گرفتاری اور پیش آنے والی مصیبت میں ضرور میری نجات کا کوئی راز پوشیدہ تھا- ہو سکتا تھا کہ اس میں سے ہی میرے لئے واپس اپنی دنیا میں جانے کا کوئی سبب پیدا ہونے والا ہو-

میں نے اپنے آپ کو راضی بہ رضا کرتے ہوئے حالات کے حوالے کر دیا-

گھوڑ سوار صحرا میں سے گھوڑے دوڑاتے گزرتے چلے گئے- دور مجھے ایک شہر کی عمارتوں کے آثار نظر آنے لگے- کچھ دیر کے بعد شہر کی اونچی دیوار فصیل دکھائی دی- گھوڑ سوار شہر کے دروازے کی طرف جانے کی بجائے دائیں جانب ریت کے ٹیلوں کی طرف مڑ گئے- اس کے آگے ایک ریتلا میدان تھا- میدان کی دوسری طرف ایک مخروطی مینار والی شکستہ سی عمارت تھی- وہ اہرام مصر سے ملتی جلتی تھی- میں اسے اہرام ہی رہوں گا- اہرام کی ٹوٹی پھوٹی دیوار میں ایک جگہ سے اندر جانے کا راستہ بنا ہوا تھا- گھوڑ سوار گھوڑوں سے اتر گئے- باقی سوار باہر ہی رہے- ان کا سردار مجھے لے کر دیوار کے اندر داخل ہو گیا- اندر ایک نیم تاریک راہ داری تھی- جہاں راہ داری ختم ہوئی تھی وہاں ایک زینہ نیچے اترتا تھا- سردار نے وہ رسی پکڑ رکھی تھی جس سے میرے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے- ہم زینہ اتر کر نیچے ایک ہال نما کمرے میں آ گئے جہاں تیل کے دو لیمپ روشن تھے- میں نے ان کی روشنی میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی کو دیکھا جس نے قدیم فرعون مصر کا لباس پہن رکھا تھا اور ایک سنہری کرسی پر بیٹھا تھا- اس کی دونوں جانب دو حبشی غلام توڑے دار بندوقیں لئے

کھڑے تھے-

اگرچہ کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی قدیم فرعون مصر کے لباس میں تھا لیکن غلاموں کی توڑے دار بندوقیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ میں مصر کے قدیم زمانے میں نہیں بلکہ سولہویں صدی میں ہی ہوں- اس سے مجھے حوصلہ ہوا کہ میں ایک دو ہزار برس پیچھے کے زمانے میں نہیں گیا- اب مجھے دیکھنا یہ تھا کہ یہ لوگ مجھے کس لئے پکڑ کر لائے ہیں اور قدرت کی طرف سے میری نجات کے کیا اسباب پیدا ہونے والے ہیں- نقلی فرعون نے میری طرف گھور کر دیکھا اور سردار سے کہا-

"اس کو تابوت والی کوٹھڑی میں لے جا کر بند کر دو-"

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نقلی فرعون اپنی زبان یعنی عربی نہیں بول رہا تھا جو سولہویں سترھویں صدی میں مصر کی زبان تھی- اس کی بجائے وہ فراعنہ مصر کے زمانے کی زبان میں بات کر رہا تھا- اس کا خیال تھا کہ میں یہ زبان نہیں سمجھ رہا- مگر میں اپنی غیبی قوت کی وجہ سے وہ زبان بخوبی سمجھ رہا تھا-

سردار نقلی فرعون کا حکم پاتے ہی مجھے تہہ خانے کے ایک تنگ دروازے سے گزار کر ایک کوریڈور میں لے آیا جہاں ساتھ ساتھ تین کوٹھڑیاں تھیں- تینوں کوٹھڑیوں پر تالے پڑے تھے- سردار نے جیب سے چابی نکال کر ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور میری رسی کھول کر مجھے اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا- کوٹھڑی میں بھی زیتون کے تیل کا ایک لیمپ روشن تھا- اس کی مدھم روشنی میں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو کونے میں سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی- اس کے بال اس کے گھٹنوں پر بکھرے ہوئے تھے- اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا- اس کی آنکھوں میں آنسو تھے- میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا- لڑکی نے پوچھا-

"یہ لوگ تمہیں کہاں سے پکڑ کر لائے ہیں؟"

لڑکی نے اس زبان میں بات کی تھی جو سترھویں صدی میں مصر کے علاقے میں بولی جاتی تھی- میں نے اسی زبان میں اسے جواب دیا- اور اسے بتایا کہ یہ لوگ مجھے ایک نخلستان سے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں-

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ مجھے یہاں کس لئے قید کیا گیا ہے؟"

لڑکی نے کہا۔

ہم دونوں کو ایک ہی مقصد کے لئے یہاں قید میں ڈالا گیا ہے۔ ہم دونوں کا ایک ہی بھیانک انجام ہو گا۔

میں نے پوچھا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ لوگ آخر کون ہیں اور کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی نے فرعون مصر کا لباس کس لئے پہن رکھا تھا۔"

لڑکی کہنے لگی۔ "یہ ایک خاص فرقے کے لوگ ہیں جو آج بھی فرعون کو اپنا سب سے بڑا دیوتا مانتے ہیں اور فرعونوں کی طرح سورج دیوتا کی پرستش کرتے ہیں۔ جس فرعون کو یہ اپنا دیوتا مانتے ہیں یہ اس کے اہرام کا کھنڈر ہے۔ اس فرعون کا یہ دستور تھا کہ وہ ہر سال ایک خاص دن سورج دیوتا پر اپنے ایک نوجوان غلام اور نوجوان کنیز کی بھینٹ چڑھایا کرتا تھا۔ آج اس منحوس فرعون کی قربانی کا دن ہے۔ میں اس نقلی فرعون کی کنیز ہوں۔ پہلے ہر سال یہ لوگ باہر سے کسی عورت کو پکڑ کر اس کی قربانی دیا کرتے تھے۔ اس دفعہ مجھے سورج کی بھینٹ چڑھانے کے لئے انہوں نے پکڑ کر اس کوٹھڑی میں بند کر دیا ہے۔ میرے ساتھ مرنے کے لئے یہ تمہیں باہر سے پکڑ کر لے آئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ ہمیں قتل کرنے والے ہیں؟"

کنیز نے کہا۔ "نہیں ان کا منحوس فرعون سورج پر لڑکی لڑکے کی قربانی اس طرح دیا کرتا تھا کہ وہ اپنی کسی کنیز اور کسی غلام کو اس اہرام کے نیچے ایک تہہ خانے میں بند کر دیتا تھا۔ اس کے بعد دیوار کے شگاف کو پتھروں اور گارے چونے سے بند کر دیا جاتا تھا۔ بدنصیب کنیز اور غلام بھوک پیاس اور دم گھٹنے سے مرجایا کرتے تھے۔ میں اس لئے رو رہی تھی کہ آج آدھی رات کے بعد مجھے اہرام کے خونی تہہ خانے میں موت کے منہ میں جھونک دیا جائے گا اور میرے ساتھ تمہارا بھی یہی انجام ہو گا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا کہ اللہ نے چاہا تو میرا تو یہ انجام نہیں ہو گا اور میں تجھے بھی اس خوفناک انجام سے بچانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔

"کیا یہاں سے فرار کا کوئی راستہ ہے تم تو یہاں کی رہنے والی ہو"

وہ بولی۔ "فرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج رات ہماری موت لکھی جا چکی ہے۔ ہمیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "میرا نام مالینی ہے۔ مگر اب تم میرا نام معلوم کر کے کیا کرو گے۔ میں تو آج رات نہیں تو کل صبح تک دم گھٹنے سے تمہارے ساتھ ہی مرجاؤں گی۔"

میں اس لئے مطمئن تھا کہ میری موت اس دنیا میں نہیں لکھی ہوئی تھی جس دنیا میں میں پہنچ چکا تھا۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اگر روما نے مجھے ان حالات کے حوالے کیا ہے تو ضرور اس میں کوئی مصلحت ہو گی اور میری اپنی دنیا میں واپسی کا کوئی ذریعہ نکل آئے گا۔ ورنہ وہ مجھے کبھی اس طرف نہ بھیجتی۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ قید خانے میں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ ہم دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ کنیز مالینی پر موت کا خوف ضروری طاری تھا مگر یقینی موت کے سامنے اس کو صبر آ چکا تھا اور اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ میں اسے اپنی طرف سے تھوڑی بہت تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس ملک کی رہنے والی ہے اور اس کے ماں باپ کہاں ہیں۔ اس کے جواب میں اس نے ایک ہی بات کہی کہ اب ان باتوں کو جاننے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

نہ جانے کتنے گھنٹے گزر چکے تھے کہ قید خانے کا دروازہ کھلا اور چار ہٹے کٹے حبشی غلام اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ توڑے دار بندوقوں والی پوری گارد تھی۔ انہوں نے ہم دونوں کے ہاتھ رسیوں سے پیچھے باندھ دیئے اور قید خانے سے نکال کر ایک طرف کو چل پڑے۔ یہ ایک نیم تاریک راہ داری تھی۔ جہاں راہ داری ختم ہوئی وہاں دیوار توڑ کر چھوٹا سا شگاف ڈال دیا گیا تھا۔ دو آدمی اینٹیں اور پتھر لئے وہاں کھڑے تھے۔ ہم دونوں کو دیوار کے شگاف میں دھکیل دیا گیا اور دونوں آدمی دیوار کو اینٹوں سے چننے لگے۔ ہم اندھیرے تہہ خانے میں تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے دیوار کا شگاف اینٹوں اور پتھروں سے بند کر کے اس پر پلستر کر دیا گیا۔ مجھے اندھیرے

میں کنیز مالینی کی سسکیوں کی آواز آئی۔

اس پر موت کی دہشت طاری تھی۔

میں نے اسے کہا۔ "رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ جیسا میں کہتا ہوں ویسے کرو۔ تم میرے ہاتھوں کی رسی کھولو اور میں تمہارے ہاتھوں کی رسی کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ہم دونوں اندھیرے میں ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی انگلیوں کی مدد سے اس کے ہاتھوں کی رسی کھول دی۔ اس کے بعد اس نے میرے ہاتھوں کو آزاد کر دیا۔ میں نے مالینی سے کہا۔

"دیوار کے شگاف میں راج مزدور تازہ گارا چونا لگا کر گئے ہیں۔ اس کو دھکیلنے سے اینٹیں اکھڑ سکتی ہیں۔"

مالینی نے کہا۔ "یہ لوگ اتنے احمق نہیں ہیں۔ دیوار کے شگاف کے پاس تین دن اور تین راتیں بندوق والے پہرے داروں کا پہرہ لگا رہے گا۔ ایک دفعہ ایک غلام نے دیوار کی اینٹیں اکھاڑنے کی کوشش کی تھیں۔ پہرے داروں نے اسے گولیوں سے ہیں بھون ڈالا تھا اور اس کی لاش اسی تہہ خانے میں پھینک کر دیوار کو دوبارہ بند کر دیا گیا تھا۔

میں نے دیوار کے ساتھ کان لگا کر سنا۔ باہر پہرے داروں کی کسی کسی وقت آپس میں بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ میں مروں گا نہیں اور مجھے کچھ ہو گا بھی نہیں۔ تہہ خانے میں آکسیجن ختم بھی ہو گئی تو میں زندہ رہوں گا۔ البتہ یہ بے گناہ لڑکی مالینی ضرور مر جائے گی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کو کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر تہہ خانے میں رہنے کے بعد ہمیں اندھیرے میں تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا تھا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

یہ تہہ خانہ ایک کھلی قبر کی طرح تھا۔ چاروں طرف دیواروں نے اسے بند کر رکھا تھا۔ نہ کوئی کھڑکی تھی۔ نہ کوئی روشندان تھا۔ ہوا بھی بند ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ فضا میں آکسیجن کی جو تھوڑی بہت مقدار ہوا کے ساتھ اندر داخل ہو چکی تھی وہ

ہمارے سانس لینے کی وجہ سے آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ مجھے تو آکسیجن کی کمی بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن مالینی پر اس کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہو ناں مالینی؟"

مالینی نے شکستہ اور کمزور آواز میں کہا۔

"مجھے سانس لینے میں دقت محسوس ہونے لگی ہے۔"

اس وقت مجھے خیال آیا کہ آکسیجن اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اگر کرہ ارض پر آکسیجن نہ ہوتی تو کوئی انسان، چرند پرند زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ کوئی پیڑ پودا بھی نہ اگتا۔ سانس لیتے ہوئے ہم نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا کہ یہ آکسیجن گیس ہی ہے جس کی وجہ سے ہم اتنی آسانی سے سانس لے رہے ہیں۔ اگر یہ فضا میں سے نکال دی جائے تو چاہے ہمارا منہ کتنا ہی کھلا کیوں نہ ہو۔ چاہے ہمارے نتھنے کتنے ہی چوڑے کیوں نہ ہوں۔ اور چاہے ہم کتنا زور کیوں نہ لگا لیں ہم ایک بھی سانس نہیں لے سکیں گے اور ہماری موت واقع ہو جائے گی۔ واقعی انسان کو چاہئے کہ وہ ہر لمحے نہیں تو کم از کم دن میں ایک دو بار صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی بے بہا نعمتوں کا ضرور شکر ادا کرتا رہے۔ یہ وہ نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں بالکل مفت ملتی ہیں۔

میں نے کنیز مالینی کی کلائی پکڑ کر نبض دیکھی۔ اس کی نبض بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ہم بالکل خاموش تھے۔ ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے کوئی موضوع نہیں تھا۔ ایک دو بار میں نے مالینی سے اس کی زندگی کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ موت کے تہہ خانے کی آکسیجن زیادہ تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ہم دونوں کو تہہ خانے کی قبر میں بند ہوئے چھ سات گھنٹے گزر گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مالینی لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ فضا میں سے آکسیجن کی کافی مقدار ختم ہو چکی ہے۔ میں نے مالینی پر جھک کر

کہا۔

"مالینی! مالینی!"

مالینی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا۔ میں نے اس کا سر تھام کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے سانس کی بڑی بھیانک آواز نکل رہی تھی۔ اس کے دس پندرہ منٹ بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ آکسیجن کی شدید کمی کا انسان پر سب سے پہلا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے اور پھر بے ہوشی میں ہی دم توڑ دیتا ہے۔ کیونکہ آکسیجن نہ ملنے سے اس کے دماغ کے خلیے مرنا اور بیکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

اس بے گناہ معصوم لڑکی کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں بے اختیار پکار اٹھا۔

"روما! روما! یہ تم نے مجھے کس جہنم میں جھونک دیا ہے؟"

ابھی میرا جملہ پورا ہوا ہی تھا۔ کہ دیوار پر ایک انسانی ہیولا نمودار ہوا۔ یہ روما تھی۔ اس نے سفید براق لباس پہن رکھا تھا اور سنہری بالوں میں سفید پھول سج رہے تھے۔ میں نے روما کے ہیولے یا اس کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"روما! پلیز میری نہ سہی لیکن اس لڑکی کی مدد کرو۔ یہ بے گناہ ہے۔ اسے بے قصور موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔"

روما کی آواز آئی۔ "کرستوف! جب میں چلی جاؤں گی تو دیوار میں جس جگہ تم مجھے دیکھ رہے ہو وہاں تمہیں ایک دروازہ نظر آئے گا۔ تم اس لڑکی کو لے کر اس دروازے میں سے باہر نکل جانا۔ باہر تمہیں ریت کے ٹیلے کے پاس دو گھوڑے نظر آئیں گے۔ ان پر سوار ہو کر یہاں سے فرار ہو جانا۔ باہر کے پہرے داروں کو میں نے گہری نیند سلا دیا ہے۔"

اتنا کہہ کر روما کا ہیولا غائب ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دیوار میں ایک دروازہ نکل آیا ہے۔ دروازے میں سے دن کی روشنی اور تازہ ہوا بڑی تیزی سے اندر آنے لگی تھی۔ میں نے بے ہوش مالینی کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ باہر چار بندوق بردار حبشی غلام زمین پر بے ہوش پڑے تھے۔ میں مالینی کو لے

کر سامنے نظر آتے ریت کے ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ ریت کے ٹیلے کی دوسری جانب دو گھوڑے کھڑے تھے جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں۔ میں نے مالینی کو زمین پر لٹا دیا۔ تازہ ہوا میں آتے ہی مالینی کو ہوش آنے لگا تھا۔ میں نے اس کو آواز دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں مالینی۔ ہم دونوں زندہ ہیں اور تہہ خانے سے فرار ہو چکے ہیں۔"

ہوا میں موجود تازہ آکسیجن نے مالینی پر جادو کا اثر کیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"جلدی سے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ ہم یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں اچھا ہے۔"

میں نے سہارا دے کر مالینی کو گھوڑے پر بٹھا دیا۔ میں نے احتیاطاً پوچھا۔ "کیا تم گھوڑے پر سواری کر سکو گی؟" اس نے کمزور مگر صاف آواز میں کہا۔

"ہاں!"

اس کے فوراً بعد میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور میں نے گھوڑے کا رخ مشرق کی طرف کر کے اسے ایڑ لگائی۔ گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے مالینی کا گھوڑا بھی سرپٹ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ مالینی باگیں تھامے اس پر جم کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ لیکن میرے لئے یہی بہت کافی تھا کہ ہم موت کے تہہ خانے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ خدا جانے یہ گھوڑے کس قسم کی مخلوق تھے۔ مجھے تو جن بھوت لگتے تھے۔ صحرا میں گھوڑے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتے۔ کیونکہ ان کے سم ریت میں دھنستے رہتے ہیں۔ لیکن یہ گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہمیں لے کر صحرا میں بہت دور نکل آئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نقلی فرعون کا اہرام کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب وہ لوگ اگر ہمارے تعاقب میں بھی آتے تو ہمیں نہیں پکڑ سکتے تھے۔ کیونکہ ہمارے گھوڑے ناقابل یقین رفتار کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ مالینی پوری طرح سے چاق وچوبند تھی اور گھوڑے پر تجربہ کار گھوڑ سواروں کی طرح بیٹھی ہوئی تھی- دن کا وقت تھا- سورج کو طلوع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور دھوپ میں ابھی زیادہ تمازت نہیں آئی تھی- ہم ایک دریا کے پاس پہنچ گئے- میں نے گھوڑے کو روک کر دریا کے کنارے کی طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن گھوڑے نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی اور کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑنے کی بجائے دریا میں اتر گیا- میں نے دیکھا کہ میرا گھوڑا دریا کی سطح پر دوڑ رہا تھا- میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا- مالینی کا گھوڑا بھی دریا کی سطح پر دوڑتا چلا آ رہا تھا- میں سمجھ گیا کہ روما کی روح کے بھیجے ہوئے یہ گھوڑے کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہیں- البتہ مالینی ضرور حیران ہو رہی تھی- میں نے دیکھا کہ وہ گھبرا کر بار بار نیچے دریا کی طرف دیکھتی تھی-

دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا- مگر گھوڑے برق رفتاری سے اس کے اوپر سے گزر کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے- دریا کی دوسری جانب ایک باغ تھا جس میں زیتون اور کھجور کے بے شمار درخت تھے- ان درختوں کے جھنڈوں کے نیچے بڑی ٹھنڈی چھاؤں تھی- گھوڑے وہاں جا کر اپنے آپ رک گئے- میں جلدی سے نیچے اترا اور مالینی کے گھوڑے کے پاس جا کر اس کو سہارا دے کر نیچے اتارا- میں نے اس سے پوچھا-

"مالینی! تم ٹھیک ہو ناں؟"

مالینی نے مسکراتے ہوئے کہا-

"میں بالکل ٹھیک ہوں"

پھر اس نے گھوڑوں کی طرف نگاہ ڈالی اور مجھ سے پوچھا-

"مجھے تو یہ اڑنے والے گھوڑے لگتے ہیں- میں نے ایسے گھوڑوں پر کبھی سواری نہیں کی تھی- مجھے ذرا سی بھی تھکان محسوس نہیں ہو رہی"

میں نے کہا- "یہاں ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ جاؤ-"

وہاں درختوں کے نیچے ایک چھوٹا سا صحرائی چشمہ بہہ رہا تھا- صحرا کے چشموں

کا پانی ٹھنڈا میٹھا اور دنیا کا بہترین پانی مانا گیا ہے- ہم نے چشمے پر آ کر منہ ہاتھ دھویا- اس کا ٹھنڈا شربت پانی پیا- اور درختوں کی چھاؤں میں آ گئے- درختوں کے نیچے تازہ پکی ہوئی کھجوریں بے شمار گری پڑی تھیں- میں نے انہیں اٹھا کر جھولی میں ڈالا- چشمے کے پانی سے انہیں دھویا اور مالینی کے پاس لے آیا- مالینی میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی- میں نے کہا-

"بڑی میٹھی کھجوریں ہیں- تمہیں بھی ضرور بھوک لگ رہی ہو گی-"

مالینی کھجوریں کھانے لگی- میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ بار بار میری طرف نظریں اٹھا کر مجھے تعجب کے ساتھ دیکھ رہی تھی- آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا-

"مالینی! ایسے لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو-"

مالینی نے کہا-

"تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے اسے اپنا نام کرستوف ہی بتایا- اس وقت بھی یہی نام میرے ذہن میں تھا- مالینی نے دوسرا سوال کیا-

"تم اصل میں کون ہو؟"

میں نے کہا- "میں کون ہوں؟ میں---- میرا مطلب ہے میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں-"

"نہیں" مالینی نے بڑے یقینی لہجے میں کہا- "تم میری طرح کے عام انسان نہیں ہو- اچھا یہ بتاؤ تم مجھے لے کر موت کے تہہ خانے سے کیسے نکل آئے تھے؟ اس تہہ خانے سے کوئی عام انسان باہر نہیں نکل سکتا- اور پھر یہ گھوڑے کہاں سے آ گئے؟ یہ ہوا سے بھی زیادہ تیز اڑ رہے تھے- یہ دریا کی سطح پر بھی دوڑ رہے تھے- مجھے تم کوئی جن بھوت یا کوئی بہت بڑے جادوگر لگتے ہو-"

جن طاقتوں کا مظاہرہ مجھ سے سرزد ہو چکا تھا ان سے انکار ناممکن تھا- لیکن میں اپنی حقیقت اور اصلیت مالینی پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا- میں نے اسے کہا-

"مالینی! میں تمہارے سامنے اب انکار نہیں کر سکتا تم نے مجھے ٹھیک پہچانا ہے- میرے پاس تھوڑا بہت جادو کا علم ہے- بس اس کی مدد

سے میں تمہیں موت کے تہہ خانے سے نکال لانے میں کامیاب ہوا
ہوں- یہ گھوڑے بھی جادو کے زور سے دوڑ رہے تھے-"

مالینی نے مجھ سے شکایت کرنے کے انداز میں کہا-

"یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟"

میں نے کہا- "میں جس جادوگر کا شاگرد ہوں اور جس سے میں نے تھوڑا
بہت جادو سکھا تھا اس نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ خوامخواہ دوسروں پر ظاہر
نہ کرنا کہ تم ایک جادوگر ہو- بس اس وجہ سے میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا- لیکن
جب ان لوگوں نے ہمیں موت کے منہ میں دھکیلا تھا تو میں نے تمہیں تسلی ضرور دی
تھی کہ فکر نہ کرو- سب ٹھیک ہو جائے گا-

مالینی کو یقین ہو گیا کہ میں واقعی کوئی بہت بڑا جادوگر ہوں- اس زمانے میں
دنیا میں جادو اور طلسم کا عام رواج تھا اور لوگ اس سے مانوس تھے- افریقہ اور بنگال
کے جادوگر تو دنیا میں بہت مشہور تھے اور لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے- جب مالینی کو
یقین آگیا کہ میں کوئی خلائی یا مافوق الفطرت انسان نہیں ہوں اور میں نے جو کچھ بھی کیا
اپنی طلسمی طاقت کی مدد سے کیا ہے تو اس نے پوچھا- کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہ
جادو کے گھوڑے ہمیں کہاں لے جائیں گے-

میں نے کہا-

"میں تو اس ملک میں اجنبی ہوں- محض سیر و سیاحت کے واسطے آیا تھا
کہ مصیبت میں پھنس گیا-"

مالینی نے کہا- "کرستوف! میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی یاد رکھوں گی-
اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو اس وقت میری لاش تہہ خانے میں پڑی ہوتی-"

میں نے کہا- "ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ یہ کونسا علاقہ ہے اور تم کہاں
جانا چاہتی ہو- تاکہ میں تمہیں اپنی حفاظت میں وہاں پہنچاؤں"

اس نے کہا- "ہم ملک مصر سے نکل کر شام کے صحراؤں میں سے گزر رہے
ہیں- میں ملک سوڈان کی رہنے والی ہوں- ملک سوڈان کی سرحد جہاں شروع ہوتی ہے
اس سے بیس پچیس میل دور ایک قصبہ ہے- جس کا نام گھڑالی ہے- یہ بڑا تاریخی

قصبہ ہے اور ملکہ صبا کے زمانے سے آباد ہے- یہاں کے رہنے والے ہزاروں سال
سے آگ اور سانپ کی پوجا کرتے چلے آئے ہیں- قصبے میں ایک بہت قدیم سمندر ہے
جہاں ایک بہت بڑے سانپ شیش ناگ اور اس کی شیش ناگن کے بت رکھے ہیں- ان
کے آگے ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے- میرا باپ اس مندر کا پجاری ہے- میری ماں مر
چکی ہے- مجھے میرے باپ نے ہی پالا ہے جس نقلی فرعون کی میں کنیز تھی اور جو مجھے
سورج دیوتا پر قربان کرنا چاہ رہا تھا وہ ایک بار ہمارے مندر میں اپنے چیلوں کے ساتھ
آیا تھا- میرے باپ پر اس نے اپنی باتوں سے اتنا اثر ڈالا کہ میرے باپ نے مجھے اس
کی لونڈی بنا کر اس کے ساتھ گھر بھیج دیا- تم مجھے میرے باپ کے پاس پہنچا کر بے شک
چلے جانا- میرا باپ بھی تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گا-"

میں نے سوچا کہ میرا اب فرض بنتا ہے کہ اس بے سہارا لڑکی کو اس کے باپ
کے گھر تک پہنچایا جائے- اس کے بعد میں بھی کسی طرف نکل جاؤں گا- میں نے مالینی
سے کہا-

"ٹھیک ہے مالینی میں تمہیں تمہارے پجاری باپ کے پاس پہنچانے کے
بعد کسی دوسرے ملک کی طرف چلا جاؤں گا-"

سورج کافی اوپر آگیا تھا- گرمی کی تمازت بڑھ گئی تھی اور صحرا تپنے لگا تھا-
مجھے تو صحرا کی تپش کی پروا نہیں تھی لیکن مالینی نے کہا-

"ہمیں دھوپ ڈھلنے کا انتظار کر لینا چاہئے- صحرا کی آگ برساتی تپش
میں سفر کرنا مشکل ہو جائے گا-"

میں نے کہا-

"جیسے تمہاری مرضی"

مالینی بولی- "اب ہمیں دشمنوں کا کوئی خطرہ نہیں ہے ہم مصر سے نکل کر ملک
شام میں داخل ہو چکے ہیں اور میرے ملک سوڈان کی سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں
ہے-"

ہم دھوپ ڈھلنے کا انتظار کرنے لگے- اب عجیب اتفاق سے آسمان پر کہیں سے
بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے نمودار ہوئے جنہوں نے آگ برساتے سورج کو

ڈھانپ لیا۔ صحرا میں چھاؤں سی ہو گئی۔ مالینی کہنے لگی۔

"آسمان پر بادل چھا گئے ہیں۔ اب ہم دن کے وقت بھی سفر کر سکتے ہیں۔"

چنانچہ ہم گھوڑوں پر بیٹھ گئے اور ان کا رخ ملک سوڈان کی سرحد کی طرف کر دیا۔ اب مالینی میری راہنمائی کر رہی تھی۔ وہ ان صحراؤں کے حدود اربعے سے واقف تھی۔ گھوڑے اسی طرح ہوا سے باتیں کرتے پوری رفتار سے جا رہے تھے۔ مالینی کا گھوڑا میرے گھوڑے سے چند قدم آگے تھا۔ اس نے میری طرف منہ کر کے بلند آواز میں کہا۔

"کرستوف! تمہارے گھوڑے اپنے آپ میرے ملک سوڈان کی سرحد کی طرف جا رہے ہیں۔"

مجھے معلوم ہو گیا کہ روما کی روح بھی یہی چاہتی ہے کہ میں اس لڑکی کے ساتھ اس کے ملک میں جاؤں۔ شاید اس ملک سوڈان میں میری اپنی دنیا میں واپسی کا کوئی سبب پیدا ہونے والا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے صحرا میں سفر کرنے کے بعد دور سے پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ مالینی اپنا گھوڑا میرے پہلو میں لے آئی۔ کہنے لگی۔

"میرے ملک کی سرحد شروع ہونے والی ہے۔ یہ پہاڑیاں ہمارے تاریخی قصبے گھڑالی کی پہاڑیاں ہیں۔ ہمارا قصبہ ان ہی پہاڑیوں کے دامن میں ہے۔"

کچھ ہی دیر کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں ملک شام کی صحرائی سرحد ختم ہوتی تھی اور سوڈان کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ یہ کوئی قبل از مسیح کا زمانہ نہیں تھا سترھویں صدی کا زمانہ تھا۔ اور ملکوں کی سرحدوں پر باقاعدہ فوج کی چھاؤنیاں ہوتی تھیں۔ خاردار تار لگے ہوتے تھے اور کسٹم والوں کی طرف سے کاغذات کی چیکنگ ہوتی تھی۔ ہمارے پاس کوئی کاغذات وغیرہ نہیں تھے۔ میں نے اس بارے میں مالینی سے بات کی تو وہ بولی۔

"نقلی فرعون جب مجھے لے کر گیا تھا تو اس کے پاس بھی کوئی اجازت

نامہ وغیرہ نہیں تھا۔ وہ دو پہاڑیوں کے درمیان سے ہو کر گزرا تھا۔ وہاں فوج نہیں ہوتی ہم بھی اس طرف سے گزریں گے۔"

دور سے شام کی سرحد چوکی کی عمارت نظر آنے لگی تھی۔ مالینی نے گھوڑے کو دائیں جانب والی دو پہاڑیوں کی طرف موڑ دیا۔ ان پہاڑیوں کے درمیان ایک راستہ بنا ہوا تھا جہاں بہت زیادہ جھاڑیاں وغیرہ اگی ہوئی تھیں۔ مالینی نے قریب پہنچ کر گھوڑے کو جلدی سے ایک ریتلے ٹیلے کی اوٹ میں کر لیا۔ میں بھی گھوڑا اس کے پیچھے لے آیا۔

"کیا بات ہوئی ہے مالینی؟"

میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔ کہنے لگی۔

"وہاں سرحدی فوج کے دو سپاہی کھڑے ہیں۔ تم نے انہیں نہیں دیکھا؟"

میں نے کہا۔ "آؤ پھر کیا ہوا۔ تم چلو۔ مجھے یقین ہے کہ میرے جادو کی وجہ سے ہم انہیں نظر نہیں آئیں گے۔"

مالینی میرا منہ تکنے لگی۔ اسے کچھ یقین آ رہا تھا۔ کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ان گھوڑوں کی طلسمی طاقت پر یقین تھا۔ یہ گھوڑے روما کی روح نے بھیجے تھے اور حیرت انگیز طلسمی قوت کے مالک تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہم ان پر سوار ہو کر وہاں سے گزرے تو سپاہی ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں نے مالینی سے کہا۔

"تم میرے پیچھے آ جاؤ۔ میں گھوڑا بڑھانے لگا ہوں۔"

مالینی اپنے گھوڑے کو میرے پیچھے لے آئی۔ میں منے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو وہ چل پڑا۔ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد گھوڑوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ پہاڑیوں کے نزدیک آ کر میں نے دیکھا کہ واقعی وہاں آمنے سامنے دو سپاہی بندوقیں اٹھائے پہرہ دے رہے تھے۔ یہ اس زمانے کی سرحدی پولیس کے سپاہی تھے اور ان کی بندوقیں لمبی نالیوں والی توڑے دار بندوقیں تھیں جس میں ایک فائر کے بعد دوسری بار دوبارہ بارود بھرنا پڑتا تھا۔ ہم ذرا آگے گئے تو دیکھا کہ وہاں کچھ اور سپاہی بندوقیں اٹھائے پہرہ دے رہے تھے۔ میں دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ یااللہ پاک اس

مصیبت سے خیروعافیت سے نکال دینا- خدا نے میری دعا قبول کر لی- اور ہمارے گھوڑے سپاہیوں کے درمیان سے نکل گئے اور ان میں سے کسی نے بھی نہ تو ہمارے گھوڑوں کو دیکھا اور نہ انہوں نے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ہی سنی- ہم پہاڑیوں کے درمیانی راستے میں سے گزرتے ہوئے سوڈان کی سرحد پار کر گئے-

دوسری جانب کھلے میدان میں پہنچنے کے بعد مالینی نے کہا-

"کرستوف! تمہارے جادو نے ایک بار پھر ہمیں بچا لیا ہے-"

میں نے دل میں کہا کہ بچانے والی تو خدا کی ذات ہے- یہ جادو کیا چیز ہوتی ہے- اور وہ جادو کا کرشمہ تھا بھی نہیں- وہ بھی روما کی محبت کا روحانی کرشمہ تھا- آدمی کی محبت سچی اور پاکیزہ ہو تو اس پر آئی ہوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی ٹل جاتی ہے- ہم گھوڑے دوڑاتے اس علاقے میں پہنچ گئے- جہاں مالینی کے قصبے کی پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں- یہ خشک بھورے رنگ کی پہاڑیاں تھیں- ان کے درمیان وادی میں لہلہاتے کھیت اور بڑا سبزہ تھا- ہم ایک نہر کے قریب سے گزرے جس کے دونوں کناروں پر اونچے گنجان درخت جھکے ہوئے تھے- میں نے مالینی سے کہا-

"تمہارا قصبہ سچ مچ بہت خوبصورت ہے-"

مالینی نے کہا- "یہ ملکہ صبا کے زمانے سے ہی ایسا ہے"

ہمارے گھوڑے اب قدم قدم چل رہے تھے- ایک جانب پہاڑی کی ڈھلان پر بے شمار مکان ساتھ ساتھ کھڑے تھے- یہ مکان ڈھلان سے نیچے وادی میں بھی دور دور تک پھیلے ہوئے تھے- ایک جگہ بہت اونچا چوکور مینار نظر آیا- مالینی نے وہ مینار دکھاتے ہوئے کہا-

"یہ ہمارے دیوتا شیش ناگ کا مندر ہے- اس مندر کے پیچھے ہمارا گھر ہے- میرے بابا مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوں گے-"

"ہم مندر کے قریب سے گزرے تو میں نے دیکھا کہ اس کا اونچا دروازہ پرانے طرز کا قلعہ نما دروازہ تھا- اس مندر کے دیوتا کو ماننے والے مرد اور عورتیں پوجا پاٹھ کے لئے مندر میں داخل ہو رہی تھیں- مالینی مجھے اپنے گھر کے آگے لے آئی- اس نے گھوڑے سے اترتے ہوئے اپنے بابا کو آواز دی اور مکان کے

دروازے کی طرف بڑھی- اس کی آواز سن کر صحن میں ایک مضبوط اور بھاری جسم والا بوڑھا نمودار ہوا اس نے مالینی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بار بار اس کا ماتھا چومنے لگا- یہ مالینی کا پجاری باپ تھا- مالینی نے اس سے میرا تعارف کرایا- اور سارا واقعہ سنایا-

"بابا! یہ ہمارے دوست کرستوف ہیں- انہوں نے ہی مجھے اس منحوس نقلی فرعون کی قید سے نکال کر یہاں پہنچایا ہے-"

پجاری نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا اور مالینی سے کہا-

"بیٹی! تم فکر نہ کرو- میں اس نقلی فرعون سے ایسا بدلہ لوں گا کہ اس کی سات پشتیں یاد رکھیں گی- چلو صحن میں چلو-"

صحن میں ایک درخت کی چھاؤں میں لکڑی کا تخت بچھا تھا- دو تین نوکر اور خادمائیں مختلف کام کر رہی تھیں- مالینی کو دیکھ کر وہ بھی بہت خوش ہوئیں اور اپنی زبان میں اس کی خیریت دریافت کرنے لگیں- رات کو مندر میں شیش ناگ کی پوجا پاٹھ شروع ہوئی تو میں بھی یہ تماشا دیکھنے مندر میں موجود تھا- مالینی بھی اپنے باپ کے ساتھ بیٹھی منتروں کا جاپ کر رہی تھی- کمرے کے وسط میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں آگ روشن تھی- سامنے ایک چبوترے پر شیش ناگ سانپ اور اس کی شیش ناگن کی مورتیاں تھیں- مورتیاں پتھر کی تھیں اور دونوں سانپوں کی مورتیوں کی آنکھوں میں سرخ نگینے آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے- جب پوجا پاٹھ کی رسومات اپنے عروج پر تھیں تو مالینی کے پجاری باپ نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا-

"شیش ناگن کا رقص شروع کیا جائے-"

اس کے ساتھ ہی مندر کے پرانے ستونوں کے پیچھے سے گھنگھروؤں کے چھناکے کے ساتھ ایک نرتکی یعنی رقاصہ رقص کرتی نمودار ہوئی- اس نے چمکیلا نیلا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا- اس کے سر پر سانپ کا پھن بنا ہوا تھا- وہ تھرکتی، رقص کرتی، بازوؤں کو اور جسم کو سانپ کی طرح لہراتی مالینی کے پجاری باپ کے سامنے آ گئی- اس نے سر جھکا کر پجاری کی تعظیم کی اور پھر شیش ناگ اور شیش ناگن کی مورتیوں کے سامنے رقص کرنے لگی- رقص کرتی کبھی وہ سانپوں کی

مورتیوں کے قریب جا کر اپنا سانپ کے پھن والا سر جھکا دیتی اور پھر ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر منہ سے پھنکار کی آواز نکالتی اور ایک دم پیچھے ہٹ کر زمین کی طرف دیکھ کر نظر نہ آنے والے کسی دشمن کو لپک کر ڈستی اور جسم کو سانپ کی طرح لہراتی پیچھے ہی پیچھے ہٹنے لگتی۔ کبھی وہ فرش پر لیٹ کر سانپ کی طرح بل کھانے اور لہرانے لگتی۔ اس کے رقص نے سب لوگوں پر ایک جادو سا کر دیا۔ میں خود اس نرتکی کے رقص سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ میری نگاہیں اس پر مسلسل جمی ہوئی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ نرتکی بھی رقص کرتے کرتے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ جب وہ میری طرف دیکھتی اور ہماری آنکھیں چار ہوتیں تو کبھی اس کی آنکھیں غضبناک ہوتی۔ کبھی اس کی آنکھوں میں میرے لئے رحم اور محبت کے تاثرات ہوتے اور کبھی وہ میرے قریب آکر اپنے پھن دار سر کو اس طرح میری طرف جھٹکا دے کر بڑھاتی جیسے مجھے ڈس رہی ہو۔ مجھے وہ نرتکی اچھی بھی لگ رہی تھی اور مجھے اس سے کچھ کچھ خوف سا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ غضبناک نظروں سے مجھے دیکھتی تو ایسے لگتا جیسے وہ ناگن ہے اور ایک ہی وار میں مجھے ڈس کر ہلاک کر دے گی اور جب وہ رحم اور محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں میرے لئے پیار کا سمندر موجزن ہو جاتا۔ مجھ پر اس رقاصہ کے متضاد جذبات کا گہرا اثر ہو رہا تھا۔ جب اس کا رقص ختم ہو گیا تو اس نے مالینی کے پجاری باپ کے سامنے جا کر ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور خاموشی سے گھنگھرو چھنکاتی جدھر سے آئی تھی۔ اس طرف چلی گئی۔

وہ تو چلی گئی لیکن مجھ پر اپنے غضبناک طلسمی رقص سے ایک جادو سا کر گئی۔ پوجا کی رسومات ختم ہوئیں تو میں نے باتوں ہی باتوں میں مالینی سے رقاصہ کا ذکر کیا کہ اس کا رقص بہت غضب کا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"اسکا نام شکتی ہے۔ وہ شیش ناگن کی بڑی زبردست پجارن ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ اس مندر میں کب سے رقص کر رہی ہے۔"

مالینی نے کہا۔

"اسے پانچ چھ سال ہی ہوئے ہیں۔ یہ ملک ہندوستان سے آئی تھی۔

ایک رات اس نے مندر میں رقص کیا اور میرے باپ نے اسے مندر میں ہی رکھ لیا۔ اس کے ماں باپ کا ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اس نے بھی کبھی نہیں بتایا وہ مندر میں کسی سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔ اس وجہ سے وہ بڑی پراسرار لگنے لگی ہے۔ مندر کی دوسری پجارن لڑکیوں میں یہ افواہ بھی مشہور ہے کہ شکتی رقاصہ شیش ناگن کا دوسرا جنم ہے۔ مگر تم اس کے بارے میں اتنا کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔"

مالینی بھی مسکرا دی۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ کیا میں اپنے طور پر اس مندر سے نکل کر ملک ہندوستان کی طرف روانہ ہو جاؤں یا وہیں مندر میں رہ کر کسی سبب کے پیدا ہونے کا انتظار کروں۔ یعنی حالات ایسی صورت اختیار کر جائیں کہ مجھے وہاں سے نکلنا پڑے۔ کیونکہ میں حالات کے رحم و کرم پر تھا۔ مجھے یورکا اور سمارا نے بھی بتایا تھا کہ میرے اپنی دنیا میں واپس جانے کے حالات اپنے آپ پیدا ہوتے چلے جائیں گے اور یہ کہ مجھے از خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔

میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ روز مندر میں ٹھہر جانا چاہئے۔ مالینی اور اس کا باپ مجھے میرے نام کرستوف کی وجہ سے عیسائی سمجھ رہے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے میرے مندر کی پوجا پاٹھ کی رسومات میں شریک نہ ہونے پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں بھی چپ تھا۔ کیونکہ میرے دین میں بھی بتوں کی پوجا حرام تھی اور وہ اگر کہتے بھی تو میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ لیکن مالینی اور اس کے باپ نے مجھے کبھی ایسا نہیں کہا تھا
جس روز شکتی رقاصہ نے مندر میں رقص کیا اس کی دوسری شام کا ذکر ہے کہ میں مندر کے پچھواڑے وادی میں ایک چشمے کے پاس بیٹھا اپنے خیالات میں گم تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو رقاصہ شکتی آہستہ آہستہ چلی آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی چھوٹی سی ٹوکری تھی جس میں وہ پھول توڑ توڑ کر رکھ رہی تھی۔ وہ مجھ پر گہری نگاہ ڈالتی ہوئی آگے نکل گئی۔ میں بیٹھا اسے جاتے دیکھا رہا۔ جب وہ میرے قریب سے گزری تھی تو مجھے عنبر اور لوبان کی خوشبو آئی تھی۔ یہ خوشبو جنوبی ہند کے مندروں سے آیا کرتی ہے۔ شکتی کے بارے میں ہی مجھے

مالینی نے بتایا تھا کہ وہ جنوبی ہند سے آئی ہے۔

شکتی رقاصہ ایک جگہ جھاڑیوں میں جھک کر پھول توڑ کر ٹوکری میں رکھ رہی تھی۔ میں اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ شاید شکتی کو محسوس ہو گیا تھا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ جب وہ جھاڑیوں سے آگے جانے لگی تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور آگے چل دی آگے وادی کی چھوٹی سی ڈھلان تھی۔ وہ ڈھلان میں اتر کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ جانے کیوں میں بے چین ہو گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر جھاڑیوں کے پاس گیا اور نیچے ڈھلان کی طرف دیکھا۔ شکتی یہیں سے نیچے اتری تھی۔ نیچے ڈھلان دور وادی کے کنارے تک چلی گئی تھی۔ مگر شکتی مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ وہ ابھی تو ڈھلان میں اتری تھی۔ ڈھلان کافی نیچے تک گئی ہوئی تھی اور ڈھلان پر جھاڑیاں بھی کہیں کہیں تھیں۔ اسے نظر آنا چاہئے تھا۔ اتنی جلدی کوئی دوڑ کر بھی ڈھلان سے نہیں اتر سکتا تھا۔ خدا جانے شکتی کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میری بے تاب نگاہیں اسے دور نیچے وادی تک تلاش کر رہی تھیں۔ مگر شکتی مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ میں واپس آ گیا۔

رات کو بھی جب مندر میں پوجا پاٹھ ہو رہی تھی تو میری آنکھیں شکتی کو تلاش کرتی رہیں مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ پوجا کی رسومات ختم ہونے کے بعد میں پجاری کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ مالینی بھی وہیں بیٹھی تھی۔ میں نے بڑے طریقے سے شکتی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے کہا۔

بابا! میں بھی ملک ہند کا رہنے والا ہوں اور سیر و سیاحت کے شوق میں گھر سے نکلا ہوں۔ ملک ہند کے جنوبی مندروں میں ناگ دیوتا کی بہت پوجا ہوتی ہے۔"

پجاری بولا۔ "تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔ اصل میں ناگ دیوتا کا بڑا مندر جنوبی ہند میں ہی ہے۔ میں وہاں کی تین مرتبہ یاترا کر چکا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "وہاں کی دیوداسیاں ناگ کی مورتی کے آگے ساری ساری رات رقص کرتی ہیں وہ ناگ رقص کی بڑی ماہر ہوتی ہیں۔"

میری ترکیب کام کر گئی۔ پجاری نے خود ہی شکتی کا ذکر کر دیا اور کہا۔

"ہمارے مندر کی شکتی نرتکی بھی جنوبی ہند کے بڑے مندر میں رقص کیا کرتی تھی۔ میری فرمائش پر وہ ہمارے مندر میں آ گئی اور چھ سات برس سے ہمارے مندر میں ہی رقص کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا وہ روز رقص کرتی ہے؟"

پجاری نے کہا۔ "نہیں ایسا نہیں ہے۔"

سوموار ناگ دیوتا کا دن ہوتا ہے۔ وہ صرف سوموار کی رات کو ہی رقص کرتی ہے۔ ہم نے اسے مندر کے پیچھے رہنے کے لئے ایک کوٹھڑی دے رکھی ہے۔ وہ اس کوٹھڑی میں رہتی ہے۔ اسے اکیلی رہنے کی عادت ہے۔ مندر کی دوسری پجارنوں سے بھی زیادہ نہیں ملتی۔ صرف سوموار کی رات کو تیار ہو کر نکلتی ہے اور شیش ناگ کے سامنے رقص کرتی ہے۔ اس کے رقص کی وجہ سے دوسرے قصبوں کے لوگ بھی ہمارے مندر میں پوجا پاٹھ کرنے آتے ہیں۔"

اب مجھے سوموار کی رات کا انتظار تھا۔ سوموار میں ابھی چار دن باقی تھے۔ پتہ نہیں کیوں یہ رقاصہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ اس دوران میں ادھر ادھر منڈلاتا مندر کے پچھواڑے اس کوٹھڑی کا بھی دور سے مشاہدہ کرتا رہا جہاں رقاصہ شکتی رہتی تھی۔ کوٹھڑی کے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن بھی خالی پڑا رہتا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بھی بند ہوتا تھا۔ دن میں ایک دو چکر میں رقاصہ کی کوٹھڑی کے ضرور لگا لیتا مگر وہ مجھے ایک بار بھی نظر نہ آئی۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر میں ٹھیک اس وقت چشمے کے کنارے جا کر بیٹھ گیا جہاں رقاصہ شکتی اسی روز پھول توڑنے آئی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ وہ نہ آئی۔ دوسرے دن بھی عین اس وقت چشمے پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ پھر بھی نہ آئی۔ جیسے جیسے اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی میری بے چینی اور اس کو دیکھنے کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر سوموار کا دن آ گیا۔

اس روز میں بڑا خوش تھا کہ آج تو رقاصہ شکتی کا ضرور دیدار نصیب ہو گا۔ میں بے تابی سے رات کا انتظار کرنے لگا۔ آخر دن غروب ہو گیا۔ پھر رات کا پہلا پہر

شروع ہو گیا۔ مندر میں پوجا پاٹھ زوروں پر تھا۔ رقاصہ شکتی کا رقص دیکھنے بڑے عقیدت مند عورتیں اور مرد آئے ہوئے تھے۔ میں بھی مندر کے بڑے کمرے میں ایک جگہ بیٹھ گیا تھا۔ لوگ شیش ناگ اور شیش ناگن کی مورتیوں کو ماتھا ٹیک کر ان پر پھول اور روپے پیسوں کا نذرانہ چڑھا رہے تھے۔ مجھے ان سانپوں کی مورتیوں اور ان کی فضول رسموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری نگاہیں اس طرف لگی ہوئی تھیں جس طرف سے گذشتہ سوموار کو رقاصہ شکتی رقص کرنے کے لئے نمودار ہوئی تھی۔

آخر وہ گھڑی بھی آ گئی جب مندر کے سازندوں نے ساز چھیڑ دیئے گھنٹیاں، ڈفلیاں اور شہنائیاں بجنے لگیں۔ ان کی دھن پر اچانک ستونوں کے پیچھے سے رقاصہ شکتی رقص کرتی نمودار ہوئی اس کے آتے ہی لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ صرف ساز بج رہے تھے۔ ان کی تھاپ پر رقاصہ شکتی پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کو چھنکاتی اور رک رک کر تھرک تھرک کر لہراتی، بل کھاتی مورتیوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے وہی نیلے رنگ کا ریشمی چمکیلا لباس پہنا ہوا تھا جو اس کے جسم کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ سر پر سانپ کا پھن لگا ہوا تھا۔ اس کا سنگار غضب کا تھا۔ وہ آکاش کی کوئی اپسراء معلوم ہو رہی تھی۔ ہندو دیومالا کے مطابق اپسراء آکاش کی ڈانسروں کو کہتے ہیں جو بادلوں میں رہنے والے دیوتاؤں کے آگے رقص کرتی ہیں۔ اس نے بالوں میں سرخ گلاب کے پھولوں کا جوڑا باندھ رکھا تھا۔ ہاتھوں کی کلائیوں پر بھی سرخ گلاب کے گجرے باندھے ہوئے تھے۔ وہ عجیب شان سے شیش ناگ اور شیش ناگن کی مورتیوں کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

اس نے تین بار مورتیوں کے آگے سر جھکایا۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ پیچھے ہٹی اور اس نے اپنا طلسمی رقص شروع کر دیا۔ ساز بج رہے تھے۔ مورتیوں کے آگے دیئے روشن تھے۔ بڑا پجاری اشلوک پڑھتے ہوئے آگ میں عنبر اور لوبان ڈالتا جا رہا تھا۔ فضا عنبر اور لوبان کی خوشبوؤں سے بوجھل ہونے لگی تھی۔ رقاصہ شکتی کا سانولا چہرہ آگ کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔ وہ رقص کرتی ہوئی مورتیوں کے پاس آتی۔ سر کو جھکاتی اور پھر رقص کرتی، گھنگھرو چھنکاتی الٹے قدموں سے پیچھے ہٹتی چلی جاتی۔ پھر ایک دائرے میں گھوم جاتی اور اپنے جسم کو سانپ کی طرح لہرانے لگتی۔ سازوں کی لے

آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ رقص بھی تیز ہونے لگا۔ رقاصہ شکتی والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھی۔ رقص کرتے کرتے وہ وہاں آ گئی جہاں میں بیٹھا تھا۔ اس نے رقص کرتے ہوئے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ذرا سا مسکرائی اور تیزی سے گھوم گئی۔ گھومتے ہوئے اس نے اپنی کلائی کا رخ میری طرف کر کے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کی کلائی سے گلاب کا ایک سرخ پھول ٹوٹ کر میری جھولی میں آن گرا۔ شاید یہ اتفاق تھا۔ شاید شکتی نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا۔ میں نے چپکے سے گلاب کا پھول اٹھا لیا۔ شکتی پاؤں تھرکاتی رقص کے دائرے بناتی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئی اور کمرے کے وسط میں آ کر پورے جوش سے ناچنے لگی۔ اب اس کا جسم سانپ کی طرح لہرا رہا تھا۔ شاید وہ سانپ کا ناچ ناچ رہی تھی۔ ناچتے ناچتے وہ فرش پر لیٹ گئی۔

فرش پر لیٹے لیٹے وہ ایک ایسی ناگن کی طرح زمین سے اچھل اچھل کر تڑپ تڑپ کر گول دائرے میں چکر لگانے لگی جس کا ناگ اس سے بچھڑ گیا ہو۔ اس کے بعد وہ دونوں بازوؤں کو لہراتی ہوئی اٹھی اور رقص کی دھن پر تیزی سے دوڑتی ہوئی مورتیوں کے سامنے آ کر ہاتھ باندھ کر جھک گئی۔ رقص ختم ہو گیا تھا۔ ساز خاموش ہو گئے تھے۔ ماحول پر کچھ دیر کے لئے سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر عقیدت مند عورتوں اور مردوں نے اونچی آواز میں اشلوک گانے شروع کر دیئے۔ رقاصہ شکتی کا سانولا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتی ستونوں کے پیچھے جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

گلاب کا پھول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں ایسے ساکت بیٹھا تھا جیسے مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ یہ شکتی کے رقص کا جادو تھا۔ اچانک مالینی نے پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ مالینی مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"پوجا ختم ہو گئی ہے کرستوف! آ جاؤ"

میں اس کے ساتھ چلتا مندر کے بڑے کمرے سے باہر نکل آیا۔ مندر کے باہر خوب روشنی ہو رہی تھی۔ پوجا کرنے والی عورتیں اور مرد اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ ایک طرف چھوٹے سے باغیچے میں بانس کی تین چار کرسیاں پڑی تھیں۔

ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ مالینی نے میرے ہاتھ میں گلاب کا پھول دیکھ لیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"یہ پھول تمہارے پاس کیسے آ گیا؟"

میں نے کہا۔

"شکتی جب رقص کرتی ہوئی میرے قریب سے گزری تھی تو یہ پھول اس کے گجرے میں سے ٹوٹ کر میری جھولی میں آن گرا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ بڑا خوبصورت پھول ہے۔"

میں نے مالینی کو پھول دکھایا۔ اس نے پھول کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔

"لگتا ہے تم شکتی کو پسند آ گئے ہو۔ یہ پھول اتفاق سے تمہاری جھولی میں نہیں گرا۔ اس نے جان بوجھ کر تمہاری طرف پھینکا ہے۔"

مالینی کے اس جملے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ رقاصہ شکتی کو میں پسند آ گیا تھا۔ لیکن میں اپنے دل کی بات مالینی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"یہ تمہارا خیال ہے مالینی! شکتی کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ میری طرف جان بوجھ کر پھول پھینکتی۔"

مالینی نے کہا۔ "میں نے کہا نا کہ تم اسے پسند آ گئے ہو۔ یہ قدرتی بات ہے۔ تم خوش شکل ہو۔ جوان ہو۔ ہو سکتا ہے شکتی تمہیں پسند کرنے لگی ہو۔"

میں نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں مالینی! میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اور فرض کر لیا اگر وہ مجھے پسند بھی کرنے لگی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پسند کرنے کو تو میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔"

مالینی کہنے لگی۔ "ہمارے ایک دوسرے کو پسند کرنے اور نرتکی شکتی کے تمہیں پسند کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو" میں نے کہا مالینی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کہنے لگی۔ مجھے کوئی حق تو نہیں ہے کہ میں تمہیں کسی چیز سے روکوں یا منع کروں۔

لیکن تمہارے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے میں تمہیں اتنا ضرور کہوں گی کہ اسی رقاصہ شکتی کو زیادہ اپنے قریب مت آنے دینا۔"

جب آدمی پر نوجوانی کی محبت کے جذبات کا غلبہ ہو تو اس قسم کی نصیحتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں نے بھی مالینی کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اور اس کوشش میں رہا کہ کسی طریقے سے شکتی سے ملاقات ہو جائے۔

یہ رقص والی رات کے تیسرے دن کی بات ہے۔

چاندنی رات تھی۔ میں کوٹھڑی کے باہر چھوٹے صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ رات بڑی خوشگوار تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سوڈان میں گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ فضا پر ایک سکوت سا طاری تھا۔ میری چارپائی کے قریب ہی ایک درخت تھا جس کے زرد پتے سارا دن گرتے رہتے تھے۔ مجھے ہلکی ہلکی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی۔ میں نے اس آواز پر کان لگا دیئے۔ آواز رک گئی۔ چند سیکنڈ کے بعد پھر وہی آواز سنائی دی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی درخت کے نیچے بکھرے ہوئے خشک پتوں پر سے گزر رہا ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے گردن موڑ کر درخت کی طرف نگاہ ڈالی۔ چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ درخت کے نیچے کوئی نہیں تھا۔ آواز ایک بار پھر رک گئی تھی۔

میں نے کوئی خیال نہ کیا اور رقاصہ شکتی کے تصور میں آنکھیں بند کر کے اس کے حسین تصور سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی کے گرم سانس کی حرارت محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے باقاعدہ اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا تھا اور کسی کے سانس لینے کی آواز بھی آئی تھی۔ یہ کیا معمہ تھا۔ میرے اردگرد ضرور کوئی پراسرار چیز موجود تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنی انگلی کی انگوٹھی کو دیکھا۔ انگوٹھی میری انگلی میں موجود تھی۔ ہر طرف چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں وہاں کوئی انسان دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ گرم علاقہ ہے۔ کسی طرف سے گرم ہوا کا کوئی جھونکا میرے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا ہو گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں لیٹ گیا۔ شکتی کا تصور کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیند تو مجھے آ نہیں رہی تھی۔ حسین رقاصہ شکتی کے تصور میں ہی گم تھا۔ لیکن میرے دل کو ہلکی سی بے چینی ضرور لگ گئی تھی۔ شکتی کا تصور بار بار منتشر ہو جاتا تھا۔

میں چارپائی سے اٹھ کر صحن میں تھوڑی دیر ٹہلتا رہا۔ قریب ہی مندر کا ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں مندر میں پوجا پاٹھ کے واسطے گیندے اور گلاب کی کیاریاں تھیں۔ اس باغیچے کی طرف سے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں باغیچے میں آ گیا اور گلاب کے پھولوں کی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ چاندنی میں گلاب کے سرخ پھول بڑے خوش نما لگ رہے تھے۔ میں نے ایک پھول کو انگلی سے چھوا۔ وہ شبنم میں بھیگا ہوا تھا۔ عین اس وقت مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔

میرے پیچھے رقاصہ شکتی کھڑی تھی۔ اس کے کھلے بالوں میں گلاب کے سرخ پھول سجے ہوئے تھے اور کلائیوں میں بھی گلاب کے گجرے تھے۔ شکتی نے خواب آلود آواز میں کہا۔

"تمہیں گلاب کے پھول پسند ہیں۔ مجھے معلوم ہے"

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ صرف اتنا یاد تھا کہ میری محبت، میری محبوبہ شکتی میرے سامنے کھڑی ہے اور مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے گلاب کے سرخ پھول اچھے لگتے ہیں"

"مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ مجھے چاندنی رات میں باغیچے کی سیر کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔ میں چاندنی رات میں یہاں رات کو سیر کرنے ضرور آتی ہوں۔"

وہ آگے کو چل پڑی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کہا۔

"میں نے ایسی حسین چاندنی رات پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

رقاصہ شکتی نے میری طرف دیکھا۔

"مجھے تم ملک ہندوستان کے رہنے والے لگتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تم نے بالکل ٹھیک پہچانا ہے۔ میں ملک ہندوستان سے شام،

مصر اور افریقہ کی سیر و سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔ اس مندر میں میں نے تمہارے ناگ رقص کی بڑی شہرت سنی تھی۔ پس تمہارا رقص دیکھنے کی ہی خواہش تھی۔"

"پھر کیسا لگا تمہیں میرا رقص؟" شکتی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "تمہارا رقص حیرت انگیز تھا۔ بہت اچھا لگا۔"

شکتی نے کہا۔

"میں نے بھی تمہیں دیکھ لیا تھا۔ مجھے بھی تم اچھے لگے تھے۔"

شکتی میری محبوبہ کے اس جملے نے میرے اندر ایک روشنی سی پھیلا دی۔ ایسے لگا جیسے میرے اندر چاند طلوع ہو گیا ہو اور میرے دل دماغ میں اس کی چاندنی پھیل گئی ہو۔ سچ ہے۔ عشق و محبت میں انسان کو سوائے عشق و محبت کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ دنیا کی ہر شے اس کے مقابلے میں ہیچ لگتی ہے۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک پرانی بارہ دری کے پاس آ گئے جس پر جنگلی گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ان بیلوں میں سفید جنگلی گلاب کھلے ہوئے تھے۔ شکتی بارہ دری کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے سانس بھر کر کہا۔

"میں نے تمہاری طرف گلاب کا پھول پھینکا تھا اس وقت میں رقص میں گم تھی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں شکتی! میں نے وہ پھول سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

رقاصہ شکتی نے اپنا دلکش سانولا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے میرا نام لیا۔ مجھے تمہاری زبان سے اپنا نام بڑا اچھا لگا ہے۔"

شکتی کے اس جملے نے میرے اندر محبت کا ایک طوفان سا بپا کر دیا۔ میری اس وقت کی کیفیت کو وہی نوجوان محسوس کر سکتے ہیں جو کسی لڑکی سے دل و جان کے ساتھ محبت کرتے ہوں۔ شکتی پھر کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔ "میں جاتی ہوں۔"

وہ مندر کی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چل پڑی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ مندر کے پیچھے اس کی کوٹھڑی تھی۔ مندر کی دیوار کے پاس آ کر وہ رک گئی۔ اس نے اپنی سیاہ مقناطیسی آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ایک ایسے لہجے میں جس

میں دعوت محبت تھی کہا۔

"میں کل اس وقت پھر باغ کی سیر کرنے آؤں گی۔ کیا تم آؤ گے؟"

مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

"ضرور آؤں گا۔"

وہ چلی گئی۔ میں دیر تک اسی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔

جب شکتی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں بھی اپنی کوٹھڑی کی طرف آ گیا۔ مجھے اس وقت اپنے آپ پر ایک ایسے خوش نصیب انسان کا گمان ہو رہا تھا جس نے ساری دنیا کو فتح کر لیا ہو۔ میں صحن میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ میرا دل شکتی کی محبت سے سرشار تھا۔ شکتی نے مجھے کل رات پھر باغ میں بلایا تھا۔ اس سے زیادہ میری اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔ مجھے چاندنی پہلے سے زیادہ حسین نظر آنے لگی تھی۔

نیند کی نہ مجھے حاجت تھی اور اس وقت مجھے خوشی کے مارے نیند آ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹے لیٹے کل رات کے تصور سے خوش ہوتا رہا۔ رات گزر گئی۔ میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ دن نکلتے ہی میں نے رات کا انتظار شروع کر دیا۔ مالینی سے مندر کے صحن میں ملاقات ہو گئی۔ وہ باغ سے مندر میں پوجا پاٹھ کے لئے پھول چن کر لا رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"رات اچھی گزری؟"

میں نے کہا۔ "بہت اچھی"

کہنے لگی۔ "گھر چلو۔ ہم مل کر ناشتہ کریں گے۔ میں پھول بابا کو دے کر آتی ہوں۔"

میں پجاری کے مکان کے صحن میں جا کر بیٹھ گیا۔ اندر کی جانب چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے میں سے برتنوں کو صاف کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ حبشی نوکرانی ناشتہ وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ میں نے رقص کی رات کو شکتی کا دیا ہوا گلاب کا سرخ پھول اپنی قمیض کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ میں یہ پھول مالینی کو نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں اسے یہ پھول دکھادوں۔ لیکن جب اس نے مجھے نصیحت کی کہ میں رقاصہ شکتی سے دور رہوں تو میں نے ارادہ بدل لیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد مالینی آ گئی۔ میں صحن میں بانس کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے کچن میں کام کرتی خادمہ کو آواز دے کر کہا کہ ناشتہ باہر لے آؤ۔ وہ میرے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ اسے یہ بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ رات میری رقاصہ شکتی سے ملاقات ہوئی تھی۔ میری محبت کی نشانی گلاب کا سرخ پھول میری جیب میں تھا جس کی ہلکی ہلکی خوشبو کسی وقت مجھے آ جاتی تھی۔ مالینی کی نگاہیں بڑی تیز تھیں۔ کہنے لگی۔

"کیا بات ہے۔ آج تم بڑے خوش خوش نظر آتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کو تم نے ضرور کوئی بڑا اچھا خواب دیکھا ہے۔"

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"رات کو تو مجھے کوئی خواب آیا ہی نہیں۔ میں اس لئے خوش ہوں کہ میرا یہاں دل لگ گیا ہے۔ تمہارا وطن سوڈان مجھے بہت اچھا لگا ہے یہاں کی آب و ہوا بالکل میرے اپنے وطن کی طرح ہے۔"

مالینی بولی۔ "یہاں کے لوگ بھی بڑے اچھے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں۔ تمہارے وطن کے لوگ واقعی بڑے مہمان نواز اور محبت کرنے والے ہیں۔"

اس پر مالینی نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ تم نے تو یہاں کے لوگوں کی محبت دیکھی ہی نہیں۔"

میں مالینی کے دل کی بات نہ سمجھ سکا تھا۔ میں نے کہا۔

"انسان کو ویسے بھی محسوس ہو جاتا۔ مجھے ابھی تک یہاں کے جتنے لوگ ملے ہیں انہوں نے مجھ سے بڑی خوش اخلاقی کا سلوک کیا ہے۔"

مالینی خاموش ہو گئی۔ نوکرانی ناشتہ لے آئی۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مالینی مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے لیکن وہ اس کا موقع تلاش کر رہی ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید یہی پوچھنے والی ہو گی کہ اب آگے میرا

کیا پروگرام ہے اور میرا وہاں کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے وغیرہ وغیرہ اس نے میری پیالی میں چائے ڈالی تو میں نے کہا۔

"یہاں کی چائے بڑی خوشبودار اور خالص ہوتی ہے۔ مجھے یہاں کی چائے بے حد پسند ہے۔ مالینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں کی اور بھی چیزیں بڑی اچھی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو یہاں کی ہر شے اچھی لگتی ہے۔"

"تمہیں میں کیسی لگتی ہوں؟"

یہ سوال مالینی نے اچانک کر دیا تھا۔ مجھے اس سے اس سوال کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اب میں اس کے دل کی بات پا گیا تھا۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنے کی اس وقت سے کوشش کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"تم بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" مالینی نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ "اس میں جھوٹ کی کونسی بات ہے۔ تم ہو ہی بڑی اچھی لڑکی"

مالینی نے چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے کبھی یہ بات مجھے نہیں بتائی کہ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تم اچھی ہو۔ کیا اتنا ہی کافی نہیں ہے؟"

وہ بولی۔ "نہیں۔ تم بھول رہے ہو۔ عورت مرد کی زبان سے سننا چاہتی ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے۔"

وہ مجھے گھیر کر اپنے مطلب کی بات کی طرف لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور میں اس سے دور رہنے کی کوشش میں لگا تھا۔ میں نے کہا۔

"چلو میں نے اب کہہ دیا ہے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ اب تمہیں خوش ہو جانا چاہئے۔"

اب وہ جن نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی ان میں محبت صاف طور پر عیاں

تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بھی مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔ بلکہ جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تم اسی وقت مجھے اچھے لگنے لگے تھے۔"

میں نے بات ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے قصبے کے آگے جو دریا بہتا ہے اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں سے نکلتا ہے؟"

مالینی سمجھ گئی کہ میں بات کا موضوع بدلنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگی۔

"اس کا نام نیل ہے۔ یہ دریا پیچھے کہیں پہاڑیوں میں سے نکلتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے یہ دریا مصر کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ تو مصر کا بڑا مشہور دریا ہے بڑا تاریخی دریا ہے۔"

مالینی نے جب دیکھا کہ میں اس کے مطلب کی بات کرنے سے گریز کر رہا ہوں تو اس نے پوچھا۔

"تمہارے لئے چائے اور بناؤں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں مالینی۔ تمہارا شکریہ۔ میں نے اپنے کوٹے کی دو پیالیاں پی لی ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور کہا۔

"اچھا میں ذرا مندر بابا کے پاس جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ وہ مجھے ایک نئی الجھن میں چھوڑ گئی تھی۔ یہ لڑکی بھی مجھ سے محبت کرنے لگی تھی اور جواباً مجھ سے بھی محبت کی طلب گار تھی جو میں اسے نہیں دے سکتا تھا میرا دل رقاصہ شکتی کی محبت سے لبریز تھا۔ اس میں کسی دوسری لڑکی کی محبت کے لئے بالکل جگہ نہیں تھی۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ مالینی کو اندازہ ہو گیا ہے کہ میں رقاصہ شکتی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور اب وہ اپنی محبت کا اظہار کر کے مجھے رقاصہ شکتی سے دور کرنا چاہتی تھی۔ جو ناممکن تھا مگر یہ لڑکی میرے لئے مسئلہ پیدا کر سکتی تھی۔ میں مالینی کے باپ کے ہاں بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا اور رقاصہ شکتی ان کے

مندر کی رقاصہ تھی۔ اگر اسے میری اور شکتی کی محبت کا علم ہو جاتا ہے تو وہ بڑی آسانی سے رقاصہ شکتی کو اپنے راستے سے ہٹا سکتی تھی۔ طرح طرح کے اندیشے میرے دل میں آنے لگے تھے۔ آخر میں نے یہ کہہ کر ان اندیشوں کو اپنے دل سے نکال دیا کہ میں محبت کرنے میں آزاد ہوں۔ مالینی یا کوئی بھی مجھے کسی سے محبت کرنے سے نہیں روک سکتا۔ مجھے رات کو رقاصہ شکتی سے ملاقات کرنے کا خیال آگیا۔ اس خیال نے میرے محبت بھرے جذبوں کو مزید توانائی عطا کر دی اور میں بے حد مطمئن ہو گیا۔

میں بڑی شدت سے رات کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر دن ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ایک دن دو دنوں کے برابر لمبا ہو گیا ہے۔ آخر خدا خدا کر کے دن ڈھلنا شروع ہوا۔ پھر سورج غروب ہو گیا۔ شام کے سائے بڑھنے لگے۔ پھر رات ہو گئی۔ کھانا میں نے مالینی اور اس کے پجاری باپ کے ساتھ مل کر کھایا اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں اپنی کوٹھڑی کے صحن میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور دیر تک مالینی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کی آج کی گفتگو کے بعد صورتحال میں ایک نئی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نئی پیدا شدہ صورت حال میں مجھے کیا رویہ اور کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔ ایک بات بالکل واضح تھی کہ میں مالینی سے محبت کا جھوٹا اقرار نہیں کر سکتا تھا اور رقاصہ شکتی کی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے روز وہی بات ہوئی جس کا مجھے خطرہ تھا۔

شام کی پوجا پاٹھ سے فارغ ہونے کے بعد مالینی کا پجاری باپ میری کوٹھڑی میں آگیا۔ میں بتی جلا کر چارپائی پر لیٹا اس زمانے کی انگریزی میں چھپی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی مجھے مالینی کے باپ کی آواز آئی۔

"کرستوف بیٹے! سو گئے ہو کہ جاگتے ہو؟"

میں جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔

"اندر آجائیں بابا!"

مالینی کا باپ اندر آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"بیٹا! میں نے تمہیں بے آرام کیا ہے۔ لیکن جو بات میں کرنے آیا

ہوں وہ بھی بہت ضروری تھی۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یعنی مجھے کچھ شک ہو گیا تھا کہ یہ شخص کیا بات کرنے آیا ہے۔ کچھ روز سے اس کا میرے ساتھ رویہ بھی پہلے سے زیادہ مشفقانہ ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"بابا! بات خیریت کی ہے ناں؟ میرا مطلب ہے مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟"

مالینی کے باپ نے بڑی محبت سے اٹھ کر میرا ماتھا چوما اور واپس بانس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم اتنے اچھے لڑکے ہو کہ میں سمجھتا ہوں تم سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔"

میں نے آگے کوئی بات نہ کی اور چپ رہا کہ دیکھیں یہ شخص کیا بات کہتا ہے۔

تین چار سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد مالینی کا باپ بولا۔

"بیٹا! مالینی میری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی ماں مر چکی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا صرف اکیلا میں ہی ہوں۔ میں نے اس کی خواہش کی وجہ سے اسے مصر نقلی فرعون کے ہاں بھیج دیا تھا۔ کیونکہ اس نے مالینی پر اپنی باتوں سے بڑا اثر ڈالا ہوا تھا۔ وہاں اس کی زندگی موت کا سوال پیدا ہو گیا۔ اور تم فرشتہ رحمت بن کر اس کے پاس آ گئے اور اسے موت کے منہ سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا۔ تمہارے اس احسان کا میں ساری زندگی قرض نہیں اتار سکوں گا۔"

میں نے رسمی طور پر کہہ دیا۔

"بابا! یہ تو میرا انسانی فرض تھا۔ میں نے مالینی پر یا آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

"پھر بھی بیٹا" اس نے کہا۔ "تم نے ثابت کر دکھایا ہے کہ تم ایک بہادر اور شریف نوجوان ہو۔ مالینی بھی اس روز سے تمہاری گرویدہ ہو گئی ہے۔ وہ ہمیشہ تمہاری تعریف کرتی ہے۔ اٹھتی بیٹھتی تمہاری باتیں کرتی ہے۔ وہ تمہیں بے حد پسند کرنے لگی

ہے۔ تم مالینی کی زندگی میں پہلے ایسے نوجوان ہو جس نے اسے اس قدر متاثر کیا ہے۔
وہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میری بچی کو پسند کرتے ہو۔"
میں خاموشی سے مالینی کے پجاری باپ کی باتیں سن رہا تھا اور اس بات کا
انتظار کر رہا تھا جو وہ کہنے والا تھا۔ مالینی کے باپ نے کہا۔
"بیٹا! آج کل کے زمانے میں میری بیٹی کو تمہارے ایسا نوجوان ملنا کہ
جس کو وہ بھی اتنا پسند کرتی ہو بہت مشکل ہے۔ ہم بت پرست ہیں۔
تم ہمارے مذہب کے نہیں ہو۔ لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ تمہارا
مذہب ہمارے مذہب کی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی اجازت
دیتا ہے۔ بیٹا! میں چاہتا ہوں کہ تم میری بیٹی کا ہاتھ تھام لو۔ میں اب
بوڑھا ہو چلا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میں مالینی کو
بے سہارا چھوڑ گیا تو میری روح کو چین نہیں ملے گا۔"
اتنا کہہ کر مالینی کا باپ خاموش ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی
خاموش تھا۔ میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ اتنی تیزی سے اتنی کم مدت میں میں نے اتنا
زیادہ کبھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے چند سیکنڈ میں ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا تھا۔ آخر میں ایک
نتیجے پر پہنچ گیا۔
میں نے کہا۔
"بابا! اس سے زیادہ میرے لئے اور کیا خوشی کی بات ہو سکتی ہے کہ
مالینی ایسی لڑکی میری زندگی کی ساتھی بن جائے۔"
مالینی کے باپ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے اٹھ کر بے اختیار میرا ماتھا چوم لیا اور
پوچھا۔
"بیٹا! تم نے بوڑھے باپ کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ میں اتنا خوش
ہوا ہوں کہ شاید زندگی میں کبھی اتنا خوش نہیں ہوا۔"
میں نے جلدی سے کہا۔
"لیکن بابا!"
لیکن کیا بیٹا کرستوف؟"

بوڑھے نے کسی قدر فکر مند انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔
"لیکن بابا! مجھے تھوڑی سی مہلت دیں۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے
شادی کے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے اتنا موقع دیں کہ
میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر شادی کے لئے تیار کر سکوں۔"
بوڑھے مالینی کے باپ نے ہنس کر کہا۔
"کوئی بات نہیں بیٹا۔ تم بے شک ہفتہ دو ہفتے لے لو۔ تم بھی یہیں
ہو۔ ہم بھی یہیں ہیں شادی دو ہفتے کے بعد ہو جائے گی۔ اچھا بیٹا۔
میں اب چلتا ہوں۔ میں مالینی کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے بے تاب
ہوں۔ دیوتا تمہاری حفاظت کریں۔"
مالینی کے باپ نے اٹھ کر ایک بار پھر بڑی محبت اور شفقت سے میرا ماتھا چوما
اور خوش خوش کوٹھڑی سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اپنی جگہ پر بیٹھا بہت
کچھ سوچتا رہا۔ میں نے جس حکمت عملی سے کام لیا تھا اس وقت اس کی ہی ضرورت
تھی۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تیار ہونا شروع ہو گیا تھا۔
مجھے رات کو رقاصہ شکتی سے ملنے جانا تھا۔
میں صحن میں لیٹنے کی بجائے کوٹھڑی میں لیٹا تھا تاکہ باہر صحن میں میری خالی
چارپائی دیکھ کر کسی کو شک نہ پڑے کہ میں کہاں چلا گیا ہوں۔ جب چاند آسمان کے
مشرقی افق پر کافی اونچا آگیا اور اس کی چاندنی چاروں طرف پھیل گئی تو میں کوٹھڑی
سے باہر نکلا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور مندر کے سامنے سے جانے کی بجائے اوپر
سے ہو کر مندر کے باغیچے میں آکر درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے وہاں
بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ کیونکہ میں نے پجاری کے آگے اس کی بیٹی سے شادی
کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت ادھر ادھر پھرتا ہوا کوئی آدمی
مجھے مندر کی رقاصہ کے ساتھ دیکھ لے اور مالینی کے باپ کو جا کر کہہ دے کہ میں رات
کو چھپ کر رقاصہ شکتی سے ملتا ہوں۔ اس طرح سے جو منصوبہ میں نے سوچ رکھا تھا
اس کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اور مالینی ایسی تیز مزاج لڑکی حسد کی آگ میں جل کر کچھ بھی
کر سکتی تھی۔ میری نظریں اس کی چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر لگی تھیں جو مندر کی عقبی

دیوار کی طرف سے باغیچے میں آتی تھی۔ پگ ڈنڈی چاندنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ ابھی تک شکتی نہیں آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آنے کو اس نے خود کہا ہے اور وہ ضرور آئے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے چاندنی میں پگ ڈنڈی پر ایک عورت آتی دکھائی دی۔ یہ رقاصہ شکتی ہی تھی اس کی چال ڈھال اور خدوخال میرے شعور میں کندہ ہو چکے تھے۔ میں درخت کے پیچھے سے نکل کر گیندے اور گلاب کی کیاریوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میرا رخ اس طرف تھا جس طرف سے رقاصہ شکتی آ رہی تھی۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔ اس نے بھی چاندنی رات میں مجھے دور سے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت مجھ پر رقاصہ شکتی کی محبت اس قدر چھا چکی تھی کہ میں نے بالکل خیال نہ کیا کہ شکتی میری حرکت کو کہیں برا محسوس نہ کرے یا وہ میری اس حرکت سے کیا سوچے گی۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آئی میں نے بے اختیار ہو کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میرے اندیشے کے برخلاف رقاصہ شکتی نے بھی اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ یہ ہماری محبت کی پہلی ہم آغوشی تھی۔ اس وقت رقاصہ شکتی کے ملبوس سے جو خوشبو آ رہی تھی وہ مجھے ساری زندگی یاد رہے گی۔ وہ خوشبو آج بھی میرے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ کتنی دیر تک ہم وہیں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھڑے محبت کرتے رہے۔ اس محبت میں کوئی لفظ نہیں بولا جا رہا تھا۔ نہ میں اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ نہ وہ مجھے کچھ کہہ رہی تھی۔ ہمارے ہونٹ خاموش تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہماری روحیں خالص محبت اور محبت کی زبان خاموشی میں ایک دوسری سے ہم کلام تھیں۔

پھر رقاصہ شکتی نے اپنے آپ کو مجھ سے الگ کیا اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

"آؤ۔ ان درختوں کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں"

روحوں اور جسموں کے کھل کر اظہار محبت کے بعد اب رقاصہ شکتی کو بھی خیال آنے لگا تھا کہ کوئی انہیں وہاں دیکھ نہ لے۔ ہم درختوں کے نیچے ایک جگہ جہاں اندھیرا تھا آ کر بیٹھ گئے۔ محبت کے جس طلسم سے ہم ابھی ابھی نکل کر آ رہے تھے ہم دونوں پر ابھی تک اس کا اثر تھا۔ نہ میں بول رہا تھا۔ نہ وہ کوئی بات کر رہی تھی۔ تب

میں نے رقاصہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ نیم گرم تھا۔ میں نے اسے چوم لیا۔ اس کی ہتھیلیوں میں سے گلاب کے پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"شکتی!"

رقاصہ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر نازک انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں اور کہا۔

"میں شکتی نہیں ہوں۔ میرا اصلی نام شکنتلا ہے۔ تم مجھے شکنتلا کہہ کر بلایا کرو۔ یہاں میرے اس نام سے کوئی واقف نہیں ہے۔ اب تمہارا مجھ پر بہت حق بن گیا ہے۔ تم مجھے شکنتلا کہہ سکتے ہو۔ میں نے بڑی محبت سے اسے کہا۔

"شکنتلا! میں----"

اس نے سرد آہ بھر کر میری بات کاٹتے ہوئے انتہائی سرور انگیز لہجے میں کہا۔

"آہ! آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میرے ماتا پتا نے میرا نام شکنتلا اس لئے رکھا تھا کہ تم مجھے اس نام سے بلا سکو۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے نہ جانے کتنے لوگوں نے مجھے میرے نام سے پکارا ہے۔ لیکن تمہاری زبان سے اپنا نام سن کر مجھے محسوس ہوا کہ میں پہلی بار اپنا نام سن رہی ہوں۔"

شکنتلا رقاصہ کے اظہار محبت کا انداز قدیم سنسکرت کے رومانوی شاعروں کا سا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے اس نے کالی داس کے ڈرامے شکنتلا کا کوئی شعر پڑھ دیا ہو۔ میں اس کا اور زیادہ گرویدہ ہو گیا۔ جس کلاسیکی انداز میں اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اس کے مقابلے میں میرا اس سے اظہار محبت کرنا بیکار ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے لئے اب یہی بہتر تھا کہ میں زبان کا سہارا لینے کے بجائے عملی طور پر اس سے محبت کا اظہار کروں۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ میری آغوش میں تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری کائنات کو میں نے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ یہ پاکیزہ محبت کا وہ مقام تھا کہ جہاں حسن وتو کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ تمام

امتیازات ختم ہو جاتے ہیں اور جہاں مادے کی رومانیت، روح کی رومانیت سے مل جاتی ہے۔

شکنتلا نے ایسی آواز میں جیسے کوئی خواب میں بول رہا ہو مجھ سے کہا۔

"چلو۔ ہم دونوں یہاں سے چلے جاتے ہیں۔"

میں یہ سمجھا کہ وہ مجھے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے لئے کہہ رہی ہے یعنی یہ کہ بہت ملاقات ہو چکی۔ اب ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑیوں کی طرف چل دینا چاہئے۔ میں نے کہا۔

"پھر کب ملو گی شکنتلا؟"

اس نے آہستہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"میں ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہی ہوں کرستوف۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

"میں ابھی اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

اس نے کہا۔ "کل اس وقت تم یہاں آ جانا۔ ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں گے۔"

اس کے بعد وہ مجھ سے جدا ہو کر چلی گئی۔ میں اپنی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گیا۔ باقی کی ساری رات میں جاگتے میں شکنتلا کو جیسے خواب میں دیکھتا رہا کہ ہم ایک حسین ترین باغ میں پھر رہے ہیں اور آسمان پر روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ دوسرے دن بھی جیسے میں خواب میں ہی گم رہا۔ مالینی کو اس کے باپ نے بتا دیا تھا کہ میں اس سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا ہوں۔ وہ میرے سامنے آئی تو شرما کر آگے نکل گئی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کم از کم اس دن کے لئے جتنی دور رہے اتنا ہی بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس عورت کے جذبہ حسد سے خوف آنے لگا تھا۔ مالینی بڑی اچھی لڑکی تھی مگر اس میں حسد کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ شاید یہ اس لئے بھی تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ دل سے محبت کرتی تھی۔

شام کے وقت ہماری ملاقات ہو گئی۔ مالینی نے شرماتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بابا! نے اگلے ہفتے ہماری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"کرستوف! مجھ سے اسی طرح محبت کرتے رہو گے نا؟"

مجھے اب اس کے آگے جھوٹ ہی جھوٹ بولنا تھا۔ میں نے کہا۔

"کیوں نہیں مالینی! میں تم سے پیار کرتا ہوں اور ساری زندگی پیار کرتا رہوں گا۔"

مسرت سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کل صبح جب اسے پتہ چلے گا کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا ہوں تو اسے کس قدر صدمہ ہو گا۔ لیکن اگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی تو میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ یہ دلوں کے سودے تھے۔ اس میں عقل و مصلحت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔

شروع رات کو ہی میں اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا۔ یہ اس مندر میں مالینی اور اس کے پجاری باپ کے گھر پر میری آخری رات تھی۔ میں نے بتی گل کر دی تھی تاکہ اگر کوئی کھڑکی کے قریب سے گزرے تو کوٹھڑی میں اندھیرا دیکھ کر یہی خیال کرے کہ میں سو گیا ہوں۔ لیکن میں جاگ رہا تھا۔ وہ رات قدرت نے سونے کے لئے نہیں، جاگنے کے لئے بنائی تھی۔ اس رات سو جانا زندگی کی ساری راتوں سے محروم ہو جانے کے برابر تھا۔ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے مشرق کی طرف سے چاند نکل آیا۔ میں چاند کے طلوع ہونے کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کیا تیاری کرنی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ میرے پاس تیار ہونے کے لئے سوائے میرے عزم وارادے کے اور کچھ نہیں تھا اور میں عزم کر چکا تھا کہ مجھے ہر حالت میں شکنتلا کے ساتھ وہاں سے فرار ہو جانا ہے۔ یہ خیال ضرور آتا کہ ہم وہاں سے نکل کر کس طرف جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم دن نکلنے سے پہلے پہلے مالینی کے قصبے سے اتنی دور نکل جائیں کہ اگر کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر بھی ہمارے پیچھے آئے تو ہم اس کے ہاتھ نہ آئیں۔

اس خیال سے میں مطمئن تھا کہ شکنتلا ایک عرصے سے اس علاقے میں رہ رہی

تھی۔ اسے معلوم ہو گا کہ ہم فرار ہونے کے بعد کس طرف جائیں گے اور ہمیں کس طرف کو جانا چاہئے۔ چاند کے طلوع ہونے کے آدھے گھنٹے بعد ہی میں کوٹھڑی سے نکل کر باغیچے کی طرف چل پڑا۔ میں چاندنی میں نہیں بلکہ اس راستے پر چل رہا تھا جہاں درختوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ میں باغیچے میں اس جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں کل رات میں اور شگفتا بیٹھے تھے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مجھے شگفتا کے لباس کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔ دوسرے لمحے درختوں کے نیچے سے شگفتا نمودار ہوئی۔ رقاصہ کے چمکیلے لباس کی بجائے اس نے سادہ سی گہرے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ خلاف معمول تیز تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میرے قریب آکر اس نے سرگوشی میں کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

وہ آگے چل پڑی۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔ باغیچے میں سے نکلنے کے بعد وہ ایک ٹیلے کی جانب مڑ گئی۔ ٹیلے کی دوسری جانب ایک ندی بہہ رہی تھی۔ شگفتا نے رک کر کہا۔

"آگے ندی پر ایک پل ہے۔ ہم وہاں سے ندی پار کریں گے۔"

ہم ندی کے کنارے چلنے لگے۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا پل آ گیا۔ وہاں سے ہم ندی پار کر گئے۔ دوسری جانب درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہم ان جھنڈوں میں سے گزر کر باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے دو گھوڑے کھڑے تھے جن پر زین وغیرہ کسی ہوئی تھی۔ شگفتا نے مجھ سے کہا۔

"یہ گھوڑے ہمیں راتوں رات یہاں سے نکال کر لے جائیں گے۔"

ایک گھوڑے پر شگفتا اور دوسرے گھوڑے پر میں بیٹھ گیا۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے تھا۔ ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر چاندنی رات میں وادی میں اپنی منزل کی طرف دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ وادی پیچھے رہ گئی۔ مالینی کے قصبے کی پہاڑیاں بھی نظروں سے غائب ہو گئیں ہمارے گھوڑے اب ایک ویران اور سنگلاخ میدان میں دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ چاند مغرب سے طلوع ہوا تھا اور آسمان پر ایک

خاص مقام پر پہنچنے کے بعد مغرب میں ہی غروب ہو گیا۔ میدان میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں بھی ہمارے گھوڑے اتنی آسانی اور تیز رفتاری سے دوڑ رہے تھے جیسے اس راستے سے بخوبی واقف ہوں۔ ایک جگہ درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ وہاں ایک قدرتی چشمہ بہہ رہا تھا۔ شگفتا نے گھوڑے کو روکا تو میں نے بھی اپنا گھوڑا روک دیا۔ ہم نے گھوڑوں کو گھاس وغیرہ کھانے کے لئے چھوڑ دیا اور خود چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہم نے چشمے کے پانی سے منہ دھویا۔ پانی پیا۔ شگفتا کہنے لگی۔

"کرستوف! تمہیں میرے ساتھ آ جانے سے افسوس تو نہیں ہو رہا؟"

میں نے کہا۔ "تمہیں یہ کیسے خیال آ گیا؟"

وہ کہنے لگی۔ "میں نے تمہیں مالینی کے ساتھ اکثر باتیں کرتے دیکھا ہے سوچتی تھی کہ تم ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے ہو۔"

میں نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے شگفتا! مجھے مالینی سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔ میں تو تم سے اور صرف تم سے پیار کرتا ہوں"

رقاصہ شگفتا میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چاند کے غروب ہو جانے کے بعد آسمان پر ستاروں کی چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کی دھیمی دھیمی نورانی روشنی میں شگفتا کا چہرہ خواب میں نظر آنے والی پراسرار دیوداسیوں کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہم مالینی کے قصبے سے کتنی دور آ گئے ہوں گے۔

اس نے کہا۔ "کیا تمہیں خطرہ ہے کہ وہ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہوں گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ انہیں ہمارا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

شگفتا نے کہا۔ "فکر نہ کرو کرستوف! ہم ان لوگوں سے بہت دور نکل آئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں شگفتا کہ ہماری منزل کہاں ہے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں کیونکہ میں نے تو اپنا آپ تمہارے حوالے کر دیا ہے۔"

شگفتا بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

کہنے لگی۔

یہاں سے آگے ایک دریا آئے گا۔ وہاں سے ہم ایک جہاز میں سوار ہو کر پندرہ بیس روز کے سفر کے بعد ملک ہندوستان پہنچ جائیں گے۔ وہ میرا ملک ہے۔ میں تمہیں اپنے مندر میں لے چلوں گی۔ وہاں ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔ پھر کوئی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرے گا۔"

اس وقت مجھ پر شکنتلا کی محبت کا طلسم طاری تھا۔ میں نے کہا۔

"مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے شکنتلا کہ میں ہمیشہ تمہارے قریب رہوں۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ہم اٹھ کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی کہ ہم ایک دریا کے پاس پہنچ گئے۔ کافی بڑا دریا تھا۔ اس کے کنارے ایک بہت بڑا شہر نما قصبہ آباد تھا۔ یہاں ایک بہت بڑا گھاٹ یا بندرگاہ تھی جہاں تین چار بڑے بڑے بادبانی جہاز اور کئی چھوٹی کشتیاں نظر آئیں۔ بڑی رونق تھی۔ بندرگاہ کے پاس ہی ایک سرائے تھی جہاں مسافر عورتیں اور مرد اپنے اپنے سامان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ہم بھی سرائے میں آ گئے۔ معلوم ہوا کہ ملک ہندوستان کو ایک جہاز دو دن کے بعد روانہ ہو گا۔ یہ دو دن ہم نے وہیں سرائے میں گزارے۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا۔ مگر شکنتلا سارا انتظام کر کے میرے ساتھ چلی تھی۔ جہاز کے دو ٹکٹ اسی نے خریدے۔ ابھی بھاپ کا انجن ایجاد نہیں ہوا تھا اور سمندر میں بادبانی جہاز ہی چلتے تھے۔ مگر قدیم زمانے کے مقابلے میں بادبانی جہازوں نے بھی کافی ترقی کر لی تھی اور اب مستول کافی اونچے مضبوط اور تعداد میں زیادہ ہوتے تھے اور بادبان بھی کافی بلند ہوتے تھے۔

دو دن کے بعد ہم ہندوستان جانے والے جہاز میں سوار ہو گئے۔ ہوا خوب چل رہی تھی۔ جہاز کے بادبان کھول دیئے گئے۔ لنگر اٹھا دیا گیا بادبان ہوا میں پھول گئے اور جہاز نے دریا میں اپنا سفر شروع کر دیا۔ سارا دن اور ساری رات جہاز دریا میں ہی سفر کرتا رہا۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد دریا کا ڈیلٹا آ گیا۔ یہاں دریا سمندر میں گرتا

تھا۔ اس کے بعد جہاز سمندر میں اتر گیا اور سمندر کا سفر شروع ہو گیا۔ سمندر میں آنے کے بعد جہاز نے زیادہ ڈولنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی رفتار بھی سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی وجہ سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ سمندر میں ہوا بھی کافی تیز چلتی تھی۔ ہمارا یہ سمندری سفر پچیس دن تک جاری رہا۔ اس کے بعد زمین نظر آنے لگی۔ چھبیسواں دن بھی گزر گیا رات بھی گزر گئی۔ جہاز کنارے کی طرف بڑھتا رہا۔ آخر ایک دن جبکہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے ہمارا جہاز ملک ہندوستان کی جنوبی تکون کے ایک شہر کی بندرگاہ پر آ کر رک گیا۔ یہ کافی بڑا شہر تھا۔ شکنتلا اسی شہر کی رہنے والی تھی۔ وہ اسی شہر کے ایک ناگ مندر کی دیوداسی اور نرتکی تھی۔ وہ مجھے اپنے مندر میں لے گئی۔ اس نے مجھے مندر کے بوڑھے پجاری سے ملایا اور اپنی زبان میں اس سے میرے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ اس کی زبان سنتے ہی مجھ پر اپنی غیبی طاقت کے اثر سے اس زبان کے سارے اسرار و رموز کھل گئے۔ میں اس کی زبان سمجھنے لگا۔ اب میں وہ زبان بول بھی سکتا تھا۔ یہ جنوبی ہند کی قدیم تامل زبان تھی۔ بوڑھے پجاری سے شکنتلا نے تامل زبان میں ہی میرا تعارف کرواتے ہوئے اسے بتایا کہ میرا نام کرستوف ہے اور میں ولائیت سے آیا ہوں اور جنوبی ہند کے ناگ مندروں پر لندن کی ایک سوسائٹی کی طرف سے ریسرچ کرنے کے کام پر لگایا گیا ہوں۔ میں شکنتلا کی تامل زبان ساری کی ساری سمجھ گیا تھا۔ بوڑھے پجاری نے اس وجہ سے کہ میں تامل زبان سے ناواقف ہوں گا شکستہ سی ہندی میں کہا۔

"کرستوف! تم سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ تم جتنی دیر تک چاہے ہمارے مندر میں رہ کر اپنی تحقیق کا کام کر سکتے ہو۔ تمہیں یہاں ہر طرح کی سہولت میسر ہو گی۔"

میں نے اس کو ہندی میں جواب دینے کی بجائے اس کی زبان تامل میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

پجاری مہاراج! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی۔"

مجھے تامل زبان میں بولتے دیکھ کر سب سے زیادہ حیرت شکنتلا کو ہوئی۔ اس کا

منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ عالم حیرت میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کرستوف! کیا تم تامل زبان بول لیتے ہو؟"

میں نے مسکرا کر تامل زبان میں ہی کہا۔

"کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آیا۔"

پجاری مجھے تامل میں بات کرتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مسٹر کرستوف! یہ ہماری زبان تم نے کہاں سے سیکھی تھی؟ تم تو بڑی روانی سے ہماری زبان بول لیتے ہو"

میں نے کہا۔ "مہاراج! ولائیت کی جس سوسائٹی نے مجھے ناگ مندروں کی ریسرچ کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اس سوسائٹی کی طرف سے مجھے سب سے پہلے یہاں کی تامل زبان سکھائی گئی تھی تاکہ مجھے ریسرچ کرنے میں آسانی ہو۔"

شکنتلا کہنے لگی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم ہماری تامل زبان جانتے ہو؟"

میں نے مزاح پیدا کرنے کے انداز میں کہا۔

"میں تمہیں اچانک حیران کرنا چاہتا تھا۔"

اس علاقے میں اگرچہ ایک تامل راجہ کی حکومت تھی لیکن انگریز پرتگالی اور فرانسیسی سوداگروں نے اس زمانے میں ہی جنوبی ہند کے شہروں میں تجارت کا کاروبار شروع کر دیا ہوا تھا جس کی وجہ سے خاص طور پر جنوبی ہند میں تعلیم کا معیار بہتر ہونے لگا تھا اور انگریز اور پرتگالی اور فرانسیسی تاجروں کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں لوگ تھوڑی تھوڑی ان لوگوں کی زبانیں سمجھنے اور بولنے لگے تھے۔ جس زمانے میں میں جنوبی ہند میں پہنچا تھا اس کے ایک سو سال بعد انگریزوں اور پرتگالیوں نے جنوبی ہند میں اپنی تجارتی کوٹھیاں ہی قائم نہیں کر رکھی تھیں بلکہ بنگال اور جنوب مغربی ہند کے ساحلی علاقے گھارمن پر پرتگالیوں اور انگریزوں نے اپنا قبضہ بھی مستحکم کر لیا تھا۔ میں جس زمانے میں شکنتلا کے ساتھ وہاں آیا تھا اس زمانے میں

ہندوستان میں شاہ جہان بادشاہ کی حکومت تھی اور مغل سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر سارے ہندوستان پر مغلیہ سلطنت قائم تھی لیکن جگہ جگہ صوبوں میں بغاوتیں ہو رہی تھیں اور اورنگ زیب کے عہد میں جنوبی ہند کے جو علاقے مغل سلطنت کے قبضے میں تھے وہ بھی شاہی خاندان کی سازشوں اور خود غرضیوں کی وجہ سے ہاتھ سے نکلتے چلے جا رہے تھے۔

مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ میں اس خطہ زمین میں آگیا ہوں جہاں دو سوا دو سو برس کے بعد ایک نئی اسلامی مملکت پاکستان نے نقشے پر ابھرنا تھا۔ قدرتی طور پر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں شمالی ہند میں شہر لاہور جا کر اپنی گلی کا علاقہ دیکھوں کہ وہاں ہماری گلی موجود ہے کہ نہیں۔ ہمارے مکان کا تو ابھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اسے تو دو سوا دو سو سال بعد تعمیر ہونا تھا۔ ٹائم اینڈ سپیس یعنی زمان و مکان کے الٹے چکر نے مجھے عجیب چکر میں ڈال دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں آتا تھا۔ بہت کچھ سمجھنے سے میرا ناپختہ ذہن قاصر تھا۔ لیکن اس وقت مجھ پر شکنتلا کی محبت کا جادو سوار تھا اور میں ہر وقت اس کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس سے ایک پل کی جدائی بھی مجھے گوارا نہیں تھی۔ مجھے شکنتلا کے ناگ مندر کے قریب ہی رہنے کے لئے ایک جھونپڑا نما کوٹھڑی مل گئی تھی۔ شکنتلا مندر کے اندر دوسری دیوداسیوں یعنی ناگ دیوتا کے سامنے رقص کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے ملنے آجایا کرتی تھی۔ یہ بہت بڑا مندر تھا۔ یہاں ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی تھی۔ شکنتلا کو ہر رات دوسری لڑکیوں کے ساتھ ناگ دیوتا کے بہت بڑے بت کے آگے رقص کرنا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں بھی اس کا رقص دیکھنے مندر میں پجاری سے اجازت لے کر چلا جایا کرتا تھا۔

تین چار دن میں ہی مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ مندر کے بڑے پجاری کا نوجوان بیٹا شکنتلا پر عاشق ہے۔ میں نے اس کا ذکر شکنتلا سے کیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"رگھو مجھ سے پریم کرتا ہے تو کرتا پھرے۔ مجھے کیا پروا ہے۔ میں تو اس سے نفرت کرتی ہوں۔"

پجاری کے بیٹے کا نام رگھو تھا- لیکن وہ بڑے پجاری کا بیٹا تھا- مندر میں اس کا بڑا دبدبہ تھا- پجاری تو نیک دل انسان تھا مگر رگھو پکا بدمعاش تھا- اس کی کئی دیوداسیوں سے دوستی تھی- وہ شکنتلا کو بھی اپنے دام میں پھنسانا چاہتا تھا- لیکن شکنتلا اس سے بے اعتنائی کا سلوک کرتی تھی- لیکن اندر سے وہ بھی رگھو سے تھوڑا ڈرتی تھی- اس کا اندازہ میں نے شکنتلا کی باتوں سے لگایا تھا- رگھو کے بارے میں شکنتلا نے مجھے بتایا تھا کہ ایک دیوداسی نے رگھو کے دام ہوس میں پھنسنے سے انکار کر دیا تھا- جس کے بعد رگھو نے اسے ایسا غائب کر دیا تھا کہ آج تک اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا-

اگرچہ میرے لئے رگھو بھی ایک چیلنج بن کر سامنے آگیا تھا- وہ میرا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن شکنتلا کو ضرور نقصان پہنچا سکتا تھا- شکنتلا سارا دن ساری رات مندر میں رہتی تھی- رگھو بھی چھوٹے پجاری کی حیثیت سے مندر میں ہی ہوتا تھا- اس کے پاس شکنتلا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے اور دوسری صورت میں اسے نقصان پہنچانے کے بے شمار مواقع تھے- اس خیال سے میں پریشان رہنے لگا- ایک شام وقت نکال کر شکنتلا مجھ سے ملنے آگئی- میں نے اس سے رگھو کے بارے میں بات کی تو وہ بولی-

"تم کیوں گھبراتے ہو- وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا-"

میں نے کہا-

"رگو کے بارے میں تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے اس کی رو سے وہ تم پر ضرور مجرمانہ حملہ کرے گا اور ناکامی کی صورت میں تم سے خوفناک بدلہ بھی لے سکتا ہے-"

شکنتلا کو بھی کچھ خوف سا محسوس ہوا- کہنے لگی-

"پھر میں کیا کر سکتی ہوں- میں تو یہاں رہنے پر مجبور ہوں-"

میں نے کہا- "جس طرح تم پہلے اس مندر کو چھوڑ کر افریقہ کے ملک سوڈان چلی گئی تھیں اس طرح تم اب بھی کسی دوسرے مندر میں کیوں نہیں چلی جاتیں- میں تمہارے ساتھ ہوں- یہ ملک بڑا وسیع ملک ہے- ہم شمال کی طرف نکل جائیں گے- اور کسی شہر میں جا کر شادی کر کے نئی زندگی شروع کر دیں گے- میں کہیں نوکری کر لوں گا-"

شکنتلا کہنے لگی-

"مجھے سوڈان کے ملک میں بڑے پجاری نے اپنی مرضی اور اپنی اجازت سے بھیجا تھا- مالینی کے باپ کے یہاں کے بڑے پجاری کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات تھے اور بڑا پجاری سوڈان والے مندر میں مجھے بھیج کر مندر کے ناگ دیوتا کی خوشنودی بھی حاصل کرنا چاہتا تھا- اگر میں ان لوگوں کی اجازت کے بغیر یہاں سے بھاگ کر تمہارے ساتھ چلی گئی تو یہ فوراً کالے ناگ کو میرے پیچھے چھوڑ دیں گے-"

میں نے کہا- "کالا ناگ کیا کرے گا- ہم تو سینکڑوں میل دور اوپر شمال کی طرف نکل گئے ہوں گے- اور راستے میں اتنے جنگل، بیابان دریا ندی نالے ہیں- کالا ناگ تمہیں کہاں تلاش کر سکے گا-"

شکنتلا کہنے لگی-

"کالا ناگ اس مندر کا سب سے چھوٹا اور سب سے زہریلا سانپ ہے- وہ کافی دور تک ہوا میں بھی اڑ سکتا ہے اس کالے ناگ کو مندر کی تمام دیوداسیوں کے جسموں پر پھیر کر اسے ان کے جسموں کی خوشبو سنگھا دی گئی ہے- جیسے ہی میں تمہارے ساتھ مندر سے فرار ہوئی بڑا پجاری اور خاص طور پر رگھو کالے ناگ کو میرے اترے ہوئے کپڑے سنگھا کر اسے چھوڑ دے گا- کالا ناگ کبھی زمین پر رینگتا- کبھی ہوا میں اڑتا میری بو سونگھتا دریا جنگل بیابان عبور کرتا جہاں میں ہوں گی وہاں پہنچ جائے گا اور مجھے ڈس کر ہلاک کر دے گا-"

میں یہ سن کر خاموش ہو گیا- کیونکہ میں محض اپنی محبت کی خاطر شکنتلا کو اپنے ساتھ بھگا کر اس کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا- یہ میری محبت کو ہرگز گوارا نہیں تھا- میں نے کہا-

"پھر میں تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا مشورہ نہیں دوں گا تم ایسا کرو کہ رگھو کو سمجھا بجھا کر سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرو- اس کے

باپ سے بات کرو۔ ہو سکتا ہے وہ سیدھی راہ پر آ جائے اور تمہیں تنگ کرنا چھوڑ دے۔ اگر پھر بھی باز نہ آیا تو ہم دونوں شادی کر لیں گے۔ پھر تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکے گا۔"

شکنتلا کہنے لگی۔ "شاید تم نہیں جانتے۔ ہم ناگ مندر کی دیوداسیوں کو شادی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہماری شادی ناگ دیوتا سے ہو چکی ہے۔ اگر میں نے شادی کا نام بھی لیا تو بڑے پجاری کے حکم سے مجھے سانپوں کے غار میں دھکیل دیا جائے گا جہاں سینکڑوں زہریلے سانپوں کی میں خوراک بن جاؤں گی۔"

شکنتلا کی محبت نے مجھے زندگی کے دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں ایک طرف میری محبت تھی اور دوسری طرف شکنتلا کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ مجھے ان دونوں میں سے کوئی راستہ منتخب کرنا تھا۔ میں دو دن تک اسی الجھن میں مبتلا رہا۔ آخر ایک روز میں نے اپنی محبت کو شکنتلا کی زندگی پر قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے شکنتلا سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی اور ایک شام خاموشی سے شمال کی طرف جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو کر شکنتلا کے شہر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس زمانے میں لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں قافلوں کی صورت میں گھوڑوں، خچروں اور بیل گاڑیوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ بیس دن کے سفر کے بعد میں مغلیہ سلطنت کے اس وقت کے دارالحکومت دلی پہنچا اور ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔ اب میرے پاس ایک بھی پیسہ یا سکہ نہیں تھا۔ میں آگے پنجاب کی طرف جانا چاہتا تھا تاکہ پنجاب کے دارالحکومت لاہور پہنچ کر وہ علاقہ دیکھ سکوں جہاں دو سو برس بعد ہمارے آباؤ اجداد نے اپنا مکان تعمیر کرنا تھا۔ مجھے سرائے میں ہی تھوڑا بہت کام مل گیا۔ میں دن کو کام کرتا اور رات کو سرائے میں سو جاتا۔ میں نے پندرہ بیس دنوں میں اس زمانے کے کچھ سکے جمع کر لئے۔ اب مجھے اس قافلے کا انتظار تھا جسے پنجاب کے شہر لاہور جانا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ قافلہ تین دن کے بعد صبح صبح روانہ ہو گا۔ ایک دن میں کام سے فارغ ہو کر سرائے میں لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے کوٹھڑی کے دروازے پر دستک دی۔

میں سمجھا کہ سرائے کے مالک کو مجھ سے کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔ کیونکہ میں اس

کے ہاں کام کرتا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے سامنے شکنتلا کھڑی تھی۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیوں آ گئے تھے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی؟"

وہ روئے جا رہی تھی اور مجھ سے گلے شکوے کئے جا رہی تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا اور اسے اپنے پاس زمین پر بچھے ہوئے قالین پر بٹھا لیا اور اسی وقت اس کے لئے باہر جا کر شربت لے آیا۔ اسے زبردستی شربت پلایا۔ شکنتلا بے حد شکستہ حالت میں تھی اور سخت تھکی ہوئی لگتی تھی۔ اسے دیکھ کر میری محبت ایک بار پھر پوری طاقت کے ساتھ بیدار ہو گئی تھی۔ اب میں اپنے آپ کو کوسنے لگا تھا کہ میں نے کیوں ایسی محبت کرنے والی محبوبہ کو دشمنوں کے پاس اکیلا چھوڑ دیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں شکنتلا سے معافیاں مانگنے لگا۔ میرے دلاسا دینے اور اظہار معذرت پر اس نے مجھے معاف کر دیا۔ میں نے کہا۔

"شکنتلا! میں تو صرف اس لئے منہ لپیٹ کر چلا آیا تھا کہ میں تمہاری زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ محض میری وجہ سے تمہاری زندگی کو کوئی شدید خطرہ لاحق ہو جائے۔"

شکنتلا کہنے لگی۔ "تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ تمہارے بغیر میری زندگی موت سے بدتر ہو گی۔"

جب ذرا اس کی طبیعت سنبھلی تو میں نے کہا۔

"اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے کبھی جدا نہیں ہوں گا۔ ہم ایک ساتھ جئیں گے اور اگر موت آئی تو ایک ساتھ مریں گے۔"

شکنتلا نے اپنا خوبصورت سر میرے سینے سے لگا دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ تم اتنی دور سے مجھے تلاش کرتی یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں پر ہوں۔"

شکنتلا نے کہا۔

"ہم دیوداسیوں نے سانپوں میں پرورش پائی ہے۔ ہم ناگ دیوتا کی
پجارنیں ہیں۔ سانپوں کے ماحول میں رہتے ہوئے ہمارے اندر
سانپوں کی ایک خاص صفت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ ہم
انسان کی بو سونگھ لیتی ہیں اور جو انسان ہمارے زیادہ قریب رہے اور
جس سے ہمیں محبت بھی ہو جائے اس کے جسم کی خوشبو ہمارے اندر
جذب ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ہم سے جدا ہو کر جہاں بھی چلا جائے۔ ہم
اس کی بو سونگھ کر اس کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ ہمیں اس کے جسم کی بو
فضا میں بڑی تیز محسوس ہوتی ہے میرے جسم میں تمہارے جسم کی
خوشبو جذب ہو چکی ہے۔ چنانچہ جب مجھے پتہ چلا کہ تم مجھے چھوڑ کر
چلے گئے ہو تو میں نے بھی اس وقت مندر کو چھوڑ دیا۔ ہمیشہ کے لئے
چھوڑ دیا اور تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اس وقت فضا میں
ہزاروں، لاکھوں قسم کی بوئیں اور خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔
تمہارے جسم کی خوشبو بھی ان میں شامل تھی اور تمہارے جسم کی
خوشبو مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔ تمہاری خوشبو نے
مجھے بتایا کہ تم شمال کی طرف گئے ہو۔ چنانچہ میں ایک قافلے کے ساتھ
مل کر شمال کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب قافلہ دلی پہنچا تو فضا میں
تمہارے جسم کی خوشبو بڑی تیز اور صاف تھی۔ میں سمجھ گئی کہ تم
ابھی تک اسی شہر میں ہو۔ میں قافلے کے ساتھ سرائے میں ہی اتری
تھی۔ یہاں تمہاری خوشبو لیتی میں اس کوٹھڑی کے پاس آئی تو
تمہارے جسم کی خوشبو اس کوٹھڑی میں سے آ رہی تھی۔ اور پھر میں
تمہارے پاس آ گئی۔"

شکنتلا کے میرے پاس آ جانے سے میری زندگی میں ایک بار پھر بہار کا موسم آ
گیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی پھر سے بامقصد اور خوبصورت لگنے لگی تھی۔ مگر میری اس بہار
میں خزاں کے تاریک سائے بھی جھکے ہوئے تھے۔ ایک خوف میرے دل کو گھیرے
ہوئے تھا۔ میں نے اس خوف کا اظہار کرتے ہوئے شکنتلا سے کہا۔

"شکنتلا! تمہارے آ جانے سے مجھے جس قدر مسرت نصیب ہوئی ہے
میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ اس کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس
الفاظ نہیں ہیں۔ لیکن ایک غم بھی میرے دل پر طاری ہے۔"

شکنتلا نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ اس نے پوچھا۔

"غم؟ کس بات کا غم؟"

میں نے کہا۔ "تم ہی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کوئی دیوداسی بڑے پجاری کی
اجازت کے بغیر مندر سے فرار ہو جائے تو پجاری اس کے پیچھے اڑن سانپ کالے ناگ
کو چھوڑ دیتا ہے۔ جو دیوداسی کے بدن کی بو سونگھتا ہوا جہاں وہ چھپی ہوتی ہے وہاں
پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈس کر ہلاک کر دیتا ہے۔ تم بھی مندر سے فرار ہو کر آئی ہو۔
بڑے پجاری نے تمہارے پیچھے ضرور کالے ناگ کو چھوڑ دیا ہو گا اور وہ فضا میں
تمہاری بو سونگھتا آ رہا ہو گا۔"

شکنتلا ایک لمحے کے لئے کچھ فکرمند ہوئی لیکن فوراً ہی سر کو جھٹک کر بولی۔

"اگر وہ کالا ناگ ہے تو میں بھی ناگ دیوتا کی پجارن ہوں۔ مجھے اس
کے آنے کی خبر ہو جائے گی اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے ڈسے میں
اسے ہلاک کر دوں گی۔"

کہنے کو شکنتلا نے یہ بات کہہ دی تھی اور میں نے بھی سن لی تھی۔ مگر اس کی
زندگی کے بارے میں میری پریشانی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ میں نے کہا۔

"لیکن تم چوبیں گھنٹے چوکی اور چوکس نہیں رہ سکتی۔ تم کسی وقت
غافل بھی ہو سکتی ہو۔ اور پھر تم رات کو سو بھی جاؤ گی۔ کالا ناگ اس
وقت آ کر تمہیں ڈس سکتا ہے۔"

وہ بولی۔ "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں کالے ناگ سے خود ہی نمٹ لوں گی۔
اگر اسے میرے جسم کی بو محسوس ہو جاتی ہے تو مجھے بھی کالے ناگ کی بو دور ہی سے آ
جاتی ہے۔ میں اس کی بو پاتے ہی اسے تلاش کر کے کچل ڈالوں گی۔"

شکنتلا کے اس خیال سے میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔ لیکن میں یہ بھی سوچتا تھا کہ
ہو سکتا ہے کالا ناگ ہم تک نہ پہنچ سکے۔ ایک چھوٹا سا سانپ سینکڑوں میلوں کا فاصلہ

کیسے طے کرلے گا جبکہ اس کے راستے میں وسیع میدان، گنجان جنگل اور بڑے بڑے دریا اور پہاڑ آئیں گے- سب سے زیادہ یہ کہ شکنتلا کے قرب نے مجھے یہ ساری باتیں کافی حد تک بھلا دیں ساتھ ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں خود اس کی حفاظت کروں گا- جب وہ رات کو سو جایا کرے گی تو میں تلوار سرہانے رکھ کر جاگتا رہوں گا- اگر واقعی کوئی سانپ کسی طرح سے اندر گھس آیا تو میں اسے وہیں ہلاک کرڈالوں گا-

دو دن کے بعد ہم پنجاب کی طرف جانے والے قافلے میں شامل ہو گئے- کلکتے سے پشاور تک کی پختہ سڑک شیر شاہ سوری نے بنوادی ہوئی تھی- اگرچہ آج کے مقابلے میں اس زمانے کی یہ سڑک چوڑائی میں چھوٹی تھی مگر اس کی بدولت قافلے والوں کو آسان راستہ مل گیا تھا- قافلے اس سڑک پر سفر کرتے تھے- ہمارا قافلہ بھی اسی سڑک پر جا رہا تھا- قافلہ دن کو سفر کرتا- رات کو کسی جگہ پڑاؤ ڈال دیا جاتا- آگ کے الاؤ روشن ہو جاتے- لوگ اپنا اپنا کھانا پکانے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے- دوسرے دن صبح صبح قافلہ پھر آگے چل پڑتا- اس طرح سفر کرتے کرتے ہم بنارس پہنچ گئے-

بنارس کا شہر دلی سے لاہور کے راستے میں نہیں آتا تھا- لیکن اس زمانے میں بھی بنارس ہندوؤں کا بڑا اہم شہر تھا اور دلی سے چلا ہوا قافلہ بنارس سے ہو کر پنجاب کی طرف جاتا تھا-

بنارس پہنچ کر شکنتلا نے مجھ سے کہا-

"کرستوف! یہ ہمارا مقدس شہر ہے- یہاں پوتر گنگا میا کا دریا ہے- یہاں شوجی کے ناگ کا ایک مندر بھی ہے- میں یہاں کچھ دن ٹھہر کر شوجی کے ناگ کے مندر کی پوجا کرنا چاہتی ہوں- تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا- "مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے- یہ تمہارے مذہب کا معاملہ ہے اور ہر آدمی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرے-"

شکنتلا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگایا اور اسے ہلکا سا بوسہ دے کر بولی-

"کرستوف! تم کتنے اچھے ہو-"

ایک خواہش جو میرے دل کے ساتھ دھڑک رہی تھی میں نے اس کا بے ساختہ اظہار کر دیا اور شکنتلا سے کہا-

"شکنتلا! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

شکنتلا پہلے تو حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگی- پھر اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا- اس نے آنکھیں جھکا لیں اور کچھ نہ بولی- میں نے اس کی نازک ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا-

"شکنتلا! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا- میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں- کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا- آہستہ سے بولی-

"ہاں!"

میں خوشی سے نہال ہو گیا- میں نے کہا-

"ہم آج رات ہی شادی کریں گے-"

شکنتلا کہنے لگی- "کرستوف! تم عیسائی ہو- میں ہندو ہوں- میں چاہتی ہوں کہ یہ شادی مندر میں جا کر ہو- کیا تم ایسا گوارا کرلو گے؟"

میں نے کہا- "میں تو پنڈت پجاری کے بغیر بھی تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں- لیکن اگر تمہاری خواہش ہے کہ شادی مندر میں جا کر ہو تو میں چاہوں گا کہ وہاں زیادہ پوجا پاٹھ نہ ہو- کیونکہ میں کسی بت کے آگے سر نہیں جھکا سکتا-"

شکنتلا مسکرانے لگی- بولی-

"کرستوف! میں تمہارے مذہب کا بڑا احترام کرتی ہوں- اس لئے میں تمہیں ناگ مندر میں لے کر جاؤں گی- وہاں ہمیں آگ کے گرد صرف سات پھیرے لینے پڑیں گے اور ہماری شادی ہو جائے گی-"

مجھے اور کیا چاہئے تھا- اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا- شکنتلا مجھے دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے ناگ مندر میں لے گئی- اس مندر کے بوڑھے پجاری کو

جب معلوم ہوا کہ ہم شادی کرنے آئے ہیں تو وہ بڑا خوش ہوا۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ جہاں زمین میں کھدے ہوئے ایک چھوٹے سے گڑھے میں آگ روشن تھی۔ پجاری ایک پوتھی کھول کر چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہمیں اپنے سامنے بٹھا لیا۔ مندر کے استھان سے وہ گیندے کے ہار اور گجرے اٹھا کر لے آیا۔ شکنتلا نے اور میں نے ایک دوسرے کے گلے میں ہار ڈالے۔ اس نے اپنی کلائیوں میں گیندے کے گجرے پہن لئے۔ اس نے پجاری کو یہ بالکل نہیں بتایا تھا کہ وہ ناگ دیوتا کی دیوداسی ہے۔ پجاری نے ہماری پیشانیوں پر تھوڑا تھوڑا سیندور لگایا اور پوتھی کھول کر سنسکرت کے اشلوک پڑھنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اشلوک پڑھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لو"

میں نے شکنتلا کا ہاتھ تھام لیا۔ پجاری نے کہا۔

"اب اگنی کے گرد سات چکر لگاؤ۔"

ہم چکر لگانے لگے۔ اس دوران پجاری اشلوک بولتا گیا۔ ساتویں پھیرے کے بعد ہم پجاری کے سامنے آ گئے۔ وہ چوکی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہمیں اشیرباد دے کر (مبارک باد کہہ کر) بولا۔

"سدا سکھی رہو۔ تم دونوں آج سے پتی اور پتنی ہو۔"

شکنتلا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مندر سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ سونے چاندی کے کافی سکے ایک تھیلی میں ڈال کر اپنے ساتھ لے آئی ہے۔ اس نے تھیلی میں سے سونے کا ایک سکہ نکال کر پجاری کو دیا۔ پجاری سونے کے سکے کو پا کر حیران بھی ہوا اور بے حد خوش بھی ہوا۔ کہنے لگا۔

"تم لوگ کہاں رہتے ہو؟"

شکنتلا نے کہا۔ "مہاراج! ہم مسافر ہیں۔ سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

بوڑھے پجاری نے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہ نہ۔ میرے بچو! یہ تمہاری شادی کی پہلی رات ہے۔ یہ جیون میں صرف ایک بار آتی ہے۔ تم آج کی رات میری کٹیا میں بسر کرو گے۔ تم میرے بچوں کی طرح ہو۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

بوڑھے پجاری کی کٹیا مندر کے پاس ہی تھی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ پجاری نے چارپائی پر نیا بچھونا بچھا دیا۔ اور ہمیں آشیرباد دے کر چلا گیا۔ کٹیا میں زیتون کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ میں اور شکنتلا چارپائی پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ آج ہم ایک ہو گئے تھے۔ یہ ہماری زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ کٹیا کی ایک کھڑکی کھلی تھی جس میں سے دریا کی طرف سے ٹھنڈی خوشگوار ہوا آ رہی تھی۔ ہماری باتیں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ ساری رات بیٹھے محبت کی باتیں کرتے رہیں۔ شکنتلا کا دلکش چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ہم نے بتی بجھا دی تھی۔ کھڑکی میں سے ستاروں کی مدھم روشنی کا غبار سا اندر پھیل گیا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ شکنتلا نے کھڑکی میں سے آتی ستاروں کی نورانی روشنی کو دیکھ کر کہا۔

"کتنی خوبصورت رات ہے۔ چلو باہر دریا کنارے چل کر بیٹھتے ہیں۔"

ہم کٹیا میں سے نکل کر دریا کنارے بیٹھ گئے۔ دریائے گنگا رات کی خاموشی میں بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ستارے ہیرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ شکنتلا میرے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھے بوڑھا پجاری بالکل اپنے پتا جی کی طرح لگا ہے۔ میں اس ناگ مندر کی دیوداسی بن جاؤں گی۔ ہم بنارس میں ہی رہیں گے۔ یہ ہمارے دیوی دیوتاؤں کا پوتر استھان ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی یہ شہر پسند آ گیا ہے۔ میں یہاں کوئی کام تلاش کر لوں گا۔"

شکنتلا بولی۔ "تمہیں کام تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے میں اپنے ساتھ مندر سے کچھ ہیرے جواہرات لے آئی ہوں۔ انہیں بیچ کر تم اپنا کوئی کاروبار شروع کر دینا۔"

پھر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"مجھے بچن دو کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہو گے مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ

گے۔"

میں نے شکنتلا کا ماتھا چوم کر کہا۔

"میں تمہیں کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہو جو پوری ہو گئی ہے ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔"

شکنتلا نے کہا۔

"مجھے پیاس لگی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں کٹیا میں سے شربت لاتا ہوں۔ پجاری جی شربت سے بھرا ہوا جگ اندر رکھ گئے ہیں۔"

شکنتلا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں گنگا ندی کا پانی پی لوں گی۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دریا کا ریتلا پانی پئے۔ میں نے کہا۔

"آج تمہیں شربت پینا چاہئے شکنتلا! دریا کا پانی پھر کبھی پی لینا۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

شکنتلا نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کو چھوڑ کر جاؤں۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ مگر اس نے اپنے اندیشے کا مجھ سے اظہار نہیں کیا تھا۔ میں اسے دریا کنارے چھوڑ کر کٹیا میں آ گیا۔ کٹیا میں پیتل کے جگ میں سے گلاس میں شربت انڈیلا اور باہر آ کر شکنتلا جہاں بیٹھی تھی اس طرف بڑھا۔ ستاروں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ شکنتلا بیٹھی ہوئی نہیں تھی۔ بلکہ لیٹ گئی تھی۔ لیٹی بھی ایسے تھی کہ غور سے دیکھنے پر ہی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے سوچا کہ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ دریا کنارے ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اسے نیند آ گئی ہو گی۔

میں شربت لے کر اس کے قریب گیا تو مجھے سانپ کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی پھنکار کی آواز سنائی دی سانپ کی پھنکار سن کر ایک بار تو میرے ہوش اڑ گئے۔ ایک دم سے مجھے اس کالے ناگ کا خیال آ گیا جسے جنوبی ہند کے مندر کے پجاری نے شکنتلا کے فرار ہونے کے بعد اس کو ہلاک کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہو گا۔ میں گلاس

ایک طرف پھینک کر شکنتلا کو اٹھانے کے لئے بڑھا تو مجھے ایک بار پھر سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ تب میں نے دیکھا کہ شکنتلا بے حس و حرکت پڑی ہے اور اس کے ماتھے پر ایک بالشت بھر کر کالا سانپ کنڈلی مارے پھن کھولے بیٹھا پھنکار رہا ہے۔ میں نے دیوانہ وار شکنتلا کو پکارا اور سانپ کو زور سے ہاتھ مارا۔ سانپ نے اچھل کر مجھے ڈس دیا۔ مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سانپ اپنا کام کر چکا ہے۔ میں نے سانپ کو پکڑ لیا۔ سانپ نے ایک بار پھر مجھے ڈس دیا۔ مگر مجھ پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ سانپ مجھے بار بار ڈس رہا تھا اور میں اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور چیخ مار کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

میں شکنتلا کو آوازیں دینے لگا۔ اس کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ مگر اس کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس کے منہ اور ناک سے سیاہ رنگ کا خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ دوڑتا ہوا اسے کٹیا میں لے آیا اور بستر پر لٹا دیا۔ میں پاگل سا ہو گیا تھا۔ کبھی شکنتلا کو آوازیں دیتا۔ کبھی اس کے بازو سہلاتا۔ کبھی اس کا سر اپنی آغوش میں لے کر رو رو کر اسے پکارتا۔

"شکنتلا! مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ تم نے ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ شکنتلا! مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔"

مگر شکنتلا مجھے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا میں جا چکی تھی جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ اس کا سانولا چہرہ میلا پڑ گیا تھا۔ اس کے نتھنوں اور منہ اور کان سے مسلسل سیاہ رنگ کا خون بہہ رہا تھا۔ میں دوڑتا ہوا مندر میں بوڑھا پجاری کے پاس گیا۔ دروازے پر زور زور سے ہاتھ مار کر اسے جگایا۔ وہ حیران پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ میری دیوانوں ایسی حالت دیکھ کر بولا۔

"کیا ہوا بیٹے؟"

میں نے روتے ہوئے کہا۔

"بابا! شکنتلا کو کچھ ہو گیا ہے۔ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

"ہے بھگوان!"

یہ کہہ کر پجاری نے جلدی سے کونے میں سے ایک تھیلا اٹھایا اور میرے

ساتھ باہر آ کر دوڑتا ہوا کٹیا میں آ گیا۔ کٹیا کی بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں بوڑھے پجاری نے شکنتلا کو دیکھا تو جلدی سے تھیلے میں سے ایک سفوف نکال کر شکنتلا کے منہ ناک اور کان پر چھڑک دیا۔ مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس وقت تک کالے ناگ کے زہر کے اثر سے شکنتلا کا جسم نیلا پڑ چکا تھا اور تڑخنے لگا تھا۔ بوڑھے پجاری اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

"بیٹا! بھگوان کی یہی مرضی ہے۔ اسے کسی ایسے سانپ نے ڈسا ہے جس کا علاج میرے پاس بھی نہیں ہے۔"

میں شکنتلا کی لاش سے لپٹنے لگا تو بوڑھے پجاری نے میری کمر میں دونوں بازو ڈال کر مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

"ایسا نہ کرنا بیٹا! جو ہونا تھا ہو چکا ہے ہونی اپنا کام کر چکی ہے۔"

میں روتے ہوئے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ بوڑھا پجاری بھی میرے پاس بیٹھ گیا اور میرے شانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے صبر کرنے کی تلقین کرنے لگا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہماری محبت کی سہاگ رات ہماری محبت کی موت بن جائے گی اور جس رات محبت کرنے والے ساری زندگی ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان کرتے ہیں ہم اسی رات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ میں رو بھی رہا تھا اور شکنتلا کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ پھر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ آواز تھک گئی۔ جانے والے چلے جاتے ہیں۔ پھر انہیں لاکھ آوازیں دو۔ وہ نہیں سنتے۔ پھر انہیں لاکھ بلاؤ کبھی واپس نہیں آتے۔ میرا سر جھک گیا تھا۔ شکنتلا کو پکارتے پکارتے گلا رندھ گیا تھا۔ نیک دل بوڑھے نے مجھے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ کھڑکی میں سے دن کا پھیکا پھیکا اجالا اندر آنے لگا۔ بوڑھے پجاری نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"بیٹا! صبر سے کام لو۔ اس کے سواہ کوئی چارہ نہیں ہے۔"

میں بوڑھے پجاری کے ساتھ لگ کر بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ میں دیر تک سسکیاں بھر کر روتا رہا۔ شکنتلا کی نیلی لاش سہاگ رات کے بستر پر پڑی تھی۔ اس نے گلے میں جو سرخ گلاب کا ہار پہن رکھا تھا اس کے پھول ابھی تک شگفتہ

تھے۔ بوڑھا پجاری مجھے کٹیا سے باہر لے گیا۔ کیونکہ لاش کی حالت خراب سے خراب ہو رہی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ مندر کے دوسرے پجاری بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے مندر کے پچھواڑے دریا کنارے لکڑیاں جوڑ کر چتا تیار کر دی اور شکنتلا کو چارپائی سمیت چتا پر رکھ دیا گیا۔ میں ایک طرف زمین پر بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شکنتلا کی لاش پر بھی لکڑیاں رکھ دی گئیں۔

پھر پجاری نے مشعل روشن کر کے میرے ہاتھ میں دی اور کہا۔

"پتنی کی چتا کو اس کا پتی ہی آگ دکھاتا ہے۔"

بوڑھا پجاری ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے پجاری ایک طرف قطار باندھے کھڑے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ میں جلتی ہوئی مشعل لے کر شکنتلا کی چتا کی طرف بڑھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی محبت کو آگ لگاؤں گا۔ مگر میں مجبور تھا۔ بے بس تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھالتا۔ آنکھوں میں آنسو لئے چتا کے چبوترے پر چڑھ گیا۔

شکنتلا کی لاش جس چارپائی پر رکھی ہوئی تھی وہ چتا کی لکڑیوں میں چھپ گئی تھی۔ جلتی ہوئی مشعل میرے ہاتھ میں تھی۔ میری آنسو بھری آنکھیں شکنتلا کی چارپائی کی جانب تھیں۔ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چتا کی چنی ہوئی لکڑیوں میں سے مجھے گلاب کا ایک سرخ پھول دکھائی دیا۔ یہ شکنتلا کے ہار کا پھول تھا۔ میری چیخ نکل گئی۔ پیچھے سے بوڑھے پجاری کی آواز آئی۔

"بیٹا! دیر نہ کرو۔ اَن تم سنسکار جلد ہو جانا چاہئے۔"

میں نے چتا کی لکڑیوں پر جلتی ہوئی مشعل پھینک دی۔ اور اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں نذر آتش کر دیا۔ میں واپس پلٹا تو میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ دو نوجوان پجاریوں نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا اور سہارا دے کر چتا کے چبوترے سے نیچے لے گئے چتا نے آگ پکڑ لی تھی۔ پجاری اونچی آواز میں اشلوک پڑھنے لگے تھے۔ میں اپنی محبت کو آگ کے شعلوں میں بدلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نوجوان پجاریوں نے مجھے سنبھال رکھا تھا۔ میں نے انہیں کہا۔

"مجھے مندر کی طرف لے چلو"

میں اس جگہ سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے سہارا دے کر چلاتے ہوئے مندر کے دروازے کے پاس لے آئے۔ میں نے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو"

نوجوان پجاری ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں آہستہ آہستہ چل پڑا۔ میرا رخ بنارس شہر کی طرف تھا۔ مجھے اپنے اوپر اس بدنصیب کا گمان ہو رہا تھا جس کی زندگی کی ساری پونجی لٹیروں نے لوٹ لی ہو اور اسے مرنے کے لئے زندہ چھوڑ دیا ہو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کس طرف جا رہا ہوں۔ میں ایک کچی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ میری ایک جانب دریا تھا۔ ایک جانب کھیت تھے۔ کھیتوں کے پار بنارس شہر کے مکان دھوپ میں چمک رہے تھے۔ چلتے چلتے میں نہ جانے کتنی دور نکل گیا تھا۔ شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ میں ایک ویران میدان میں سے گزر رہا تھا۔ شکنتلا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ جیسے وہ مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا اور میں اس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پھر یہ چہرہ ایک ویران کھنڈر کے پاس آکر غائب ہو گیا۔ میں کھنڈر کے پاس آ کر رک گیا۔ یہ ایک شکستہ بارہ دری تھی۔ بارہ دری کے اندر ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر کے کتبے پر کلمہ پاک لکھا ہوا تھا۔ میں نے بلند آواز میں کلمہ شریف پڑھا اور قبر کے پاس بارہ دری کے شکستہ ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میری زبان پر اپنے آپ کلمہ پاک کا ورد جاری ہو گیا۔ اور کلمہ پاک کا ورد کرتے کرتے مجھے نیند آ گئی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ پھر اچانک ایک شور سا پیدا ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ٹیوٹا کرولا کار بڑی تیزی سے میرے قریب سے گزر گئی تھی۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ میں ایک سڑک کے فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ سڑک پر موٹر کاریں، سکوٹر اور رکشا چل رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا خواب، اگر وہ واقعی خواب تھا، ٹوٹ چکا تھا۔ میں ماضی کے زمانے سے نکل کر ایک بار پھر کمپیوٹر اور ڈش انٹینا کے ماڈرن زمانے میں واپس آ چکا تھا۔ میں نے سڑک کو پہچان لیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں

اپنے شہر کی سڑک کو نہ پہچانتا۔ یہ لاہور کی سرکلر روڈ تھی اور میں ریلوے سٹیشن کے قریب دو موریہ پل والی مسجد کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے احساس ہوا کہ میں مرگیا تھا اور اب پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی کو دیکھا۔ میری انگلی میں سے وہ انگوٹھی غائب ہو چکی تھی جس کی مدد سے مجھے اپنے زمانے میں، اپنی دنیا میں واپس جانا تھا۔ میرا لباس بھی اپنے آپ بدل گیا تھا۔ میں نے وہی لباس پہن رکھا تھا جس کو پہن کر میں پہلے روز گھر سے افریقہ کے ایڈونچرس سفر پر نکلا تھا۔ میں نے اپنی پتلون کی جیبوں کو ٹٹولا۔ ایک جیب میں کراچی سے لاہور تک کا ریل گاڑی کا آدھا کٹا ہوا ٹکٹ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کراچی سے ریل میں سوار ہو کر لاہور پہنچا ہوں۔ میری دوسری جیب میں ایک چھوٹی سی گتھلی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے نکال کر تھوڑا سا کھول کر دیکھا۔ اس میں مجھے کچھ ہیرے موتی نظر آئے۔ میں نے جلدی سے گتھلی بند کر کے جیب میں رکھی اور اپنی بش شرٹ کی جیب دیکھی۔ اس میں دس دس روپے کے تین نوٹ اور دو نوٹ پانچ پانچ روپے کے تھے۔ سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

میں فٹ پاتھ پر تیز تیز چلتا ریلوے سٹیشن پر آیا۔ وہاں سے رکشہ لیا اور اسے اپنے محلے کی طرف چلنے کو کہا۔ اپنے محلے کا نام مجھے اس طرح یاد تھا جیسے میں ابھی کل ہی لاہور سے باہر گیا تھا۔ میں نے اپنی گلی کے باہر رکشہ چھوڑ دیا اور اپنے مکان پر آ گیا۔ میرے ماں باپ اور بڑی بہن اور بڑا بھائی مجھے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ ایک ایک نے مجھے گلے لگایا۔ والد صاحب نے کہا۔

"تم افریقہ سے کب واپس آئے۔ تم نے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دی۔"

والد صاحب کی ناراضگی مجھے دیکھ کر جاتی رہی تھی۔ والدہ صاحبہ بار بار میرا ماتھا چوم رہی تھیں۔ بڑی بہن نے کہا۔

"اب ہم تمہیں کبھی کہیں جانے نہیں دیں گے۔"

بڑے بھائی نے کہا۔

"تمہارا افریقہ سے ایک خط آیا تھا جس سے ہمیں پتہ چلا تھا کہ تم

افریقہ میں ہو۔"

رات کو میں نے والد صاحب کو گٹھلی کھول کر وہ ہیرے اور موتی دکھائے جو میرے ساتھ ہی آ گئے تھے۔ اور جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ یہ وہی ہیرے موتی تھے جو میری ناکام محبت شکنتلا جنوبی ہند کے مندر سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ والد صاحب کو ہیرے جواہرات کی پہچان تھی۔ ان کا بڑے چھوٹے پیمانے پر قیمتی پتھروں کا ہی کاروبار تھا۔ انہوں نے ہیرے موتی بڑے غور سے دیکھے اور پھر مجھ سے پوچھا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملے تھے؟"

میں نے کہا۔ "افریقہ کی ایک کان سے مل گئے تھے۔ میں نے انہیں سنبھال کر رکھ لیا تھا۔"

وہ کہنے لگے۔ "یہ بے حد قیمتی ہیرے موتی ہیں۔ مارکیٹ میں ان کی قیمت لاکھوں سے بھی آگے ہے۔"

شکنتلا کے دیئے ہوئے ان ہیرے موتیوں نے ہماری کایا پلٹ دی۔ والد صاحب نے انہیں بیچ کر اپنی ایک شاندار دکان بنا لی۔ اور ہمارا کاروبار دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ والد صاحب نے مجھے نوادرات کا ایک الگ شو روم بنوا دیا جہاں میں مینیجر بن کر کاروبار کرنے لگا۔ میرا شو روم لاہور شہر کے ایک جدید فیشن ایبل علاقے میں واقع تھا۔ ایک روز میں حسب معمول اپنے شو روم کے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا کہ شو روم میں ایک غیر ملکی مرد اور عورت داخل ہوئے۔ چونکہ میں انگریزی بول لیتا تھا اس لئے غیر ملکی سیاحوں سے میں خود ہی بات چیت کرتا تھا۔ میں کاؤنٹر سے اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا اور انہیں شوکیس میں سے نوادرات دکھانے لگا۔ وہ دونوں میاں بیوی کینیڈین تھے۔ میں ان سے کاروباری گفتگو میں مصروف تھا کہ میری نگاہ کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ کاؤنٹر پر دو عورتیں کھڑی ہیں۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔ ان میں سے ایک ذرا بھاری بدن کی عورت تھی اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ دوسری نوجوان تھی اور اس نے ہلکے نیلے رنگ کی پھولدار ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے بالوں کا پیچھے جوڑا بنا رکھا تھا اور جوڑے میں سرخ گلاب کا ہار لپیٹا ہوا

تھا۔ شلوار قمیض والی عورت کاؤنٹر پر جھک کر کچھ لکھ رہی تھی۔ یہ سوچ کر وہ میری گاہک خواتین ہیں میں نے کینیڈین مرد عورت کو اپنے ایک ملازم کے حوالے کیا اور خود کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کاؤنٹر پر کسی ہستی کا دیدار کرنے والا ہوں۔ میں معمول کے مطابق کاروباری انداز میں دوسری طرف سے داخل ہو کر کاؤنٹر پر آ گیا اور بڑی خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"فرمایئے! میں آپ کیا کیا خدمت----

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس کے آگے میں کچھ نہ بول سکا۔ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس شکنتلا کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ میں بھلا کیسے شکنتلا کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہی سانولا رنگ، وہی نقش و نگار، وہی سیاہ آنکھیں اور وہی جوڑے میں لگے ہوئے گلاب کے سرخ پھول میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"شکنتلا؟"

اس وقت شکنتلا کاغذ پر کسی کا ٹیلی فون نمبر لکھ رہی تھی اور اس کے ساتھ جو شلوار قمیض والی خاتون تھی وہ اسے کہہ رہی تھی۔

ڈبل تھری نہیں ڈبل فائیو ہے۔"

مگر میری زبان سے نکلا ہوا نام شکنتلا ان دونوں نے سن لیا تھا۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہوں کہ آپ نے کس کا نام لیا ہے۔ شکنتلا نے یا وہ جو بھی لڑکی تھی۔ مجھے دیکھنے پر کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں اسے مسلسل تک رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"شکنتلا! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

اس پر دونوں عورتوں نے تعجب سے ایک دوسری کو دیکھا۔ پھر شلوار قمیض والی خاتون مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ میری ایک سہیلی کی بیٹی ہے۔ دلی سے اپنی ماتا جی کے ساتھ آئی ہے۔ اس کا نام سادھنا ہے۔"

اس لڑکی نے بھی جو ہو بہو شکنتلا تھی میری طرف دیکھ کر تبسم کے ساتھ کہا۔

"آپ نے شاید کوئی میری ہم شکل لڑکی دیکھی ہو گی۔"

اس کے بعد شلوار قمیض والی خاتون نے مجھے ایک کاغذ کا ٹکڑا دے کر کہا۔

"ہمیں ان نوادرات کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کے پاس یہ آئیٹمیں مل جائیں گی؟"

مجھ پر ابھی تک حیرت کا عالم طاری تھا۔ شکنتلا میرے سامنے کھڑی تھی۔ ہم شکلوں میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہوتا ہے۔ مگر وہ شکنتلا ہی تھی۔ اس کی ہم شکل نہیں تھی۔ اس کی آواز بھی شکنتلا ہی کی آواز تھی۔ نوادرات کی لسٹ والا کاغذ میرے سامنے کاؤنٹر پر پڑا تھا اور میں شکنتلا کو تکتا جا رہا تھا۔ شلوار قمیض والی خاتون نے ذرا سخت لہجے میں مجھ سے کہا۔

"مسٹر! کیا آپ اپنی گاہک عورتوں کو اسی طرح گھور گھور کر دیکھتے ہیں؟"

میں ایک دم اپنے آپ میں آگیا۔ میں نے انتہائی معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"محترمہ! میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھ سے واقعی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ آئی ایم سوری! ویری سوری!"

پھر میں نے نوادرات کی فہرست پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"ان میں سے دو ایک چیزیں ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن ہم منگوا دیں گے۔"

شلوار قمیض والی خاتون نے ایک چٹ پر اپنا ٹیلی فون نمبر لکھا اور کہا۔

"جب آپ یہ چیزیں منگوا لیں تو مجھے فون کر دیجئے گا۔ چلو سادھنا بیٹی"

اور وہ دونوں شو روم میں سے نکل گئیں۔ میرے خیالات ایک دائرے کی شکل میں گھومنے لگے تھے۔ کبھی خیال آتا کہ ہو سکتا ہے یہ شکنتلا کی کوئی ایسی ہم شکل ہو جس کی شکل اس سے ہو بہو ملتی ہو۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں یہ شکنتلا ہی ہے۔ جب تک وہ عورتیں شو روم سے نکل کر باہر فٹ پاتھ پر میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئیں۔ میں انہیں دیکھتا چلا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ سارا دن

انہی منتشر خیالات میں الجھا شو روم میں بیٹھا رہا۔ تیسرے پہر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر بے دلی سے کہا۔

"ہیلو"

دوسری طرف سے شکنتلا کی آواز آئی۔

"میں سادھنا بول رہی ہوں۔ کیا آپ انٹر نیشنل ہوٹل میں تھوڑی دیر کے لئے آسکیں گے؟ میں ہوٹل کے ٹی روم میں آپ کو ملوں گی۔"

اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون بند ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے اسی وقت کاؤنٹر پر ایک ملازم کو بٹھایا اور اس خیال سے کہ مجھے کچھ رقم اپنے پاس رکھنی چاہئے۔ میں نے کیش والا دراز کھولا۔ اس میں سے سو سو کے دس نوٹ نکالے تو مجھے پیچھے سرخ گلاب کا ایک پھول پڑا ہوا دکھائی دیا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جلدی سے اسے اٹھایا۔ وہ بالکل تر و تازہ پھول تھا اور اس کی پنکھڑیوں پر ابھی تک شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں اسے ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ اس میں سے وہی گہری خواب ایسی خوشبو آ رہی تھی جسے اپنے لباس پر لگا کر شکنتلا ناگ مندر میں رقص کیا کرتی تھی۔ میں نے پھول کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ روپے بٹوے میں رکھے۔ جلدی سے شو روم سے نکل کر پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آکر اس میں سوار ہو کر انٹر نیشنل ہوٹل کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد جو مجھ پر بیتی اور جو حیرت انگیز پر اسرار حالات مجھے پیش آئے وہ ایک الگ داستان ہے اور اس کتاب کے صفحات اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ داستان انشاء اللہ میں پھر کبھی آپ کو سناؤں گا۔ خدا حافظ!

اے حمید

29 اکتوبر 99

لاہور